ابن بطوطہ
کے
تعاقب
میں
ابن انشا
سفر نامہ

ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں

سفر نامہ

نجمی اور جمشید کے کارٹونوں کے ساتھ

ابنِ انشا

۱۹۷۴

طبع اوّل اپریل ۱۹۷۴

طبع دوم اگست ۱۹۷۴

طبع سوم جولائی ۱۹۷٦

مکتبہ دانیال

وکٹوریہ چیمبرز ۲

کراچی ۲

اکتا گیا دِل یہاں سے بھائی — پھر چلنے کی دِل میں جھک سمائی

ایسی صدہا پڑی اُفتاد — روکے سے کہیں رُکے ہیں آزادؔ

گردش میں ہے عیش و آرام — سیّاحوں کو ایک جا پہ کیا کام

بس یہی لطفِ زندگانی — دانہ ہو نیا، نیا ہو پانی

چشمہ نہ بہے تو اس میں بُو آئے — خنجر نہ چلے تو مورچہ کھائے

لیتے ہیں خبر اِدھر اُدھر کی — اب بھرتے ہیں سِدّھیاں سفر کی

سیٹی بجی ریل کی مری جاں — لو جاتے ہیں اب خدا نگہبان

درویش رواں رہے تو بہتر

آب دریا میں بہے تو بہتر

رتن ناتھ سرشار—فسانۂ آزاد

فہرست

سیّاح کی مناجات

چلتے ہو تو چین کو چلئے۔۔۔ آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے اور اب۔۔۔ ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں، آخر اتنی کتابیں کون پڑھے گا؟ اتنے قصّے کون سُنے گا؟ اس پر ہمیں سیاح کی مناجات یاد آتی ہے، جو پچھلے دِنوں آرٹ بکوالڈ نے اپنے کالم میں لکھی تھی، نمونہ کلام:

”اے آسمانی باپ، اب بندۂ عاجز یعنی سیاحِ غریب کو اپنی نظرِ کرم کی بھیک دے، جس کے مقدّر میں دیس بدیس پھرنا، خوار ہونا، فوٹو لینا، تصویری پوسٹ کارڈ پوسٹ

کرنا، تحفے خریدنا اور واش اینڈ ویئر نائیلون کے کپڑوں میں زندگی بسر کرنا لکھا ہے۔"

"خداوندا، ہم پر مہربان رہ، ہمارا ہوائی جہاز اغوا نہ ہو، ہمارا سامان گُم نہ ہو اور ہمارے پاس اجازت سے زیادہ بوجھ ہو تو کوئی گرفت نہ کرے، کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔"

"ہمیں محفوظ رکھ بارِ الٰہی، تُند خُو اور درشت مزاج ٹیکسی ڈرائیوروں سے، حریص سے غَلَط بِل بنانے والے بیروں سے، تنگ دِل ہوٹل والوں سے۔"

"ہمیں ایسے ہوٹل عطا کر جن کے کرائے کم ہوں اور ناشتہ بھر پیٹ ملتا ہو۔"

"یا مالک! ہمیں سمجھ عطا کر ان سِکّوں میں صحیح مقدار میں بخششیں دینے کی جن کو ہم نہیں سمجھتے، اگر ہم کسی قُلی یا بیرے کو غَلَطی سے تھوڑی بخشش دیں تو اس کے دِل میں رحم اور عفو کا مادہ پیدا کر، جس دیار میں ہم ہوں، وہاں کے لوگوں میں ہمارے لئے سچّی اور بے لوث محبّت کی جوت جگا اور وہاں کے دُکانداروں کے دِل لالچ اور نفع اندوزی کی لعنتوں سے پاک رکھ۔"

"ہمیں توفیق عطا کر، وہ سارے میوزیم، گرجا، محل اور قلعے دیکھنے کی، جن کا دیکھنا ہماری گائیڈ بُک میں لازمی لکھا ہے۔ ہم دوپہر کو قیلولہ کرنے کی وجہ سے کوئی تاریخی

مقام دیکھنا بھول جائیں تو ہمیں معاف فرما۔ ہم آخر انسان ہیں۔۔۔ ضعیف البنیان ہیں۔"

یہ تو خیر ہر سیاح کی واردات ہے۔ ہماری آمین کے لائق اس دعا کا آخری حصّہ ہے۔

"خداوندا۔۔۔ جب ہمارا سفر ختم ہو اور ہم اپنے عزیزوں (یا قارئین) میں واپس جائیں تو پیدا کر اپنی قدرتِ کاملہ سے ایسے لوگ جو ہماری کھینچی ہوئی تصویریں اور فلمیں تمام و کمال دیکھنے کی تاب لا سکیں۔ اور ہمارے سفر کی داستانیں سُن سکیں (اور پڑھ سکیں) تاکہ ہماری زندگیاں بطور سیاح کے اکارت نہ جائیں۔ آمین ثم آمین۔"

اس مجموعے میں ہمارے سب سے پہلے دو سفر نامے بھی شامل ہیں، ایران (۱۹۶۳ء) کا سفر نامہ اور لنکا (۱۹۶۴ء) کا سفر نامہ۔ ایران کا سفر نامہ روزنامہ حُریّت میں چھپا تھا، اور لنکا کا روزنامہ انجام میں۔ یہ دونوں ملک وہ ہیں جہاں ابنِ بطوطہ گئے تھے۔ یہ ہمارے تازہ ترین سفروں کو بھی محیط ہے، یعنی جنوری ۱۹۷۴ء کا ٹوکیو اور ہانگ کانگ کا سفر بھی اس میں شامل ہے۔ اب ہمارے قارئینِ کرام کچھ دِن چین کی سانس لے سکتے ہیں، کیونکہ کتاب بھر کا مسالہ جمع کرنے کے لئے نئی سیاحتیں چاہئیں اور ان کا سامان چاہیے۔ ویسے ہو سکتا ہے، یہ مدّت بہت مدید بھی نہ ہو، سرشار کے سیلانی کو اور میر امّن کے اس درویش کو فقط سبب کی حاجت ہے اور اشارے کی ضرورت

ہے، شوق کی کمی نہیں اور وحشت کا توڑ نہیں۔

ابنِ انشا

۴ اپریل ۱۹۷۴ء

جرمنی و لندن

نومبر ۱۹۷۱
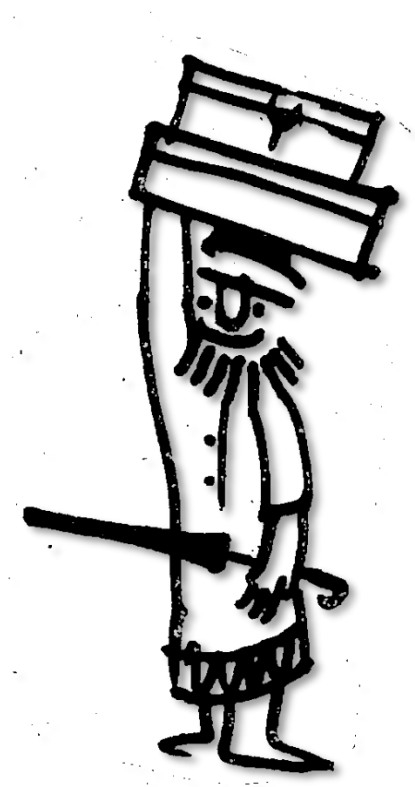
ایک ہدایت نامہ پیارے ہم وطنوں کے لئے

ہم جب کبھی مُلک سے باہر قدم نکالتے ہیں، پیچھے کوئی نہ کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ لوگ ہماری غیر حاضری کا فائدہ اُٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے اواخر میں یہ سوچ کر کہ اب یہ ملک نوزائیدہ نہیں رہا، ماشا اللہ بالغ اور ہوش مند ہو گیا ہے، ہم ایک دورے پر نکل گئے۔ سنگاپور بھی نہ پہنچے تھے کہ لڑکوں کے ہڑتالیں کرنے کی اطلاعیں آنے لگیں۔ ہم نے سوچا کوئی بات نہیں، ناسمجھ ہیں، ہم واپس جا کر سمجھا دیں گے۔ لیکن ہانگ کانگ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بڑی عمر کے لوگ بھی بیانات دینے

لگے ہیں۔ جلوس نکل رہے ہیں۔ لاٹھی چارج ہو رہا ہے وغیرہ۔ یہ سچ ہے کہ ہم وہاں سے لوٹ آتے تو صورت حال کی اصلاح کر سکتے تھے۔ اس ملک میں کوئی ہمارے کہنے سے باہر تھوڑا ہی ہے لیکن یہ ہمارے اصول کے خلاف ہوتا۔ ہم قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹانے کے قائل نہیں، لہٰذا ہانگ کانگ سے ٹوکیو پہنچے، ٹوکیو سے سیول اور ہونولولو سے ہوتے ہوئے سان فرانسسکو جا وارد ہوئے۔ امریکہ سے سویڈن اور ترکی کے راستے واپسی تک حالات ہمارے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ گول میز کانفرنس کی بات ہونے لگی تھی۔ گول میز کانفرنس میں شریک ہونا بھی ہم نے پسند نہ کیا۔ یہ بھی ہمیں اپنے اصول کے خلاف نظر آیا۔ ہمارا اصول ہے کہ جہاں ہمیں کوئی بُلائے نہیں، وہاں نہیں جاتے۔۔۔

خیر ہماری بات تو چھوڑیئے، تشویش ناک خبریں سُنتے تھے تو ہر بے عمل محبِّ وطن کی طرح ملک کے حق میں دُعا کر کے اپنے فرض سے سرخرو ہو جاتے تھے۔ لیکن ہمارے ہم سفر فضل الباری صاحب کا معاملہ دیگر تھا۔ آپ مشرقی پاکستان کے وزیرِ صحت تھے اور ہمارے تین نفری وفد کے لیڈر، صحت ان کی خاصی خراب، ہمارے ہم رکاب جو تین ایرانی اور تین تُرک تھے، وہ فقرہ بھی کَس دیتے تھے کہ وزیرِ صحت کسی اچھی صحت والے کو بنایا ہوتا۔ بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا۔ خبریں سُن

سُن کر ان کا ہاضمہ خراب ہو گیا اور منہ ذرا سا نکل آیا۔ شکاگو میں انہوں نے ہم سے کہا کہ "ملک کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ میری وزارت خطرے میں ہے۔ جب اوپر والا ہی نہ رہے گا تو ہم نیچے والے کیسے رہیں گے؟ مُجھے تو بار بار غسل خانے جانا پڑتا ہے۔ اب تم میری جگہ کام کرو۔" ہم نے مؤدبانہ کہا کہ "ہم مشرقی پاکستان کے وزیرِ صحت نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اس قسم کے کام کا تجربہ نہیں۔ آپ حوصلہ نہ چھوڑیں۔" بولے "میں تم سے مشرقی پاکستان کا وزیرِ صحت ہونے کی فرمائش نہیں کر رہا۔ اس وفد کی بات کر رہا ہوں جو کچھ کرنا ہے تمہی کیا کرو۔ میں اب سویڈن اور ترکی وغیرہ بھی نہیں جاتا۔ واشنگٹن ہی سے رختِ سفر باندھتا ہوں۔" نیویارک ہم ان کو زبردستی لے تو گئے لیکن وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے اور وہاں سے لندن کے ائیرپورٹ پر پہنچتے ہی وہ ہم سے یوں جدا ہوئے کہ دُعا سلام بھی نہ کی۔ اُن کی وزارت کے ساتھ شبے ماند، شبے دیگر نمی ماند، کی واردات ہوئی۔ گویا وہ سیاسی بصیرت سے ایسے محروم نہ تھے، جیسے صحت سے تھے۔

چونکہ آج ہمیں سفر تازہ درپیش ہے لہٰذا ہم اپنے پیارے ہم وطنوں کی رہنمائی کے لئے ایک ہدایت نامہ چھوڑے جا رہے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ سچّے مسلمان بنیں۔ اگر ہماری موجودگی میں کسی وجہ سے نہیں بن سکتے تھے تو ہمارے بعد بنیں۔ سچ

بولیں۔۔۔ پورا تولیں۔ قوم اور ملک کے لیے ایثار کریں۔ اس کے لئے وہ چاہیں تو ہماری مثال اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں۔ اسلام کو اپنی زندگی کے سانچے میں نہ ڈھالیں۔ رمضان شریف کی آمد آمد ہے۔ ہم تو خیر سفر میں ہیں اور ہم پر مسافرت کے احکام کا اطلاق ہو گا۔ لیکن اہلِ وطن کو ہماری تاکید ہے کہ ایک تو رمضان شریف کے دوران شراب خانے بند رہنے چاہئیں۔ جس کسی کے پاس ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ ہے کہ یہ شخص اگر نہیں پیئے گا تو اس کی صحت تباہ ہو جائے گی وہ چند بوتلیں ابھی سے خرید کر رکھ لے۔ جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ یہ احتیاط کریں کہ دِن میں ایسے ہوٹلوں میں نہ جائیں جو پردے نہیں گراتے۔ صرف ایسے ہوٹلوں میں جائیں جو رمضان شریف کے احترام کے آداب جانتے ہیں۔ اور باہر نکلیں تو اچھی طرح منہ پونچھ کر نکلا کریں۔ ان اونچی باتوں اور مواعظہ حسنہ کے ساتھ بعض مقامی ہدایتیں بھی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارا علاقہ جیسا ہم چھوڑ کر جا رہے ہیں ویسا ہی ہمیں ملنا چاہیے۔ ناظم آباد کی بڑی سڑک کو توڑ کر چند ہفتے پہلے جو پتھّروں کی ڈھیریاں لگا دی گئی تھیں وہ ہمارے آنے تک لگی رہنی چاہئیں۔ وہ بہت اچھی بلکہ رومانٹک معلوم ہوتی ہیں۔

ہم نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو یہ شعر لکھ بھیجا ہے کہ

انہی پتھّروں پر چل کے اگر آسکو تو آؤ
مِرے گھر کے راستے میں کوئی راستہ نہیں ہے

پاپوش نگر کے قبرستان کے سامنے جو مین ہول کئی ماہ سے کھلے پڑے ہیں ان کو بھی بند کرنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ کسی شخص کا مُردہ ان میں سے نکال کر وہیں سامنے دفن کر دینا کہیں زیادہ کم خرچ ہے، بہ نسبت اس کے کہ اس کا جنازہ اس کے گھر سے لایا جائے۔

کارپوریشن کے ہیلتھ افسر صاحب بھی نوٹ فرمائی کہ علامہ اقبال ٹاؤن میں ہمارے گھر کے ساتھ جو کوڑے کا فلک بوس ڈھیر ہے وہ وہاں سے نہ ہٹے ورنہ ہم احباب کو اپنے گھر کی اور کیا نشانی بتایا کریں گے۔ اب تو لوگ دور دور سے بِلا کسی سے دریافت کئے محض بُو سونگھتے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

ادب اور آرٹ کے بارے میں بھی لوگ ہماری ہدایات کے منتظر ہوں گے، ہمیں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ مشاعرے جاری رہنے چاہئیں تا کہ زبان کی صفائی ہوتی رہے۔ صفائی کا مطلب یہ نہیں کہ ادب کے میدان میں بالکل ہی جھاڑو

دے دی جائے۔ بلکہ صیقل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ آرٹ کونسل کو ہماری ہدایت ہے کہ تجریدی مصوّری کی نمائش جاری رکھے تاکہ لوگوں کا دِل مُلکی مسائل سے ہٹا رہے جن پر غور کرنے کا ہمارے نزدیک کُچھ فائدہ نہیں۔ ہم تجرید کے قائل آرٹسٹوں سے بھی زیادہ ہیں۔ ہماری رائے میں ہمارے آرٹ کو مجرّد ہونا چاہیے۔ اگر باقی لوگ بھی مجرّد ہوں تو ہمارے نزدیک اور اچھا ہے۔ ہماری سوچی سمجھی رائے میں آنے والی نسلوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ پیدا نہ ہوں۔

مسائل تو اور بھی رہے جا رہے ہیں مثلاً انتقالِ اقتدار کے مسئلے پر ہماری رائے، لیگوں کے ادغام کے بارے میں ہمارے خیالات وغیرہ، لیکن اخبار میں ان پر لکھنا ٹھیک نہیں۔ ہمارے پیش رَو کوی راج حکیم ہر نام داس بی اے مصنّف ہدایت نامہ خاوند، ہدایت نامہ بیوی، ہدایت نامہ والدین وغیرہ سب کچھ متن میں نہیں لکھ دیتے تھے بلکہ کتاب کے اندر ایک لفافہ رکھ دیتے تھے اور وہی پوری کتاب کی جان ہوتا تھا ہم نے بھی مذکورہ بالا موضوعات پر لفافے تیّار کر رکھے ہیں جو دس روپے کا منی آرڈر بھیج کر ہم سے مُفت طلب کئے جا سکتے ہیں۔ دس روپے کی شرط اس لئے ہے کہ صرف ضرورت مند حضرات طلب کریں۔ ورنہ لوگ بے ضرورت بھی لے لیتے ہیں کہ مُفت کا ہے اور پھر پھینک دیتے ہیں۔

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصّہ

ہمارا سفر نامہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' پچھلے دِنوں چھپا تو اس کی رونمائی تقریب میں ہمارے ایک عزیز دوست نے ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس کر پکار کے یہ فقرہ کہا کہ انشا صاحب سفر تو دور دور کا کرتے ہیں لیکن چھ ہزار میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنے ہوٹل کے کمرے میں گھُس کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے غسل خانے کا طول عرض ناپنے لگتے ہیں یا اپنی بے زری کا گلِہ کرنے لگتے ہیں۔ اس ملک کی عمرانیات، لسانیات، نسلیات، نباتات، جمادات، حیوانات، سیاسیات، ادب، آرٹ،

اوپرا، بیلے وغیرہ کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات بہم نہیں پہنچاتے۔۔۔ یہ بات ہمیں بُری لگی جو مشتاق احمد یوسفی کی منطق کے بموجب اس بات کا ثبوت تھی کہ سچّی تھی۔ لہٰذا اب کے ہم نے ولایت کے لیے رختِ سفر باندھا تو طے کر لیا کہ فقط فنونِ لطیفہ، ادب، آرٹ تھیٹر وغیرہ اور اُونچے مسائل اور ارفع مباحث سے سروکار رکھیں گے جیسا کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ آدمی کے شایانِ شان ہے۔ دانشور کی سطح سے ہرگز نیچے نہیں اُتریں گے۔ ایک سیڑھی بھی نہیں۔ اور جہاں تک ہوٹل یا اس کے کمرے یا غسل خانے کا سوال ہے اس کی طرف تو مطلق اعتنا نہ کریں گے۔ کیونکہ یہ ایک عامیانہ سی بات ہے۔ اس کا فائدہ یہاں کے لوگوں نے یہ اٹھایا کہ فرینکفرٹ میں پہلے روز ہم نے غسل خانے جانا چاہا تو اس کا دروازہ ہی نہ ملا ہم نے مینجر کو بلا کر کہا، بھلے مانس کہاں ہے دروازہ۔۔۔؟ اس نے کہا کہیں بھی نہیں ہے کیونکہ آپ کے کمرے کے ساتھ غسل خانہ نہیں ہے۔ آپ کو اپنی غیر ضروری حاجات کے لئے اپنی خلعتِ فاخرہ یا کم از کم چغہ یا جھبر جھالا پہن کر وہاں جانا ہو گا۔ اس پر ہم نے ہوٹل والوں سے کہا کہ اس کی سہی نہیں جناب ہمیں غسل خانہ چاہیے۔ اس کے ساتھ کمرہ ہو نہ ہو، کچھ پروا نہیں۔ کیونکہ ہم غسل خانے کے تختِ طاؤس پر بیٹھے بیٹھے غور و فکر کرتے ہوئے وقت گزار لیں گے۔ مینجر کے جی میں نیکی آئی تو اس نے

اگلے روز ہمیں ایک غسل خانہ دے دیا اور اس کے ساتھ ملحقہ ایک کمرہ یعنی بیڈ روم بھی۔ میونخ میں ہماری بے نیازی کا فائدہ اٹھا کر ہمارا ایمان خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ یعنی ہوٹل کے کمرے کے کونے میں شرابوں کی الماری رکھ دی گئی جس میں ہر طرح کی شراب کے شیشے تھے اور ہمارے لئے بالکل مُفت تھے کیونکہ بِل ہمارے میز بانوں کو دینا تھا کئی بار جی میں آئی کہ یہاں کون دیکھتا ہے۔ غٹ غٹ پی جائیں بعد میں کُلّی کر لیں گے، اس پر لوگ اعتبار تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ لوگ اتنے بیوقوف تھوڑا ہی ہیں۔ لیکن افسوس ہمارے پورے شجرۂ نسب میں کہیں کوئی قاضی نہیں ہے کہ ہم اس کی آڑ میں اسے حلال کر سکتے۔ ہاتھ بوتل کی طرف جُونہی بڑھاتے ایک کڑ کا سُنائی دیتا تھا۔ ظالِم شراب ہے، ارے ظالِم شراب ہے۔ ناچار کوکا کولا یا کھاری سوڈا نکالتے تھے اور اسے پی کر خود کو مبارک باد دیتے تھے کہ غالبؔ کے حساب سے ہم پورے مسلمان ہیں۔ آٹھوں گانٹھ مسلمان ہیں۔ غالبؔ نے اپنے کو آدھا مسلمان لکھا تھا کہ سؤر نہیں کھاتا، شراب پیتا ہوں۔ ہم نے یہ پیتے ہیں نہ وہ کھاتے ہیں۔ گویا ایک بات تو مرزا غالبؔ سے برتری کی ہم میں بھی ہے۔ اب اس کی قدر کرنا نہ کرنا اَبنائے زمانہ کا کام ہے ہم کو نہ ستائش کی تمنّا ہے نہ صلے کی پروا۔

اس کمرے میں ٹیلی وژن بھی تھا جس کی وجہ سے ہم جتنے دِن میونخ میں رہے سنجیدہ

موضوعات پر غور و فکر نہ کر سکے۔ اور بجلی کا مالشیا بھی جس سے ہم پار سال پیرس میں استفادہ کر چکے ہیں۔ یہ ایک ڈبّہ سا ہوتا ہے جس میں ایک مارک یا ایک فرانک ڈالتے ہیں اور پندرہ منٹ تک بستر پر تھر تھراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ ہماری رائے میں یہ مالش بڑی حد تک نفسیاتی ہے۔ مالش تو وہ ہے جو ہمارے ہاں ہوتی ہے کہ مالش کرنے والا بدِن کو (مالش کرانے والے کے بدن کو) چپڑ کر پٹّے کے ہاتھ چلاتا ہے۔ بند بند کو جھنجھوڑتا ہے، بھنبھوڑتا ہے، توڑتا ہے، نچوڑتا ہے تھکن تو بے شک دور ہو جاتی ہے لیکن پہنچا اُتر جاتا ہے، بانہہ ہتھّے سے اکھڑ جاتی ہے۔ ناف ٹل جاتی ہے یا آدمی بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ ٹوکیو اور بینکاک کے حماموں میں تو جہاں سب ننگے ہوتے ہیں، مالش کا کام طرح دار اور باعفّت بیبیوں کے سپرد ہوتا ہے۔ اور وہ اس وقت تک اپنی عفّت کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں جب تک آپ ان کو دس بیس ڈالر مالش کی اجرت کے علاوہ نہ دیں لیکن یہ مہینہ رمضان شریف کا ہے ہمیں اس قسم کے ذکر اذکار سے اور گندی گندی باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یوں بھی حمام کو غُسل خانوں کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے جس کے دروازے، یعنی جس کے ذکر کے دروازے ہم نے خود پر بند کر رکھے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ میں اس قدر اصلاح کر لی ہے کہ خود ہم کو حیرت ہوتی ہے۔ اگر ہمارے میزبان ہمیں بازار کی طرف لے

جاتے ہیں تو ہم آرٹ گیلری کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہمارے سامنے نائٹ کلب یا لہو و لعب کے کسی اور کارخانے کا مذکور لائے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ پہلے تنقیدِ عقل محض اور نطشے کے فوق البشریت پر بحث ہونی چاہیے۔ ہمیں مناظرِ قدرت دِکھنا چاہتے ہیں تو ہم اقبال کے مصرع کا ترجمہ سُنا دیتے ہیں کہ اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی۔ جرمنی کی عورتیں کیسی ہوتی ہیں اور کپڑے کیسے پہنتی ہیں اور پہنتی بھی ہیں یا نہیں؟ یہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کیونکہ عورتوں کی طرف ہم دیکھتے ہی نہیں۔ ایک تو اپنی طبعی شرماہٹ اور شرافت کی وجہ سے اور دوسری وجہ ہم اس وقت بھول گئے ہیں۔

جہاں جہاں ہم گئے ہم نے اوپرا ضرور دیکھا۔ یہ فنون لطیفہ کی انتہائی لطیف صورتوں میں سے ہے۔ اس میں تماشا شروع ہونے سے پہلے ہی داد کے لئے تالیاں بجانی پڑتی ہیں۔ لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر۔ اسٹیج کے نیچے نشیب میں پچیس تیس آدمی طرح طرح کے ساز لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور ایک آدمی برابر ہاتھ اور چھڑی ہلاتا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح کسی سازندے کو اپنا سبق یاکر دار زبانی یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی روں روں کے بعد پھر حاضرین کو تالیاں بجانی پڑتی ہیں اور سازندوں کے سرغنہ کو جھک کر آداب بجالانے ہوتے ہیں۔ کھیل تو

جلدی ختم ہو جاتا ہے زیادہ وقت آخر میں کرداروں کے تعارف میں لگتا ہے۔ پہلے سب اہل کردار وصول کرتے ہیں اور حاضرین سے تالیاں بجواتے ہیں۔ پھر ہر شخص فرداً فرداً آتا ہے، پھر دو دو کر کے آتے ہیں۔ پھر تین تین کر کے آتے ہیں۔ پھر سب ہاتھ پکڑ کر دوڑے آتے ہیں، پردہ کھلتا ہے، بند ہوتا ہے، آخر میں جب وہ تھک جاتے ہیں تو داد وصول کرنی بند کرتے ہیں۔ اور ناظرین کی گلو خلاصی ہوتی ہے۔ یورپ کے ہر بڑے شہر بلکہ قصبے میں اوپرا ہاؤس ہیں۔ پچیس تیس آدمی مل کر اتنا شور مچاتے ہیں یعنی موسیقی بہم پہنچاتے ہیں جتنی ہم لوگ ایک معمولی ٹرانسسٹر ریڈیو سے پیدا کر سکتے ہیں۔۔۔ ٹکٹ خاصا مہنگا ہوتا ہے۔۔۔ اور گیلری بھری رہتی ہے اور عورتیں لمبے لمبے جامے پہن کر اور سولہ سترہ سنگار کر کے آتی ہیں اور بہت خرچ ہوتا ہے۔ ہمبرگ کے اوپرا ہاؤس کو ہر سال حکومت کی طرف سے ۲۰ ملین یعنی دو کروڑ مارک کی امداد ملتی ہے۔

القصّہ جرمنی کے جس شہر میں جاتے ہیں اوپرا ہمارے پروگرام میں ضرور شامل ہوتا ہے۔ اوپرا میں جو کوئی بھی آتا ہے ٹھوکر ہی لگاتا ہے۔ یہ تو خیر فلمی مصرع ہے جو فلموں سے رغبت کی وجہ سے زبان قلم پر آگیا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جو کوئی بھی آتا ہے گاتا ہوا آتا ہے۔ ایک طرح کی اِندر سبھا سمجھیے۔ یہ سچ ہے کہ اوپرا میں بیٹھتے ہی

ہمیں نیند آنی شروع ہو جاتی ہے اور موسیقی تو ہمیں اپنے ملک کی بھی سمجھ میں نہ آئی یہ تو پھر باہر کی ہے۔ اس کے باوجود ہم پوری طرح محظوظ ہوتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ تاکہ ہمارے اعلیٰ تہذیبی ذوق کے بارے میں کسی کے دِل میں بے جا وسوسہ پیدا نہ ہو۔ تاہم ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ فرینکفرٹ اور میونخ اور برلن میں اپنے تہذیبی ذوق کی آبیاری کے بعد ہم ہمبرگ پہنچے تو وہاں بھی اوپرا ہمارا منتظر تھاIADA دِکھایا جارہا تھا جو مصرِ قدیم کی داستان ہے۔ کوچی جیسی داڑھی والے فرعون صاحب اور ان کی باندی اور ان کے لشکری اور درباری آدھ آدھ گھنٹے تک جرمن زبان میں گا گا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ دو سین تو ہم نے اپنی جماہیوں اور غنودگی کے باوجود دیکھے، اس کے بعد باہر نکل آئے اور سڑک کی سیر سے کماحقہ لطف اندوز ہونے کے بعد ایک سینما میں گھُس گئے جس میں بکاشیو کی ڈی کامران دکھائی جارہی تھی۔ یہ اہلِ مغرب کی الف لیلہ ہے اس میں ہر پانچ منٹ کے بعد نامحرموں میں اس قسم کا اختلاط دِکھاتے ہیں کہ ہماری مشرقی اخلاقی قدروں کو بہت بُری طرح ٹھیس پہنچتی تھی لیکن اتنا ہے کہ ہمیں جمائیاں نہیں آئیں، اور نیند نہ صرف اس وقت بلکہ اس کے بعد رات کو بھی نہیں آئی۔ زیادہ تفصیل اس مبارک مہینے میں بیان کرنا مناسب

نہ ہو گا۔ بعض باتیں تو کسی نامبارک مہینے میں بھی بیان کرنے کی نہیں ہیں۔
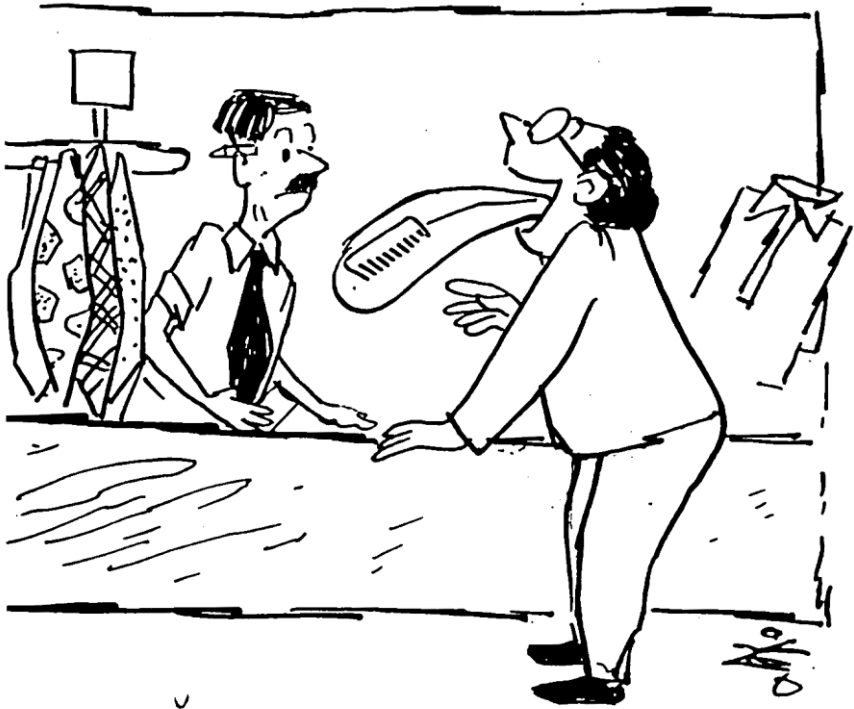
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

انگلستان کو چھوڑ کر یورپ کے جس ملک میں بھی ہم جائیں زبان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، ہمارے لئے اس ملک کے لوگوں کے لئے کیونکہ ہم تو اپنا منشا انگریزی میں بخوبی ادا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی انگلستان والے بھی ہماری انگریزی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن ایسا فقط کبھی کبھی ہوتا ہے۔ لندن میں ہم نے جب کبھی کنگھا خریدنا چاہا خرید لیا۔ ہمبرگ میں نہیں خرید سکے۔

ہمبرگ میں اس روز بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور ہمیں ایک پبلشر سے ملنے شہر سے دور ایک قصبے میں ریل سے جانا تھا۔ ہمبرگ میں عام بڑی ریلوے کے علاوہ دو طرح کی شہری ریلیں چلتی ہیں۔ ایک یو(U) بان یعنی انڈر گراؤنڈ اور دوسری ایس (S) بان یعنی زمین کی سطح سے ایک منزل اوپر چلنے والی۔ ہم نے اپنے سفر نامے، آوارہ گردی کی ڈائری، میں برلن کی S بان کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے ہم اور مولوی محبوب عالم پیسہ اخبار والے سفر کرتے ہیں۔ وہ ۱۹۰۰ء میں ۱۹۶۷ء میں۔ تو یہ ذکر S بان کے اسٹیشن کا ہے۔ اور ہمبرگ میں ہوا کے چلنے کا ہے جس کی وجہ سے ہمارے گیسو بے طرح پریشان ہو رہے تھے۔ ہمیں اپنے دوست مشتاق احمد یوسفی پر رشک آیا کہ کتنی بھی ہوا چلے ان کو ایسے پرابلم پیش نہیں آتے۔ ہمارے ترجمان مسٹر کیدرلین تو ٹکٹ لینے چلے گئے۔ ہم نے ایک دُکان پر کنگھا خریدنا شروع کیا اور خریدتے چلے گئے۔ COMB تو خیر وہ کیا سمجھتا، ہم نے اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کر کے دکھایا۔ اس نے پہلے کریم کی ایک شیشی پیش کی۔ ہم نے رد کر دی تو شیمپو کی ایک ٹیوب دکھائی۔ اس پر ہم نے ہامی نہ بھری تو وہ بالوں کی ایک وِگ دکھانے لگا۔ ہم نے بالوں کی پٹیاں ہاتھ سے جما کر دکھائیں۔ ٹیڑھی مانگ نکالی۔ سیدھی مانگ نکالی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ جانے وہ اپنے کنگھے اور دوسرے سامان کیسے بیچتا

ہو گا۔ اتنے میں مسٹر کیدر لین آ گئے۔ اور انہوں نے کوئی لفظ کہا، اور دُکاندار نے جھٹ بہت سارے کنگھے نکال کر سامنے رکھ دیئے۔

آج کی سنیئے کہ دمِ تحریر ہم برلن اور ہمبرگ اور میونخ وغیرہ کو بھگتا کر دوبارہ فرینکفرٹ میں فروکش ہیں۔ اتوار کا دِن ہے اور عین اس وقت بھی گرجا کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ صُبح اُٹھ کر ہم نے شیو کا سامان نکالا اور صابن لگایا۔ بلیڈ تلاش کئے تو ندارد۔ سوٹ کیس کا کونہ کونہ چھان مارا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر صابن پونچھا۔ بال بنائے۔ سوٹ پہنا اور نیچے کاؤنٹر پر گئے۔ اور پوچھا۔ بلیڈ کہاں خریدے جا سکتے ہیں؟ اس بھلے آدمی نے جانے کیا سمجھا۔ بولا۔ ''اچھا تو آپ جا رہے ہیں، آپ کا بِل بنا دوں؟'' ہم نے کہا نہیں بھائی۔۔۔ ہماری صورت سے اتنے بیزار کیوں ہو رہے ہو۔ ہم فقط شیو کرنا چاہتے ہیں۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بتایا۔۔۔ بولا اچھا اچھا۔ لیکن آج تو سب دُکانیں بند ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ریلوے اسٹیشن جاؤ اور قسمت آزماؤ۔ غنیمت ہوا کہ یہ ہوٹل جسے ہم ''ہوٹل چنیسر گوٹ'' کہتے ہیں، کیونکہ اس کا نام ہوٹل حشیشر ہوف یاد رکھنے کی اور کوئی ترکیب نہیں، اسٹیشن سے فقط پندرہ بیس منٹ کی راہ پر واقع ہے۔ چنانچہ ہم نے صُبح کی ٹھنڈ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُدھر کا رخ کیا۔ اس وقت نو بجنے کو تھے۔ لیکن سڑک پر نہ آدم نہ آدم زاد۔ بندہ نہ بندے دی ذات۔

سارا اسٹیشن گھوم گئے۔ مٹھائی کی دکانیں کھلی تھیں۔ ناشتے والے تھے۔ اخبار والے تھے۔ تمباکو اور سگریٹ والے تھے۔ لیکن ہمارے مطلب کی چیز بیچنے والا کوئی نہ تھا۔ ہم مایوس ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اچھا داڑھی بڑھائیں گے۔ آج کل فیشن میں داخل ہے اور داڑھی نہ رکھنے والا پرانے خیال کا آدمی یعنی مُلّا سمجھا جاتا ہے۔ اپنے پیارے مذہب کے بعض احکام بھی یاد آئے۔ لیکن اتنے میں ایک کولکی نظر آئی۔ کنگھے والے تجربے کی وجہ سے اب کے ہم اپنی زبان دانی پر دھار رکھ کر گئے تھے۔ نہ صرف ڈکشنری سے بلیڈ کا ترجمہ دیکھ لیا تھا BLATT بلکہ یہ بھی یاد کر لیا تھا کہ شیو کرنے کو کیا کہتے ہیں RASIEREN کم پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم رہے کہ ریزر کا لفظ یہیں سے نکلا ہے۔ یا پھر یہ ریزر میں نکلا ہو گا۔ وہاں کھڑکی خالی تھی لیکن اتنے میں ایک بڑی بی آ ہی گئیں ہم نے پہلے BLATT کہا پھر RASIEREN اور پھر داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ بولیں You Mean Blad اور بلیڈوں کا پیکٹ اُٹھا کر دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بے چاری کو جرمن نہیں آتی تھی۔ صرف انگریزی آتی تھی۔ ہماری طرح دونوں زبانوں پر قادر معلوم نہیں ہوتی تھی۔

کل شام ٹیکسی والے نے ہمارے گتن تاگ کے جواب میں بڑے صحیح مخرج سے گُڈ

ایوننگ کہا اور پھر انگریزی بولنی شروع کر دی۔ ہم نے کہا میاں خوب انگریزی بولتے ہو۔ ہمارے مُقابلے کی نہ سہی پھر بھی خاصی اچھی ہے۔ بولا جی میں لندن کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ٹیکسی چلاتا ہوں۔۔۔ انڈیا میں بھی رہا ہوں۔ آپ کہاں کے ہیں؟ ہم نے پاکستان اور کراچی کا نام لیا۔ بولا۔ لاہور بڑا خوبصورت شہر ہے۔ ہم نے کہا، کیسے معلوم ہوا؟ بولا۔ میں چھ سال تک اٹاکی کیمپ میں رہا ہوں جو لاہور اور امرزہ کے درمیان واقع ہے۔ اٹاکی اور امرزہ تو ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن مزید تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ وہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۶ء تک وہاں رہے۔ فوج میں میجر تھے ہم نے کہا (اُردُو میں) کیا اُردُو بولتے ہو؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے انگریزی میں یہی سوال کیا تو بولا۔ ہم آفیسر تھا اور برٹش آرمی میں تھا۔ ہمارا چھوٹا لوگ، سپاہی لوگ Natives سے ملتا تھا ہم نہیں ملتا تھا۔ آخر ہم نے کہا۔ تمہارے کیمپ کا نام ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ اٹاکی تو کوئی جگہ نہیں، اٹاری ہو شاید۔۔۔ بولا، ہاں اٹاری اٹاری۔ امرزہ کے بارے میں بھی ہم نے کہا۔ یہ امرتسر کی خرابی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے تصدیق کی۔ یہ میجر تھامس صاحب جورُو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ بس تنہا یہاں رہتے ہیں۔ سال دو سال میں لندن بھی ہو آتے ہیں۔ بولے میرے لئے سب جگہیں برابر ہیں۔ میں انڈیا میں رہا، فلسطین میں رہا، جرمن جانتا ہوں،

فرنچ جانتا ہوں، اٹالین جانتا ہوں، ہسپانوی جانتا ہوں۔ ہم نے کہا اچھا میجر صاحب ہماری منزل آ گئی ہمیں اتار یے۔ ہم نے میجر صاحب کو تھوڑی سی بخشش بھی دی اور انہوں نے تھینک یو کہا۔ یہی میجر صاحب ہمیں ۱۹۲۲ء میں سڑک پر دیکھ لیتے تو گولی مار دیتے۔ غنیمت یہ ہے کہ ہم اُن کے ولایت لوٹ جانے کے بعد پیدا ہوئے۔

میونخ میں جو بی بی ہمارے پلّے پڑیں وہ بہت شائستہ اور نستعلیق تھیں۔ پلّے پڑنا کا لفظ تو خیر بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے اور کئی غلط فہمیوں کو جنم دے سکتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ بطور گائیڈ ننھّی الف تھیں۔ یہ بھی ہم اپنے علم کی وسعت کی وجہ سے عدالتی اصطلاح لکھ گئے، منسلک تھیں کہیے۔ اور تو بہت کچھ جانتی تھیں حتّٰی کہ ہمارے ملک کا نام بھی سُن رکھا تھا۔ لیکن ہماری زبان کا نام سُن کر ہنسیں۔ بولیں۔ ''ارندو؟'' ہم نے تصحیح کی کہ ارندو نہیں۔ اُردُو۔ کوئی تین دِن کے بعد ان کو یہ نام یاد ہوا۔ ظاہر ہے ہماری زبان کی خوبیوں، اس کے دردبست، فصاحت اور بلاغت ضائع بدائع مراعاۃ النظیر مفعول مالم لیسم فاعلہ، اور دوسری باریکیوں تک پہنچنے کے لئے انہیں کئی سال درکار تھے اور ان کو وہاں تک پہچانے کے لئے کئی سال ہمارے پاس نہیں تھے۔ ہم نے اُن کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ کروڑوں آدمیوں کی اس زبان کے عظیم ادب میں ہمارا کیا مقام ہے۔ کیسے ہمیں وہاں سر آنکھوں پر بٹھایا

جاتا ہے۔ کیسے ہمارے ملک کی گوریاں ہمارے آنے کی خبر سُن کر قطار در قطار کھڑی ہو جاتی ہیں۔ انکسار اچھی چیز ہے لیکن ہر چیز کا حتّٰی کہ انکسار کا بھی کوئی موقع محل ہوتا ہے۔

ہم نے موصوفہ سے کہا۔ تم اپنے حساب سے یوں سمجھ لو کہ جیسے جرمن ادب میں گوئٹے ہے کچھ ایسے ہی اُردُو ادب میں ہم ہیں۔۔۔ فیض کے دو تین اشعار کا ترجمہ بھی سُنایا کہ یہ ہمارا نمونہ کلام ہے۔ بہت خوش ہوئیں اور بس انہیں خوش کرنا ہی ہمارا مقصد تھا۔ فیض صاحب روس وغیرہ ہمارے اشعار اپنے نام سے پڑھ کر رنگ جمانا چاہیں تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

چند خطوط۔۔۔ سراسر ذاتی

فرینکفرٹ ہمیں پسند ہے۔ اس کی گلیوں میں ہم بارہا تنہا گھومے ہیں۔ گلیوں میں، ریلوے اسٹیشن پر، دریائے مین کے ساتھ ساتھ۔ اِس پار اور اُس پار، یونیورسٹی کی غلام گردشوں، گوئٹے کے گھر کے نواحات میں، پام گارڈن میں، باغِ وحش میں۔ جرمنی کا پہلا شہر فرینکفرٹ ہی تھا جس کے کنارے ۱۹۶۱ء کے موسمِ خزاں میں ہمارا کارواں آن کے اُترا تھا۔ لیکن اب کے ہم تنہا نہیں تھے۔ جرمنی کی حکومت کے مہمان تھے اور اِن صاحبوں کے آدابِ میزبانی یہ ہیں کہ آپ کے جرمنی میں اُترنے

کے لمحے سے لے کر ایک ترجمان آپ کے ساتھ ہو جائے گی، یا ہو جائے گا۔ عام طور پر ہو جائے گی ہی کہیے۔ اور اس صیغے میں بھی اپنی اپنی قسمت کی بات ہے، آپ کے دِنوں کی خوشگواری یا ناخوشگواری کا انحصار اس پر ہے کہ آپ کو رفیق کیسی ملی۔ خوش مزاج یا ترش رَو۔ دِل نواز یا تند خُو۔ فیاض یا کنجوس۔ اس کے پاس ایک بٹوا ہوتا ہے۔ آپ کی ٹیکسی کا بل یہ دے گی۔ کھانے کا بل یہ ادا کرے گی۔ تھیٹر، سینما، میوزیم سب جگہ لے جانا اس کا ذمّہ۔ ہوٹل کا حساب بھی اس کے ذمّے رہے گا۔ آپ دندنایئے، کھایئے۔ نقد پیسہ آپ کے ہاتھ میں نہیں دیا جائے گا۔ پہلے دِن جب بی بی ارسلارات کے گیارہ بجے ہم سے جدا ہو کر جانے لگی تو ہم نے کہا۔ تم نے تو فرمایا تھا کہ دِن بھر ساتھ رہو گی۔ بولیں دِن ختم ہوا۔ ہم نے بہت حُجّت کی کہ ریلوے کا دِن ۲۴ گھنٹے کا ہوتا ہے اور ہم ریلوے کے آدمی ہیں اور اکثر نائٹ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے ہماری ایک نہ سُنی۔ اس سفر کے دوران میں ہم نے ایک دوست کو پیرس سے جو خطوط لکھے، وہ انہوں نے ہمارے حوالے کر دیئے ہیں۔ ”درِ عہدِ جوانی“ کی طرح دورانِ مسافرت میں بھی چنانکہ افتد دانی۔

سمے سمے کی بات الگ ہے

سمے سمے کا اپنا بھاؤ

فرینکفرٹ

۱۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء

جنابِ والا! دمِ تحریر ہم فرینکفرٹ سے بول رہے ہیں۔ شب و روز مُفت کی کھا رہے ہیں۔ جو مزہ مُفت کے کھانے میں ہے وہ کما کر کھانے میں کہاں۔ آدھا مزہ تو اسی خیال سے غارت ہو جاتا ہے کہ ہم اپنا پیسہ کھا رہے ہیں۔ بھلا اپنا پیسہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے؟

ہاں ایک ترجمان ہمارے ساتھ ہے۔ جرمنی میں خوبصورتوں کی کمی نہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ ڈھونڈ ڈھونڈ کر آدمی کا بچّہ لگاتے ہیں۔ پچھلی بار بھی برلن میں ہمارے ساتھ یہی ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سفر نامے میں ہم نے اپنی رفیقہ Escort کا ذکر ایسے گول مول الفاظ میں کیا تھا کہ بہت سے رقیب مارے رشک کے جاں بحق ہو گئے اور بہت سی دیسی حسیناؤں نے اپنی انگلیاں جلاپے میں آ کر کاٹ لیں۔

اس بی بی ترجمان سے ہم نے کہا تمہارے نام کے کچھ معنی بھی ہوتے ہیں؟ فرمایا۔ جی ہاں! بندی کے نام کا مطلب ہے ریچھ کا بچّہ۔ فوراً نظیر اکبر آبادی یاد آئے۔ وہ ہوتے تو اِن کو نچانے کی سوچتے۔ بہر حال یہ ثابت ہوا کہ جرمن لوگ حقیقت شناس ہیں۔

ہماری طرح نہیں کہ اندھے کا نام نین سُکھ رکھ دیں۔ چونکہ اُن کا کھانا پینا بھی ہمارے کھاتے میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بے تحاشا طرح طرح کی وائن پیتی ہیں اور ہمیں ایپل جوس پلاتی ہیں یہ کہہ کر کہ یہ فرینکفرٹ کا خاص تحفہ ہے۔ جس اُونچے ریستوران میں جانے کو اُن کا جی چاہتا ہے وہاں لے جاتی ہیں اور چنگا چوسا کھاتی ہیں۔ ہم تو آلو گوشت کھا کر اور کوکا کولا پی کر آجاتے ہیں۔ یہ شراب سے شروع کر کے شراب پر ختم کرتی ہیں۔ ہمارے میزبان بھی بِل دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ یہ شخص کیسا بلانوش ہے۔ صورت سے تو معلوم نہیں ہوتا۔

دفتر سے چھٹی، کام سے چھٹی۔ کالم تک سے چھٹی، خبروں سے بھی چھٹی ہی جانیے۔ کل "ہیر الڈ ٹریبیون" لیا تھا اس میں پاکستان کی خبر تھی۔ وہ بھی نامکمّل۔ جلالت مآب یحییٰ خاں کا قول نقل کیا ہے کہ سال کے آخر تک اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔ لیکن سال کا نام یعنی سن نہیں لکھا۔

اب اگلا خط آگے کی منزل سے۔ جرمنی کو بھگتا کر پیرس آئیں گے۔ وہاں ہمارے خیر مقدم اور خورد و نوش کا مضبوط انتظام ہونا چاہیے۔۔۔۔۔۔۔۔

میونخ

۱۶اکتوبر ۱۹۷۱ء

میونخ میں ہمارے استقبال کی کوالٹی معتدبہ طور پر بہتر ہو گئی ہے۔ ہر چند کہ استقبال کرنے والی بی بی ویرونیکا اپنے ساتھ باجا نہیں لائیں نہ سُرخ قالین بچھایا۔ جھنڈیاں اور محرابیں بھی ہم نے نہ دیکھیں۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ خود خوبصورت تھیں۔ اور مُسکراہٹ بھی دِلنواز رکھتی تھیں۔ ہم نے کہا Thank you for being so beautiful فرینکفرٹ والی مادہ ریچھ کو یاد کرتے ہوئے ہم نے کہا۔ "اے نیک بخت! اے دختر میونخ! بھلا تیرے نام کا مطلب کیا ہے۔ تو تو ہمیں خرگوش کا بچّہ معلوم ہوتی ہے۔" ہنس کر بولیں۔ "آپ کے نام کا کیا مطلب ہے؟" ہم نے کہا "ہمارے نام کا مطلب ہے کچھوا۔ اب دوڑ ہونی چاہیئے دیکھیں کون جیتتا ہے۔" بہت ہنسیں۔ فرمایا "میرے نام کا مطلب ایک طرح کا پھول ہے۔" ہم نے کہا۔ یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا۔ ہمیں گیت وغیرہ لکھنے میں آسانی رہے گی۔ بھونرا بن کے منڈلائیں گے۔

اب برلن بیچ میں ہے اور پھر ہمبرگ ہے، اگر صورت حال یونہی بہتر ہوتی تو یقین

ہے۔ ہمبر گ میں سال رواں کی مس جر منی چھلانگ لگا کر ہمارا استقبال کرے گی۔ اور وفورِ شوق میں ہمیں لپٹ جائے گی۔ ہمیں اپنے منہ سے لپ سٹک چھڑُانی مشکل ہو جائے گی۔ ہمیں اس وقت تک اپنی گرفت سے آزاد نہ کرے گی جب تک ہم اس کی تمام مُرادیں پوری کرنے اور تمام فرمان بجالانے کا وعدہ نہ کریں۔ مُشکل یہ ہے کہ ہم لے دے کے اُرُدو کے ادیب ہیں اور اس بی بی نے اس زبان کا نام پہلی بار سُنا ہے۔ ہماری ذات کسی کام آئے تو آئے صفات تو بالکل بیکار ہو گئیں۔ افسوس کیا زمانہ آگیا ہے کہ لوگ صورت کو دیکھتے ہیں سیرت کو نہیں دیکھتے۔ سُنا ہے پرانے زمانے میں سیرت کو دیکھنے کا رواج تھا۔ ہمیں پرانے زمانے میں ہونا چاہیے تھا۔

میونخ کا میوزیم

ہوٹل اچھا ہے۔ فرینکفرٹ سے بہت بہتر اور ایک دم ماڈرن۔ ہم نے بی بی ویرونیکا سے جو ہمیں نیچے ہوٹل کے دفتر استقبالیہ میں ملتی ہیں کئی بار کہا کہ ہمارے کمرے میں بڑی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ تصویریں ہیں۔ مٹھائیاں ہیں۔ شرابوں سے بھرا ریفریجریٹر ہے۔ وہاں آؤ۔۔۔ کُرتا پاجامہ پہن کر دِلجمعی سے باتیں کریں گے۔ لیکن وہ طرح دے جاتی ہیں، جیسے خدانخواستہ ہماری نیّت خراب ہو رہی ہو۔ خدانخواستہ ہمیں اپنی پرانی نظم یاد آرہی ہے۔

جس صورت کے پیچھے بھاگے ہاتھ نہ آئی خواب بنی

یا ساگر کی تہ کا موتی، یا بنتِ مہتاب بنی

ہاں نظموں کی کھیپ سے اچھی خاصی ایک کتاب بنی

ویسے بھوک اس بی بی کی بھی اچھی ہے۔ ہم ابھی آلو ٹھونگ رہے ہوتے ہیں کہ یہ کھانے کا طباق صاف کر جاتی ہیں۔ میٹھے کا آرڈر دے دیتی ہیں۔ کافی کو ناپسند کرتی ہیں۔ اس کی جگہ وائن پیتی ہیں۔ ہم سوپ سے آغاز کرتے ہیں، یہ بیئر سے۔ ہم سے شکایت کرتی ہیں کہ بھوک رکھ کر کیوں کھاتے ہو۔ خوب کھاؤ اور خوب پیؤ۔ ہم نے کہا ہمارا ارادہ وزن کی قدر گھٹانے کا ہے I must watch my figure۔ کہنے

لگیں، فکر مت کرو، میں تمہاری فیگر واچ کروں گی۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے تم ہماری فیگر واچ کرو، ہم تمہاری فیگر واچ کرتے ہیں۔ ویسے وہ کریں نہ کریں، ہم ہمہ وقت اُن کی فیگر واچ کرتے ہیں۔ بدن سُبک اور چھریرا۔ عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اندازاً اٹھارہ اور چالیس سال کے درمیان۔

برلن

۱۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء

آج شام ہم نے برلن کی اس سڑک پر جسے اپنے پرانے سفر نامے میں ہم نے شاہراہِ کُفرستان کا نام دیا ہے، ایک لمبی سیر کی حتّٰی کہ پاؤں میں گٹّے پڑ گئے اور چلنے کی سکت نہ رہی۔ یوں بھی سڑک وہاں کچھ بند ہی ہو گئی تھی۔ انڈر گراؤنڈ راستہ بن رہا تھا۔ وہاں ایک لمبے تڑنگے لڑکے نے ہمیں "ہیلو" کہا۔ ہم نے بھی ہیلو سے جواب دیا۔ اب وہ بولا۔ "آر یو این امریکن بوائے؟" ہم نے جی میں کہا۔ بوائے تو خیر ٹھیک ہے۔ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے لیکن یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ ہم پر امریکن ہونے کا شُبہ ہو سکتا ہے؟ پھر خیال آیا کہ ہمیں نیگرو سمجھا ہو گا۔ جرمنوں کی معلومات بس ایسی ہی

ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے انکار پر وہ بولا۔ ”آر یو اے جرمن؟“ یہ حد تھی۔ ہم نے جواب میں سر ہلایا تو بولا تم کوئی بھی ہو، میرے ساتھ بار میں چلو۔ خیریت اسی میں نظر آئی کہ تھینک یو کہہ کر وہیں سے لوٹ آئیں۔ آگے چلے ہوئے گر جاو لہلم کرک کے پاس ایک لڑکے نے رستہ روکا اور کہا آپ کے پاس بیس پیسے ہوں گے۔ یعنی بیس فینگ؟ ہم نے کہا ہوں گے چنانچہ دے دیے۔۔۔ جانے بیس پیسوں سے اس کا کیا بنا ہو گا۔ اس سے اگلے چوراہے پر ہمارے ہوٹل کے عین پاس ایک بی بی نے ہمارے ساتھ سڑک پار کرتے ہوئے کہا:

”ہلو! آپ بتا سکتے ہیں یوروپا سنٹر کہاں ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”یہ سامنے یوروپا سنٹر ہی تو ہے۔“ بولی۔ ”اصل میں میں یہاں اجنبی ہوں۔ میونخ کی رہنے والی ہوں اس نامراد شہر میں آج آئی ہوں۔ کل چلی جاؤں گی۔“

ہم نے کہا: ”میونخ بہت خوبصورت شہر ہے۔“

بولیں۔ ”تم کہاں کے ہو۔“

چھریرے بدن کی خوبصورت لڑکی تھی۔ بغل میں چھاتا۔ بظاہر طالبِ علم لگتی تھی۔ ہم نے مصرع پڑھا۔ تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں۔۔۔ امابعد اپنے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔

"کیا کرتے ہو؟"

ہم نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہم کچھ کرنے کے قابل کہاں ہیں۔"

"اب کہاں جارہے ہو؟"

"اپنے ہوٹل۔"

"ہیں ابھی سے؟ ابھی تو بہت سویرا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ تم بھی تنہا ہو، میں بھی تنہا ہوں، کہیں چلیں۔"

ہم نے کہا۔ "کہاں چلیں؟ دنیا کے کس نکڑے؟"

بولیں۔ "یوروپا سنٹر میں (معلوم ہوا ہم سے پتہ تجاہلِ عارفانہ میں پوچھا تھا) ایک کلب ہے جہاں Striptease ہوتا ہے۔"

"وہ مُجھے پسند نہیں۔"

"کہیں چلیں جہاں سافٹ میوزک بج رہا ہو۔ مجھے ایک جگہ معلوم ہے۔ بس ٹیکسی لینی پڑے گی۔" طاعت و زہد کا ثواب تو ہم جانتے ہیں۔ لیکن قدرت نے ہمیں پارسائی سے زیادہ بُزدلی عنایت کی ہے۔

اس لئے ہم نے کہا۔ "نا بی بی۔ ہم تھک گئے ہیں ہمیں جا کر سونا ہے۔"

جب اس بی بی نے دیکھا کہ اِن تلوں میں تیل نہیں ہے تو جھٹ سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہا اور اسی چوک کی طرف چل دی۔۔۔ ممکن ہے اسے کوئی اور سافٹ میوزک کا شیدائی مل گیا ہو۔

ہم نے ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کے ضخیم رجسٹر میں اس کا نام البتّہ لکھ لیا ہے۔ مس وردسکا۔ اصلاً چیک۔ آٹھ سال سے مقیم میونخ۔ طرح دار۔ خوش آواز۔ عمر ۲۰-۲۱ سال، ملاقات نزد و لہلم چرچ، مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء۔۔۔ اس رجسٹر میں ناموں کی کمی نہیں بلکہ اب تو لبالب بھر چلا ہے۔

میونخ کے ٹیکنیکل میوزیم میں زیرِ زمین کوئلے کی ایک کان بنی ہوئی ہے سُرنگ در

سُرنگ۔ اسی طرح ایک کان نمک کی بھی۔ ان راستوں میں نہ آدم نہ آدم زاد۔ بقول فردوس بیگم ''جتھّے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے'' وہاں ورونیکا کے ساتھ کوئی پون گھنٹہ گھومتے۔ کہیں نیم تاریکی میں کہیں اندھیرے گھُپ میں۔ جی میں کیا کیا خیال آئے اور کیا کیا وسوسے اُٹھے۔ رسمِ دُنیا بھی تھی، موقع بھی تھا، دستور بھی تھا، کان کے خاتمے پر ورونیکا نے کہا۔ ''کیسی ویران جگہ ہے۔ میں پہلی بار آئی ہوں۔ میں تنہا تو کبھی نہ آتی تم ساتھ تھے اِس لئے آ گئی۔'' باہر سڑک پر آ کر ہم نے کہا۔ ''اے بانو! اب ہم تمہیں بتا دیں کہ تم زیرِ زمین زیادہ محفوظ بھی نہ تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کیا کیا کچھ۔۔۔ تھوڑی تفصیل بھی عرض کی۔ شرارت سے ہنس کر بولیں۔

It Would Not Have Been a Very Bad Idea

خواجہ ناظم الدّین مرحوم کے متعلّق مشہور ہے کہ بات بات پر کہا کرتے تھے۔

''ہم کتنے گدھے ہیں۔'' وہ گدھے نہیں تھے۔ یہ ان کا انکسار تھا۔ تکیہ کلام تھا۔ بی بی ورونیکا کی بات سُن کر ہماری زبان سے بھی بے اختیار نکلا۔ ''ہم بھی کتنے گدھے ہیں۔'' اس میں انکسار کو کچھ دخل نہ تھا۔

برلن کا جلا ہوا گرجا

ہیمبرگ

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء

لیجیے ہم کل شام ٹھنڈے ٹھنڈے ہیمبرگ پہنچ گئے۔ برلن سے خط نہیں لکھ سکے۔ ہوا یہ کہ ہمارا بڑا بول ہمارے آگے آیا۔ میونخ میں ہم نے جو توقّع باندھی تھی اس پر پانی پھر گیا۔ تھوڑا بہت نہیں، پورا بحرِ اوقیانوس۔ برلن میں ہمارے استقبال کو جو

عفیفہ آئیں اُن کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ واپس جہاز کی طرف لوٹ جائیں یا اس سے کہہ دیں، نہیں، ہمارا نام ابنِ انشا نہیں ہے بلکہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن تقدیر کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ یہ جرمن لوگ کبھی ہمارا دِل نہیں جیت سکیں گے۔ ان کو دِل جیتنا نہیں آئے گا۔ ذرا سوچیے جس شخص کے ساتھ یہ بی بی گائیڈ ہوں گی وہ کیسے پرو جرمن رہ سکتا ہے۔ ہمیں وہ تمام زیادتیاں یاد آ گئیں جو ہٹلر نے محکوم قوموں پر کی تھیں۔

میونخ والی بی بی کی عمر ہم نے اٹھارہ اور چالیس کے درمیان لکھ دی تھی لیکن جی چاہتا ہے کہ ان کو خوش خطی یعنی خوبصورتی کے نمبر دیے جائیں۔ لہٰذا اسے اٹھارہ اور اٹھائیس کے درمیان سمجھیے بلکہ اٹھارہ کی طرف زیادہ۔ اس برلن والی گائیڈ کی عمر بھی زیادہ قطعیت سے نہیں بتا سکتے۔ تاہم موٹا سا اندازہ ہے کہ انتالیس اور چالیس سال کے درمیان کی ہوں گی۔ بال گدھے کے بالوں کی رنگت کے اور عجب طرح بکھرے ہوئے۔ بے ہنگم، اس پر ہر تین منٹ بعد آئینہ دیکھتی ہیں۔ جانے اس میں کیا دیکھتی ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد لِپ اسٹک لگاتی ہیں۔ چاکلیٹ کا بھی شوق ہے اور پیپرِمنٹ کی گولیوں کا بھی۔ جامہ زیب ایسی ہیں کہ کپڑا کتنا بھی اچھا ہو اِن کے بدن پر لٹکنے لگتا ہے۔ ہم تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کی طرف دیکھیں ہی نہیں۔ نظریں جھکائے رہتے ہیں۔ ایک بار اِن صاحبہ نے اعتراض بھی کیا۔ ہم نے یہ کہہ کر مطمئن

کر دیا کہ یہ مشرقی تہذیب کے تقاضے ہیں۔ حیا ہم لوگوں کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ میونخ والی ویرونیکا کے چہرے کو البتّہ ہم اتنا دیکھتے تھے کہ راستے میں جا بجا ٹھوکر کھاتے تھے۔ البتّہ وہ ٹھوکر نہیں کھائی جو کھانے کی تھی۔

ہمارا خیال ہے برلن کی بی بی کے معاملے میں دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اگر ہم خوش نہ تھے تو اس کے لیے بھی خوش ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اُس کی اُمّیدوں پر بھی تو اوس پڑی۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ کوئی بڑا ہی ڈان ژوان آرہا ہے۔ کیا عجب کوئی بگڑا مہاراجہ ہو۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا اور سر پر مکٹ پہنے اپنی اطلسی اچکن چمکاتا جہاز سے اُترے، جیب ڈالروں اور پاؤنڈوں سے لبالب بھری وغیرہ۔ لیکن اس وقت اس کے نقطۂ نظر سے ہمیں دلچسپی نہیں۔ دوسری بیبیوں کے ساتھ ہم فوراً ان کے کرسچن نام سے مخاطبت شروع کر دیتے تھے اور ان کو اپنا مسلمان نام بتا دیتے تھے کہ فقط ''پیارے'' کہہ کر بُلانا کافی ہے۔ لیکن اِن کو ہم نے پورے احترام سے ہمیشہ مسز فلاں ہی کہا۔ برلن سے روانگی کے روز بار بار فوٹو گرافر کو فون کرتی رہیں۔ ہم نے کہا۔ کاہے کو؟ بولیں ہماری ایک اکٹھّی تصویر ہونی چاہیے۔ ہم نے کہا ہم نامحرموں کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے قائل نہیں۔ ہماری تہذیب میں اس کی ممانعت ہے۔ ہیمبرگ ائیرپورٹ پر ہم جس قسم کی لڑکی اپنی پذیرائی

کے لئے چاہتے تھے وہ باہر جنگلے کے پاس موجود تھی اور منتظر معلوم ہوتی تھی۔ ہم سیدھے اس کے پاس گئے کہ ہمیں پہچانے گی اور اھلاً و سھلاً کہہ کر گلے میں بانہیں ڈال دے گی۔۔۔ عین اسی وقت مسٹر کیدرلین نے ہمارا ہاتھ تھام کر گتن تاگ کہا اور کہا کہ ہیمبرگ میں یہ بندہ آپ کے ہم رکاب رہے گا۔

اس وقت ہم نے جو گہرا سانس لیا۔۔۔ جانے وہ مایوسی کا تھا یا اطمینان کا۔

پھر وہی لندن، پھر وہی ہم

پھر وہی لندن، پھر وہی ہم۔ لندن ہماری کمزوری ہے۔ لندن سے آتے ہی ہم لندن کے لئے Nostalgic ہو جاتے ہیں۔ ہم جب گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اور صحرا صحرا کی خاک چھان کر اور پھانک کر لندن پہنچتے ہیں تو کمر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مانوس لوگ، مانوس گلیاں، وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جِن میں کھوئی تھی۔ ہم نے نہ سہی، ہمارے دوستوں نے سہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مانوس زبان جرمنی اور فرانس میں ہمیں اشاروں کی زبان میں بات کرنے بلکہ رازی کے نکتہ ہائے دقیق

بیان کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہاں بھی شروع میں اشاروں سے کام چلانا چاہا۔ مخاطب نے انگریزی بولنی شروع کی تب یاد آیا کہ یہ تو ہم اپنے وطن میں ہیں۔

ہاں سِکّے کا مسئلہ ہمیں ضرور پیش آیا۔ انگلستان والوں نے ہمارے پچھلے سفر کے درمیان اپنے سِکّے بدل دیئے ہیں۔ یعنی اعشاریہ کر دیئے ہیں۔ شِلنگ کو تو بالکل نکال باہر کیا۔ ہم شِلنگ کا نام لیتے تھے تو لوگ پوچھتے تھے شِلنگ کیا ہوتا ہے؟ اس کے علاوہ پینیWise ہو گئی اور پاؤنڈFoolish ہو گیا یعنی پینی ایک اِکنّی کی ہوتی تھی اب وہ ڈھائی آنے کی ہے اور پاؤنڈ میں اب اس چیز کو ہم فقط دور سے دیکھ سکتے ہیں جسے پہلے خرید سکتے تھے۔ پھر ہم جو پاؤنڈ کی قیمت اپنے سِکّے کے حساب سے گنتے ہیں۔ پہلے نئے پنس کو پرانے شِلنگوں میں بدلتے ہیں۔ پھر شِلنگ کو روپے آنے پائی میں مُنتقل کرتے ہیں کہ قیمت کا اندازہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ دُکاندار کا سودا بِک جاتا ہے اور ہمیں سکندر کی طرح دُکان سے خالی ہاتھ آنا پڑتا ہے۔ یہ نئے سِکّے بھاری بھی بہت ہیں۔ خصوصاً ہم ایسے ہلکی جیب والے کو تو بہت بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ پانچ سات پاؤنڈ کی ریز گاری کے لئے کسی نہ کسی جانور کی ضرورت پڑتی ہے۔ بھاری ہونے کا ایک فائدہ ہے کہ اس سے کبھی کبھی جان بچ جاتی ہے۔ آئرستان کے ہنگاموں میں ایک روز لندن ڈیری میں ایک شخص کے گولی لگی۔

لیکن اس کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ گولی جیب میں دس پینی کے سِکّے پر پڑی اور اُچٹ کر رہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس کے پاس پیسہ ہے اس کو گولی کا بھی ڈر نہیں۔

یوں تو ہم ایسے آدمی کو جس کے پاس پیسے نہ ہوں یا بہت کم ہوں، ہر شہر مہنگا معلوم ہوتا ہے لیکن لندن اب واقعی مہنگا ہے۔ اس پر لوگوں کی مہمان نوازی کا یہ حال ہے کہ ہمارے آتے ہی پوچھنا شروع کر دیا میاں کب واپس جاؤ گے؟ ہم نے کہا۔ "ہمارا آنا اتنا ہی گراں گزرا؟"

جواب ملا۔ "نہیں یہ بات نہیں۔ تم ملک کی مایہ ناز ہستی ہو اور قوم کی خدمت کا دعویٰ رکھتے ہو۔ آج پھر ملک پر مُصیبت پڑی ہے تمہارے ملک کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"

یہی بات ہم نے عالی صاحب سے کہی، بولے۔ "اپنے ملک سے زیادہ خود مُجھے اپنی ضرورت ہے لیکن خیر ہے ختم ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔" لندن کو دیکھنا ہے تو اس کے مضافات کو دیکھیے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لندن انگلستان میں نہیں بلکہ انگلستان لندن میں واقع ہے۔ ہم جس دوست کے ہاں ٹھہرے وہاں چار روپے دے کر ٹیوب یعنی زمین دوز ریل میں جاتے تھے۔ ریل سے اُتر کر ایک روپیہ میں بس لیتے

تھے۔ اس کے بعد کوئی پَون میل پیدل چلتے تھے۔ اگر زمین دوز ریل نہ ہو جس کے راستے میں ٹریفک حائل نہیں ہوتا تو یہ سفر بس وغیرہ میں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا ہے۔ ہاں مرکزی لندن جیسا تھا ویسا ہی ہے اور اس میں ہم اب بھی اسی طرح راستہ بھولتے ہیں جس طرح پہلی بار جانے پر بھولتے تھے۔ بشرطیکہ نقشہ نہ دیکھیں۔ دراصل ہمیں سِمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی بغلی گلی سے آکسفورڈ اسٹریٹ پر آ کر اُتریں یا آکسفورڈ سرکس کے اسٹیشن سے باہر آئیں تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ ماربل آرچ اس طرف کو ہے یا مخالف سمت میں۔ کئی بار تو آدھ میل غَلَط سِمت میں جا کر واپس آنا پڑا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ پر ہرے رام اور ہرے کرشن والا تماشہ اب بھی جاری ہے۔ کُچھ انگریز بہادر سر منڈائے، چوٹیاں رکھے، گلوں میں جنیو ڈالے اور ہندوانہ دھوتی پہنے جس کا پہلو پیچھے اڑسا رہتا ہے، ڈھول بجاتے، جھانجھنیں چھنکاتے اور منتر گاتے، ٹھمکتے ناچتے چکّر کاٹتے رہتے ہیں۔ دو تین تو مُستقل ہیں۔ لڑکیاں بھی لمبے لمبے جھبر جھالے پہنے کھڑ تالیں لئے ان میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لندن میں اِس قسم کے ڈھونگ بہت ہیں۔ سوامی لوگ، یوگا والے، پہلے لوگ ٹھٹک کر دیکھتے تھے۔ اب دیکھتے بھی نہیں۔ ہم ہر سال اخبار میں پڑھتے تھے کہ لندن میں کڑاکے کی سردی

ہوتی ہے۔ لوگوں کی آئس کریم بن جاتی ہے۔ دُھند یعنی Fog ہوتی ہے اور دھواں دھار دُھند یعنی Smog بھی ہوتی ہے جسے آپ ہاتھ سے پکڑ سکتے ہیں۔ دیکھنے ہم بھی آئے تھے پر تماشہ نہ ہوا۔۔۔ اب دیکھیے نومبر کے اتنے دِن گزر گئے۔ وہ دھوپ نکلتی ہے کہ کوٹ سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ الا ایسے روز کہ زوروں کی ہوا چل رہی ہو جو شیکسپیئر کی یاد دلاتی ہے۔

چل اے ہوائے زمستاں، چل اور زور سے چل

تو سرد مہریٔ احباب سے زیادہ نہیں

اتّفاق سے جرمنی میں بھی ہم نے گرمی اور دھوپ پائی اور فرانس میں بھی دھوپ کھائی۔ انگلستان سے سردی کی اُمّید باندھی تھی کہ ہم گرم ملک والوں کو خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس پر بھی پانی پھِر گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ دھوپ پھِر گئی۔ ارے بھائی گرمی اور دھوپ ہی درکار ہے تو ہم لوگوں کو یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ تو ہمارے ہاں بھی بہت ہوتی ہے بلکہ لوگوں کے چہرے پر کھلی رہتی ہے۔

ہمارا ایک شعر ہے۔ جانے کس عالم میں کہا ہو گا اور کس کے لئے کہا ہو گا

مُکھ پر روپ سے دھوپ کا عالم، بال اندھیری شب کی مثال

آنکھ نشیلی! بات رسیلی! چال بلا کی بانکی ہے

وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

پچھلے سال ۱۹۷۰ء میں ستمبر کی ایک سُہانی صُبح کے سارے اخباروں میں یہ نوید تھی کہ لندن کے اتج ویئر روڈ کے ماربل روڈ والے ناکے پر ایک طُرفہ دکان کھلی ہے جس کا نام ''این سمرز'' ہے۔ یہ نام مس این سمرز نامی ایک ۲۹ سالہ دوشیزہ نے اپنے نام پر رکھا ہے۔ اور یہ دُکان ہے، سیکس شاپ(Sex Shop)۔ قریب قریب سبھی اخباروں نے جِن میں ٹائمز بھی شامل ہے لمبے لمبے کالم اس موضوع پر لکھ کر لوگوں کی آتشِ شوق کو بھڑکایا۔ ہم ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں۔ ہماری طبیعت

میں آگ وغیرہ نہیں ہے۔ ہم جو پہنچے تو ایک حق کے متلاشی اخبار نویس کے طور پر گئے تھے تاکہ مغرب کی بے راہ روی کے اس نئے مظاہرے کو دیکھ کر اس پر نفرین کر سکیں۔ اس پر ایک عبرت بھرا اور نصیحت بھرا کالم لکھ سکیں اور مشرق کی حیا اور عِفّت کی روایات کو سراہ سکیں۔ ہمارا بس چلتا تو ہم اس بی بی کو وہیں کھڑے کھڑے نصیحت کرتے اور معاشرے میں عورت کے صحیح مقام سے آشنا کرتے۔ لیکن وہاں ہجوم کچھ زیادہ تھا۔ ہم نے طے کیا کہ کبھی اس سے تنہا بات کرنے کا موقع ملے تو تفصیل سے سمجھائیں گے۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے کسی کو ملامت کرنا یوں بھی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ دیکھا کہ کچھ بھیڑ اندر ہے، کچھ بھیڑ باہر ہے۔ باہر کوئی دو سو آدمیوں کی لائن ہو گی کیونکہ دس دس کے گروپ کو اندر جانے کا اَذن ملتا تھا۔ ہم گھنٹہ بھر تو قطار میں کھڑے رہے لیکن جب وقتِ قیام آیا تو سجدے میں گر گئے۔ یعنی باری آنے سے پانچ منٹ پہلے دُکان کے شیشے میں سے منظر دیکھ کر لوٹ آئے۔ ہمیں ایک کام یاد آ گیا تھا، جیسا کہ ایسے ہر موقع پر یاد آ جایا کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم مشرق کے مکینوں کے لئے جن کے ہاں کوک شاستروں اور اکسیری دواخانوں کی روایات بہت پرانی ہیں، وہاں جی اٹکانے والی کوئی خاص چیز نہ تھی۔ شیشیوں اور پڑوں میں کچھ دوائیں تھیں جن کے استعمال سے شبابِ رفتہ لوٹ آتا ہے۔ نامرد

مرد، مرد جوان مرد ہو جاتا ہے۔ یا پھر کچھ کتابیں تھیں، سات سہیلیوں کی داستانوں کی قسم کی جو یوں بھی سوہو کے نواحات کی دُکانوں میں کھلے عام مل جاتی ہیں۔ اس خوش جمال اور خوش تقریر بی بی نے جو تقریر افتتاحی موقع پر کی وہ ہم نے اخبار میں پڑھ لی تھی۔ انہوں نے افتتاح پر جو جام تجویز کیا وہ اس نام سے تھا۔

"جنس، محبّت اور نشاط و لذّت کے نام۔۔۔ شادی شدہ لوگوں کے لئے بھی اور بلا شادی لوگوں کے لئے بھی۔" کسی نے پوچھا۔۔۔ بلا شادی سے کیا مطلب ہے۔ مس سمرز نے اپنے گھنے سُرخ بالوں کو بکھراتے ہوئے کہا۔ "میں مکمّل جنسی آزادی کی قائل ہوں۔ زندگی زندگی ہے اور محبّت محبّت ہے۔ زندگی اپنی جگہ، محبّت اپنی جگہ۔" فرمایا مس اپنے سمرز نے کہ میں ایک دفتر میں سیکریٹری تھی۔ جب عمر عزیز کے ۲۷ سال گزر گئے تو جی میں آئی کہ کُچھ کر کے دکھانا چاہیے جس سے نام روشن ہو۔ اتّفاق سے میرا جرمنی جانا ہوا۔ میں نے بیٹے اوسے Beate Uhse نامی کمپنی کی دُکانیں دیکھیں۔ معلوم ہوا پچھلے سال ان مصنوعات کے خریداروں کی تعداد ۳۰ لاکھ تھی۔ مُجھے خیال آیا کہ انگلستان والوں کا بھی بھلا ہونا چاہیے۔ اب اس دُکان میں جرمنی کے دیگر آلات اور مصنوعات بھی ملیں گی جن کا مقصد وہی ہے جو دواؤں کا ہے۔ مس صاحبہ نے فرمایا یہ ساری چیزیں آپ کو شہر کے مختلف کونوں کھُدروں

میں ضرور مل جائیں گی لیکن بھرے بازار میں ایسی فیشن ایبل جگہ پر پہلی بار ان کی دُکان لگی ہے۔ میرا ارادہ شہر کے بڑے بازاروں میں ایسی پچاس دُکانیں کھولنے کا ہے۔ دُکان کے لئے انہوں نے سُپر مارکیٹ کا لفظ استعمال کیا۔ ایک کتابچہ بھی انہوں نے چھاپ رکھا ہے۔ جس کے سرورق پر ایک برہنہ جوڑا ہے اور پُشت کے ٹائٹل پر اُن کے کپڑے ہیں جو تصویر کھنچواتے وقت اُتارے گئے تھے۔ اندر اس کے بے شک دواؤں کی فہرست بھی ہے۔ وہ خود اس کمپنی کی مینجنگ ڈائریکٹر ہیں اور ان کے منگیتر ان کے مددگار ہیں۔ اور تو سب کُچھ ہماری سمجھ میں آ گیا لیکن یہ نہ آیا کہ مکمّل جنسی آزادی میں منگیتر کی کیا جگہ ہوتی ہے۔ شاید مطلب بوائے فرینڈ ہو۔

اینے سمرز کی دُکان کو ہم فراموش کر چکے تھے کہ آج یہ خبر سامنے آئی۔

Sex Shops Firm Owes £ 60,000 اینے سمرز لمیٹڈ نے جو جنسی دکانوں کے سلسلے کی مالک ہے، دیوالیہ نکال دیا ہے۔ اس فرم کے سر اب تک ساٹھ ہزار پاؤنڈ قرضہ ہو چکا ہے۔ اب یہ کاروبار بند ہے۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دِل

وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

وہ بھی خیریت سے ہیں، ہم بھی

کراچی میں ہم سے ہر کوئی یہ پوچھ رہا ہے کہ لندن سے آئے ہو۔ عالیؔ جی کی سُناؤ کہ کہاں ہیں؟ کِس طرف کو ہیں؟ کِدھر ہیں؟ اگر کُچھ نہیں کر رہے تو کیوں نہیں کر رہے اور کُچھ کر رہے ہیں تو کیا کر رہے ہیں؟ بعضوں کا تو یہ خیال ہے کہ ہم گئے ہی انہیں منانے تھے کہ آ جاؤ۔۔۔ غُصّہ تھُوک دو۔ قوم کا تمہارے غم میں بُرا حال ہے۔ پٹخنیاں کھا رہی ہے۔ وغیرہ۔ گزارش ہے کہ عالیؔ صاحب لندن میں ہیں اور وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہم یہاں کر رہے ہیں۔ وہ بھی قوم کے درد سے بے حال ہو

رہے ہیں، ہم بھی مِلّت کے غم میں نڈھال ہو رہے ہیں۔ وہ کالموں میں دُشمنوں کو للکار رہے ہیں، ہم ریڈیو پر دُشمن کو للکار رہے ہیں کہ "اے برہمنی سامراج ٹھہر تو سہی۔ تیری دُم میں نمدہ۔" وطن کے سجیلے جوانوں کے لئے اُن کے پاس بھی فقط نغمے ہیں، ہمارے پاس بھی۔ خندقیں نہ وہ کھود رہے ہیں، نہ ہم کھود رہے ہیں۔ بندوق کے قریب جاتے وہ بھی ڈرتے ہیں، ہمیں بھی پرہیز ہے۔ القصّہ وہ بھی خیریت سے ہیں، ہم بھی خیریت سے ہیں۔ البتّہ ایک کام ہے جو ہم کر رہے ہیں اور وہ نہیں کر رہے ہیں، وہ چیزیں مہنگی نہیں کر رہے اور ذخیرہ اندوزی نہیں کر رہے۔ انگریزوں کے درمیان رہتے ہیں اور ان کے ہاں جنگ یا ایمر جنسی کے دِنوں میں اس قسم کی باتوں کا رواج نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے حساب سے اہلِ فرنگ میں نیکی اور نیک چلنی کا فقدان ہے کیونکہ شراب اکثر پیتے ہیں۔ گوشت بھی حلال یعنی ذبیحے کا نہیں کھاتے۔ پردے کا بھی چنداں خیال نہیں۔ دُکانداروں کے ماتھوں پر نماز کے گٹّے اور ہاتھوں میں تسبیح بھی نہیں یعنی ان کی عاقبت کا معاملہ مشکوک ہے، لیکن ملاوٹ کا کاروبار وہاں نہیں ہے۔ دُودھ، دہی اور مکھّن مسکا سب خالص ملتا ہے۔ چائے کی پتّی میں بھی چنے کا چھلکا نہیں ہوتا۔ نہ ہلدی میں اینٹیں ہوتی ہیں۔ چینی دُکانوں سے پلک جھپکنے میں غائب نہیں ہوتی، نہ آٹا کہیں جاتا ہے۔ حتّٰی کہ میں

ہولوں کے ڈھکنے تک نہیں چراتے۔

پیارے یہ ہمیں سے ہو، ہر کارے دہر مردے

پیرس سے وہ ہمارے پیرس پہنچنے سے پہلے چل دیے تھے۔ انگلستان میں ہم نے عالیؔ صاحب کو جا پکڑا۔ بغل گیر ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ کسی ہمدمِ دیرینہ سے مدّت بعد ملنے کا اثر ہونا لازمی ہے۔ ہم نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ اب ہم یہیں رہ جائیں گے۔ تم کو اداس نہیں ہونے دیں گے۔" انہوں نے اس امکان سے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "نہیں کوئی بات نہیں ہے۔" ہم نے کہا۔ "پھر ملک کے حالات کا خیال آرہا ہو گا۔ آپ کے کالموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حالت واقعی تسلّی بخش نہیں۔ عادی اور اخلاقی لحاظ سے اصلاح کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن اس پر رونے دھونے سے کُچھ نہیں بنتا۔ حوصلہ رکھو۔" نیپکن سے آنسو پونچھ کر بولے۔ "یہ غُصّہ بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں باورچی خانے میں کھڑا پیاز کاٹ رہا تھا۔"

ہم نے کہا۔ "وہ کیوں؟"

بولے۔ "گو بھی گوشت میں ڈالنے کے لئے۔ کھانا کھا کر جانا۔"

ہم نے کہا۔ ''خود پکائیے گا؟''

بولے۔ ''دیکھتے جاؤ بلکہ اپنی کرسی باورچی خانے میں لے آؤ۔''

ہمارے عالیؔ صاحب جن کو یہاں ہر کوئی بے کار آدمی سمجھتا تھا، ولایت جا کر کام کے آدمی بن گئے ہیں۔ ہم ایک دو راتیں اُن کے ساتھ ایک ہی مکان کی چھت کے تلے رہے ہیں۔ ہم نے ان کو آدھا وقت وطن کی فکر میں غلطاں اور آدھا وقت امورِ خانہ داری میں مصروف پایا۔ کشیدہ کاری تو خیر انہوں نے نہیں سیکھی، لیکن کھانا بڑے سگھڑاپے سے پکاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ولایت میں بیروں، خانساموں، نوکروں، چاکروں، ماماؤں، اصیلوں اور آبداروں، خاص داروں قسم کی چیزیں گھروں میں نہیں ہوتیں۔ ہر شخص آپ ہی خادم آپ ہی مخدوم ہوتا ہے۔ اپنے گھر کے جمعدار کے فرائض تک خندہ پیشانی یا غیر خندہ پیشانی سے خود سر انجام دیتا ہے۔ اپنی قمیض اور موزہ بنیان خود دھوتا ہے۔ اپنا آلو گوشت خود پکاتا ہے اور اپنا انڈا خود تلتا ہے۔ ''اپنا انڈا'' سے ہماری مراد ہے اپنے لیے انڈا۔ کیونکہ ولایت جا کر آدمی کتنا ہی بدل جائے، اتنا بھی نہیں کہ انڈے دینے لگے۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ عالیؔ صاحب شعر لکھنے کے علاوہ کسی کام کے نہیں۔ اور شعر لکھنا بھی کون سا کام ہے۔ ہمارے ملک میں ہر کوئی لکھ لیتا ہے۔ ہاں کھانا پکانے کو ہم کام بلکہ ہُنر جانتے ہیں اور جس

طرح کا بھی کسی میں کمال ہو اچھا ہے۔ یورپ نے ساری ترقّی ہُنر کی وجہ سے کی ہے۔ ہمیں ولایت میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کتنا ناقص ہے لوگ دفع الوقتی کے لئے ڈگریاں لے کر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں اوائلِ تعلیم ہی میں Aptitude ٹیسٹ کے ذریعہ ہر شخص کی طبعی صلاحیت اور رجحان کو جانچتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ جو شخص اچھا خانساماں بن سکتا ہے، اُسے شاعری پر مامور کر دیا۔ اور جو اچھا شاعر بن سکتا ہے اس کے ہاتھ میں کرچھا دے دیا کہ چل دیگ پکا اور بگھار لگا۔ واضح رہے کو ہم جو عالیؔ صاحب کے ہاتھ کے کھانے کی تعریف کر رہے ہیں، ان کی شاعری کی خوبیوں سے مُنکر نہیں وہ شاعری بھی اچھی کرتے ہیں۔

ولایت میں یہ بات البتّہ ہے کہ ہر کام بجلی سے یا مشین سے ہوتا ہے۔ چولھا بجلی سے چلتا ہے۔ کپڑے مشین سے دُھلتے ہیں۔ گھر کی صفائی بھی مشین سے ہوتی ہے۔ ہمارے عالیؔ صاحب اپنے کمرے میں جو جھاڑو لگاتے ہیں وہ بجلی ہی کی جھاڑو ہے۔ یہ سارے کام کر کے اور پلیٹیں دھو کر آدمی نہاتا ہے۔ اور نہا کر کپڑے سے ٹب کو خود ہی صاف کرتا ہے اگر اسے صاف کرنے کے عمل میں پھر گندہ ہو جائے تو پھر نہا سکتا ہے اور دوبارہ ٹب صاف کر سکتا ہے۔ کپڑا اس عمل میں گندہ ہو گیا ہے تو اسے

واشنگ مشین میں ڈالئے اور دھو لیجیے۔ بے شک اس سے مشین گندی ہو جائے گی لیکن اسے اسی کپڑے سے صاف کیا جا سکتا ہے اور دوبارہ اس کپڑے کو اسی مشین میں دھویا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ تو عمر بھر یہی کرتے رہتے ہیں۔

وہاں نہ کام کرنا کسرِ شان گنا جاتا ہے نہ اپنا سامان خود اٹھانا نہ بس یا ٹیوب میں بیٹھنا۔ مزدوری اس طرح نہیں دی جاتی جس طرح غریبوں کو زکوٰۃ دی جاتی ہے۔ نہ سیٹھ اکڑ کر کہتا ہے ارے ہمارے قدم چومو۔ ہماری حب الوطنی دیکھو، ہم لوگوں کو ایمپلائمنٹ فراہم کرتا ہے۔

آوارہ گرد کی واپسی

مکّے گئے، مدینے گئے، کربلا گئے، جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھِر کے آ گئے۔ یہ ہم اپنی بات کر رہے ہیں کہ پیرس، برلن اور لندن کی کوچہ گردی کر کے اور بتانِ افرنگ کا کُچھ نہ بگاڑ کر وہیں لوٹ آئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ لیکن ہم اپنی قوم سے الگ تھوڑا ہی ہیں۔ وہ بھی تو ہر چند برس بعد لوٹ کر وہیں آ جاتی ہے، جہاں سے چلی تھی۔ الیکشن، آئین، جمہوریت وغیرہ کا کام ہمارا کُل وقتی کام ہو گیا ہے۔ اس چکّر میں مادّی ترقّی بے شک ہم نے زیادہ نہیں کی۔ کیونکہ ایک تو مادّی ترقی سے اِلحاد وغیرہ پھیلنے کا

اندیشہ رہتا ہے۔ دوسرے اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ جب چاہیں جس سے چاہیں ہم ایڈ یعنی امداد لے سکتے تھے۔ ہاں جمہوریت اور آئین سازی میں ہم نے وہ مہارت بہم پہنچائی ہے کہ اگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے۔ باقی قومیں ایک آدھ آئین بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ انگلستان والے ابھی تک میگنا کارٹا سے کام چلا رہے ہیں۔ اور امریکہ کو بھی جو ہر سال کاروں کے نئے ماڈل نکالتا ہے، ایک سے زیادہ آئین بنانے کی توفیق نہیں۔ ہم نوزائیدہ مملکت ہونے کے باوجود اب تک تین آئین بنا کر پھینک چکے ہیں اور مزید کی تمنّا رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو ہم اپنی آوارہ گردی کی ترنگ میں کہیں کے کہیں نکل گئے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ اپنی قوم کی بے لوث خدمت کے جذبے نے ہمیں وطن لوٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ پیسے بھی ختم ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ ہم اندرا جی کے پیچھے پیچھے گئے تھے۔ پیچھے پیچھے کا وہ مطلب نہیں جو آپ سمجھے ہیں۔ ہمیں اپنے چال چلن پر کبھی شُبہ نہیں ہوا۔ بایں ہمہ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ اُدھر وہ وطن سے نکلیں اِدھر ہم وطن سے نکلے۔ جہاں جہاں وہ پدھاریں، ہم نے بھی قدم رنجہ فرمایا اور جس تاریخ کو وہ دِلّی واپس پہنچیں، اُسی تاریخ کو ہم نے کراچی کے ہوائی اڈّے پر نزولِ اجلال کیا۔ یہ سچ ہے کہ اُن کا جانا زیادہ مشہور ہوا۔ ان کے متعلّق ولایت کے

اخباروں میں بہت کچھ چرچا ہوا کہ کِس سے ملیں، کِس سے بات کی، کِس سے کیا مانگا، اور کِس نے کس طرح دھتا بتایا۔ ہم بھی لوگوں سے مِلے اور کُچھ نہ کُچھ بات کی۔ ہم نے بھی بعضوں کی طرف حسنِ طلب کی نظر کی اور ہمیں دھتا بھی بتایا گیا۔ لیکن ہماری کوئی بات اخبار میں نہیں آئی۔ اس لئے کہ ہم ہمیشہ نام و نمود اور شہرت سے دور بھاگتے ہیں۔ خود نہ بھاگیں تو لوگ بھگا دیتے ہیں۔

یہاں آن کر یہ دیکھ کر البتّہ خوشی ہوئی کہ ہمارے ہدایت نامے پر ہمارے پیارے ہم وطنوں نے حرف بہ حرف عمل کیا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کی کوئی مثال ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئی۔ ناظم آباد کی سڑک پر جو پتھّر پڑے تھے اب بھی پڑے ہیں، بلکہ اور پڑ رہے ہیں۔ ہمارے گھر کے ساتھ جو کوڑے کا ڈھیر ہے، اب بھی وہیں ہے بلکہ برابر پھیل رہا ہے۔ یہ بات نہیں کہ کارپوریشن کے حکامِ صحت پڑھے لکھے نہیں یا جنگ اخبار نہیں پڑھتے، ضرور ان کو ہماری خاطر منظور ہے۔ ورنہ تو اس شہر میں یہ عالم ہے کہ اِدھر کوئی چیز رکھی اُدھر اس کا صفایا ہوا۔ پاپوش نگر کے قبرستان کے سامنے جو کنواں نما ہول ہے اس پر بھی ڈھکن نہیں لگا، کیونکہ ہم منع کر گئے تھے۔ ہاں ایک آدھ آدمی جو اس میں گِر کر مرنا تھا اور قبرستان کے قرب کا فائدہ اُٹھانا تھا، یہ بات نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کارپوریشن کے محکمۂ صحت و صفائی

کو الزام دینا درست نہ ہو گا۔ اس نہ مرنے والے کا انفرادی فعل ہے۔ رمضان شریف کے بارے میں بھی ہماری ہدایت کا کما حقہ اثر ہوا ہے۔ لوگ نیک مسلمان بن گئے ہیں اور شعائرِ اسلامی کا خیال رکھنے لگے ہیں۔ جو ہوٹل چوپٹ کھلا ہو اس کی طرف کوئی بھی رُخ نہیں کرتا۔ جمِّ غفیر صرف روزے کا احترام کرنے والے پردہ نشین ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ شراب خانے بھی بند ہیں۔ پرمٹ پر پینے والے بیمار اور مایوس العلاج لوگ گھروں میں بیٹھ کر پیتے ہیں۔ ہم صرف کراچی کی حد تک ذمّہ دار ہیں۔ دادو کے متعلّق اخبار میں کسی نے شکایت کی ہے کہ وہاں شراب خانے کھُلے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ رمضان میں بے ایمانی کرنا اور جھوٹ بولنا بھی ٹھیک نہیں۔ رمضان شریف میں بد معاشی کرنا بھی ناجائز ہے۔ نائٹ کلبوں میں عریاں ناچ گانا بھی رمضان کے مبارک مہینے میں نہ ہونا چاہیے۔ حاشا و کلّا ہم ان میں سے کسی چیز کے خلاف نہیں۔ فقط یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ چیزیں رمضان شریف میں نہ ہونی چاہئیں۔ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے۔ اہلِ دین و دانش کی طرف سے اس ایک مہینے کے تقدّس پر اتنا زور دیا جاتا ہے اور رمضان میں بُرائیوں سے بچنے کی اس طور پر تلقین کی جاتی ہے کہ لا محالہ خیال ہوتا ہے باقی گیارہ مہینے میں کُچھ کر لیا جائے تو چنداں ہرج کی بات نہیں، سال بھر میں ایک مہینہ نیک ہونے کے لئے کافی

ہے۔ خضوع و خشوع سے جتنا قرآن پڑھنا ہے وہ بھی اسی مہینہ میں پڑھ لو۔ پھر اگلے رمضان تک چھُٹّی۔ واقعی لوگوں نے اپنے کو اسلام کے ڈھانچے میں ڈھالنے کے بجائے کہ اس میں ذرا محنت پڑتی ہے، اسلام کو اپنی زندگی کے ڈھانچے میں ڈھال لیا ہے۔ شاباش جیتے رہو۔

جاپان، ہانگ کانگ

جولائی ۱۹۷۲ء

وطن کی آگ، پر دیس کی بر کھا

ہم نے جب ملک سے باہر قدم نکالا تو یہ کہاں گمان کیا تھا کہ واپس آئیں گے تو اپنے شہر کو جس سے ہمیں بمنزلہ عشق لگاؤ ہے، یوں لہولہان پائیں گے۔ وہ شہر جس کے لئے ہم نے کبھی لکھا تھا:

مری حیرتوں کا روما

مری حسرتوں کی دِلّی

مری وحشتوں کا صحرا

مرا بلدۂ کراچی

مُجھے اور کون جانے

یہی دے تو دے گواہی

کہ حسین صورتوں سے

یہاں ہر گلی بھری تھی۔۔۔وغیرہ

جس روز ہمارے صدرِ محترم ہندوستان کی وزیر اعظم کے ساتھ قراردادِ شملہ پر دستخط کر رہے تھے، ہمارے قدم بھی نئی دہلی کی سرزمین پر تھے۔ شہر میں نہ سہی، نئی دہلی کا ہوائی میدان اور ٹرانزٹ لاؤنج (یعنی آگے چلیں گے دم لے کر) بہر حال بھارت کی سرزمین ہی کا حصّہ ہے۔

اے آبِ رودِ گنگا وہ دِن ہیں یاد تُجھ کو

اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

ہمارے شاعر کا یہ شعر پُرانے اور بھلے وقتوں کا ہے۔ اقبال نے اس کارواں کو یہاں اُترتے تو دیکھا تھا، یہاں سے کوچ کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ٹوکیو میں ہم پہلی صُبح سو کر اٹھے۔ حالانکہ اس کے سات بجے کا مطلب یہاں تین شب تھا، تو اخبار میں شملے کی بیل منڈھے چڑھنے کی نوید تھی۔ جس کانفرنس میں ہم تھے اس میں ایشیا کے چودہ ملک اور تھے۔ سب نے خوشی کی قرارداد پاس کی اور اس میں ہمیں اور ہندوستان کے نمائندوں کو مبارکباد دی۔ اس سے اگلے روز کا اخبار کوریا کے دونوں حصّوں میں یکجائی کے امکان کی خبر لایا۔ اب سب نے کوریا کے نمائندے مسٹر ہان کو بدھائی دی۔ اس سے اگلا روز جاپان کے لئے خوشی کا دِن تھا کہ مسٹر تناکا نئے وزیر اعظم ہو گئے جن کی آزاد خیالی سے چین کے ساتھ تعلقات استوار ہوتے نظر آئے۔ ہر روز کی تازہ نوید سے ہم نے یہ خیال کیا کہ یہ ہمارے ملک سے باہر ہونے کی برکت ہے۔ ہم اپنی حکومت کو لکھنے والے تھے کہ ہمیں ملک سے باہر ہی رکھے تو اچھا ہے۔ اس میں ملک و قوم بلکہ ساری دنیا کا بھلا ہے۔ لیکن اگلا سنیچر جو آیا تو کراچی کے ہنگاموں کی خبر لایا۔ ٹوکیو میں انگریزی کے تین صُبح گاہی اخبار ہیں۔ جاپان ٹائمز، ڈیلی منی اچی اور ڈیلی یومیوری، جسے ہم جمہوری کے نام سے یاد رکھتے ہیں۔ پاکستان کا ریڈیو تو یہاں سُنائی نہیں دیتا تھا۔ FEN البتّہ۔ ہم انہی

اخباروں کے صفحوں میں تازہ خبر تلاش کرتے تھے۔ کسی روز تو ایک سطر بھی نہ ہوتی تھی۔ کسی روز دو روز پہلے کی باتی بولتے تھے۔ FEN کا مطلب فار ایسٹ Network ہے۔ یہ ریڈیو پروگرام مشرقِ بعید کے علاقوں میں دادِ شجاعت دینے والے امریکی فوجیوں کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے لئے امریکی صدارت کے نئے اُمّیدوار کی نامزدگی کا ہنگامہ بڑا ہنگامہ تھا۔ اسی ذکر میں اس کا خبروں کا وقت تمام ہو جاتا تھا۔ غرضیکہ خبروں کی از حد پیاس تھی۔ اضطراب تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کا ذریعۂ معلومات بھی مطبوعہ اخبار ہی تھے۔ آخری روز جاپان ٹائمز نے لکھا کہ ۵۳ آدمی ہنگاموں کی نذر ہو چکے اور کراچی سے آگ دوسرے شہروں تک پہنچ گئی۔ یہ سطور بھی ہم وطن سے کئی ہزار کوس دور ہانگ کانگ میں لکھ رہے ہیں۔ دیکھیے ہمارے پہنچنے تک کیا ہوتا ہے۔ اور ہم آج یہاں سے چل بھی پاتے ہیں کہ نہیں۔۔۔ کیونکہ ویڈیو ہانگ کانگ دمادم آج شام اسی قسم کے بحری طوفان کی آمد آمد کی خبر دے رہا ہے جس نے پچھلے دِنوں اس بستی میں قیامتِ صغریٰ برپا کی تھی۔ خطرے کا سگنل نمبر ۴ ہو چکا ہے۔ ہمیں میکاؤ جانا تھا جو پچاس کوس دور ایک پرتگالی مقبوضہ ہے، لیکن وہاں کے لئے سمندری آمد و رفت منقطع ہو گئی۔ بلکہ کولون اور جزیرہ ہانگ کانگ کے درمیان فیری بھی کم کم آجا رہی ہے۔ کسی بھی لمحے بند ہو سکتی

ہے۔ ایک حشر کراچی میں برپا ہے، ایک ہمارے سینے میں اور ایک سمندر کی پنہائی پر دندنارہا ہے۔ آتے آتے زاویہ بدل لے اور کنّی کاٹ لے تو اچھا ہے، ورنہ پھر ہم ہیں اور ہانگ کانگ ہے۔
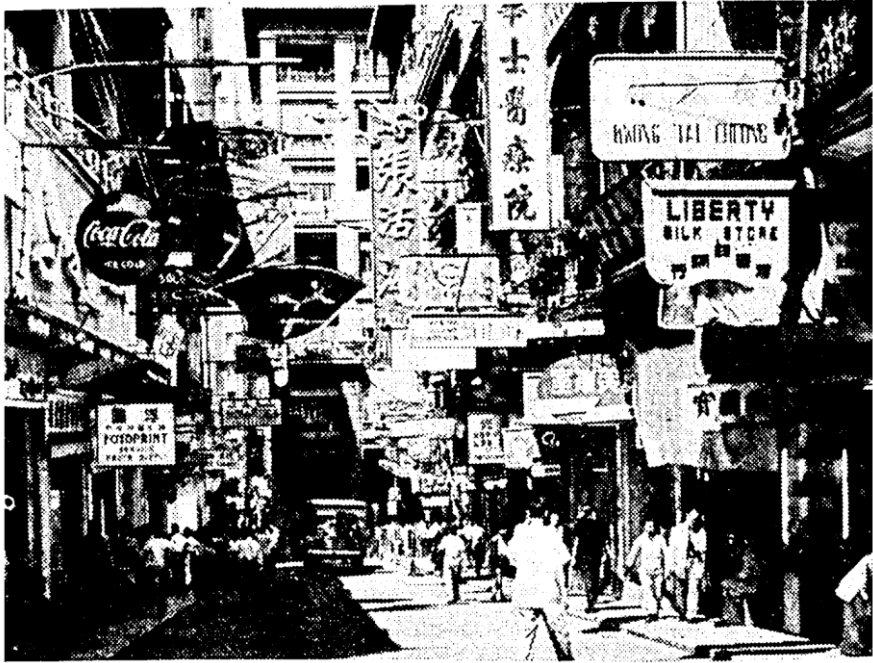
ہانگ کانگ کو ہم بہت دیکھ چکے اور اس کے متعلّق بہت کچھ لکھ چکے۔ اس وقت ہانگ کانگ کی باتوں کا کسے دماغ ہے۔ باہر بازار میں گرمی اور حبس کا دور دورہ ہے۔ کل شام ہمارا جی گھبرایا تو نکلے اور فیری میں سوار ہو کر ہانگ کانگ پہنچ گئے۔ جنہوں نے

یہ دیار نہیں دیکھا، وہ اس کا جغرافیہ سمجھ لیں۔ اس کے دو حصّے ہیں، ایک کولون، جو سرزمینِ چین کی انتہائی جنوبی نوک ہے۔ آپ اسے کیماڑی کہہ لیجیے۔ دوسرا ہانگ کانگ، جو جزیرہ ہے۔ آپ منوڑہ پر قیاس کر لیجیے لیکن اس کی خوبصورتی اور رونق کے کیا کہنے۔ ہوائی اڈّہ کولون والے حصّے ہی میں ہے۔ جس کو ہانگ کانگ جانا ہو، وہاں ٹھہرنا ہو (ہم پچھلی بار وہیں ٹھہرے تھے) وہ اترے اور فیری یعنی بیڑی میں سوار ہو کر اس پار جائے۔ کاروں کے لئے ایک بیڑی الگ چلتی ہے۔ یہ انتظام ہمیشہ سے چلا آرہا ہے لیکن اب ان دونوں حصّوں کو ملانے کے لئے سمندر کے نیچے سُرنگ بنا دی گئی ہے۔ زرِ کثیر کے خرچ سے مکمّل تو ہو گئی ہے لیکن اس کا افتتاح ہونا باقی ہے۔ آج کل آج کل ہو رہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ہمارے یہاں سے جانے کا انتظار ہے۔۔۔ اچھا صاحبو! ہم یہاں سے چلے ہی جائیں گے۔۔۔ ہم کون سا یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارا دِل بھی تو کراچی میں اٹکا ہے۔ ویسے تم کہتے تو ہم اس کا افتتاح کر دیتے۔ کسی اور کو بلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

سب سے پہلی گاڑی جو سرکاری طور پر اس سُرنگ میں سے گزرے گی وہ ۱۸۹۹ء کی بنی ہوئی ایک فئیٹ کار ہے۔ یہ خاص اسی مقصد کے لئے اٹلی سے یہاں منگائی گئی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان الپس کے نیچے جو سُرنگ بنی ہے،

اس کا افتتاح بھی اسی نیک بخت نے کیا تھا۔ سُرنگ بننے سے آسانی تو بہت ہو جائے گی۔۔۔ لیکن بیڑی کے سفر کا سا لطف اس میں کہاں ہے۔ کراچی کے ہنگامے اور فساد کی خبر یہاں کے بڑے اخبار ساؤتھ چائنا مارننگ پوسٹ میں آخری صفحے پر ہے۔ اور وہ یہ کہ کرفیو کے باوجود لِسانی فساد کے پانچویں روز بھی کراچی کی اجڑی بجڑی سڑکوں اور گلیوں میں مشین گن کی تڑاتڑ سُنائی دیتی رہی۔ البتّہ پہلے صفحہ پر ایک خبر میں پاکستان کا نام زیادہ نمایاں طور پر آیا ہے۔ چار کالمی سُرخی میں تصویر بھی ہے، جس میں ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی ماچس دِکھائی گئی ہے۔ ہم یہی سمجھے کہ آتش زنی کی وارداتوں کی طرف اشارہ ہے۔ سرخی بھی کچھ ذو معنی تھی۔ Pakistan Snaps Match Sticks پڑھنے پر معلوم ہوا کہ ذِکر فقط ماچس کا ہے۔ ماچس کی کارستانیوں اور تباہ کاریوں کا نہیں۔ خلاصہ خبر کا یہ کہ ہانگ کانگ کی ماچس فیکٹریوں کو پاکستان کے تاجروں نے دیاسلائیوں کے اتنے آرڈر بھیجے ہیں کہ یہ فیکٹریاں اوور ٹائم لگا کر بھی اسے پورا نہیں کر پاتیں۔ جو کچھ بناتی ہیں پاکستان بھجوا رہی ہیں۔۔۔ حتّٰی کہ ہانگ کانگ میں ماچس کا کال پڑتا جا رہا ہے۔ یہاں ہر دُکان پر گاہک کو ماچس مُفت پیش کی جاتی ہے۔ اب دُکانوں اور ہوٹلوں والے آپ کا سگریٹ سلگا کر باقی ماچس اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔ اگلے بارہ ماہ کے لئے آرڈر بُک ہیں، یعنی سارا سامان آتش زنی کا

پاکستان ہی بھیجا جائے گا۔۔۔ خدا رحم کرے۔۔۔ اور یہ بایں ہمہ ہے کہ پاکستان میں آج کل ہانگ کانگ کے علاوہ بھی ہر ملک کی ماچس چل رہی ہے۔ ہر نئی دکان پر نیا برانڈ، اور اس پر کسی نئے ملک کا ٹھپّہ۔ حالانکہ اس وقت ہمیں ضرورت آگ کی نہیں، پانی کی ہے۔ اس بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے۔ اب ہم قلم ہاتھ سے رکھتے ہیں۔۔۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ فضا تو کل ہی سے دھواں دھواں ہے۔۔۔ دیکھیے کتنا برستا ہے۔ سودا کا شہر آشوب یاد آرہا ہے۔

یہ جی میں آتی ہے یوں روئیے کہ مردم شہر

گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

ضرورت ہے ایک گدھے کی

ہمارے پرانے اور عزیز دوست ابوالخیر کشفی بھی آج کل جاپان میں ہیں۔ لیکن ٹوکیو میں نہیں۔۔۔ اوساکا میں۔ ان کی فرمائش ہے کہ اوساکا آؤ اور یہاں سے کیوٹو اور نارا چلیں کہ اصل جاپان کے تہذیبی وارث یہی شہر ہیں۔ اوساکا ہم اپنے ائیر ٹکٹ پر بھی جاسکتے ہیں، لیکن ان کی ہدایت ہے کہ "ہکاری" میں آؤ۔۔۔ جاپان کی یہ مشہور گاڑی گولی کی رفتار سے چلتی ہے۔ اس کو بلٹ ٹرین بھی کہتے ہیں۔ ایک تو ہمارا جی آرام کی طرف مائل ہے، پھر ایک پہاڑی مقام "ہاکونے" ہمارے پروگرام میں

پہلے سے شامل ہے، اور پھر یک طرفہ سفر بھی ہمارے حساب سے سوا سو روپے کا ہوتا ہے جو پردیس میں ہمارے لئے زیادہ ہے۔ اور پھر کراچی کی بھی فکر ہے۔ لہٰذا کشفی صاحب کو فون کر دیا کہ یارِ عزیز تم خود ہی پہنچو۔ ہم کراچی سے ٹوکیو آ گئے ہیں تو کیا تم اوساکا سے یہاں تک نہیں آ سکتے۔

جاپانیوں کے پاس صنعت و تجارت کے طفیل اتنے پیسے جمع ہو گئے ہیں۔۔۔ڈالر پاؤنڈ وغیرہ بھی کہ حکومت خود لوگوں کو شوق دِلاتی ہے کہ بھائیو۔ ملک سے باہر جاؤ۔۔۔ اور پیسے خرچ کرو۔ ہر جاپانی کو آمد و رفت کے خرچ کے علاوہ تین ہزار ڈالر فی کس خرچ کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اہلِ پاکستان سے ہمیں کہنا ہے کہ کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا۔۔۔ ذرا کاغان وغیرہ کی تشہیر یہاں ہو جائے تو ملک کو بھی فائدہ پہنچے اور پی آئی اے کو بھی۔۔۔ پرسوں پرلے روز سیاحت کے محکمے کے ایک پاکستانی حاکم یہاں تشریف لائے تھے۔ وقت ان کے پاس کم ہی تھا۔ رات کے نو بجے آئے اور صُبح نو بجے تشریف لے گئے۔۔۔ کوئی اس سے زیادہ ضروری کام ہو گا۔ سفارت خانے والوں نے یہاں کے وزیر سیاحت یا نائب وزیر سیاحت سے ان کو ملایا۔۔۔ پاکستان اور جاپان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بات ہوئی۔ جاپانی وزیر نے کہا کہ اگر پاکستان کو جاپان سے روشناس کرانا ہے تو ایک گدھا یہاں بھیج

دیجیے۔ حاضرین نے بات کو ہنس کر ٹالنا چاہا۔ لیکن موصوف اسی پر مُصِر تھے کہ ہاتھی نہیں مانگتے، گھوڑا نہیں مانگتے، ہم کو تو گدھا چاہیے۔

اے صاحبو! پاک وطن کے رہنے والو! دیکھو دوسرے ملکوں میں گدھے کی کتنی مانگ ہے۔ کتنی عزّت ہے۔ امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کا تو نشان ہی گدھا ہے۔ اِدھر ہم ہیں کہ اپنے ملک میں گدھوں کی کماحقہ قدر نہیں کرتے۔ بعض لوگ تو گدھوں کو، جو ہمارے ہاں ہر شعبہ زندگی میں بھرے ہیں، تحقیر سے بھی دیکھتے ہیں۔ اور اکثر تو گدھے گھوڑے کی تمیز بھی اُٹھا دیتے ہیں۔ دونوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنے لگتے ہیں۔ حالانکہ گھوڑا صرف وکٹوریا کھینچنے اور ریس میں دوڑنے کے کام آتا ہے۔ سو وکٹوریہ ختم ہو رہی ہے۔ اور ریس کو ہم خود ختم کرنا چاہتے ہیں۔ گدھا اس کے مقابلے میں مجمعِ صفّات ہے۔ معصوم۔۔۔ نیک دل۔۔۔ بردبار۔۔۔ لڈّو۔۔۔ جن صاحب نے ہمیں یہ گفتگو سُنائی ان سے ہم نے کہا کہ گدھوں کو تو ہم باہر بھیجتے رہتے ہی ہیں۔ بلکہ ہمارے ملک سے باہر جانے والوں میں اکثر گدھے ہی ہوتے ہیں۔ ان صاحب نے کہا۔ جاپانی وزیر کی مراد واقعی چار ٹانگوں والے سچ مچ کے گدھے سے تھی۔ جاپان میں گدھے نہیں ہوتے۔ یہ گدھا چڑیا گھر میں رکھا جائے گا۔ جاپانی بچّے اسے ذوق و شوق سے دیکھیں گے اور پوچھیں گے کہ یہ کہاں پایا جاتا ہے؟ جواب ملے گا پاکستان

میں۔۔۔ اور یوں وہ پاکستان سے روشناس ہو جائیں گے اور یاد رکھیں گے کہ پاکستان بھی ایک ملک ہے۔۔۔ وہ ملک جس میں گدھے پائے جاتے ہیں۔۔۔ اور افراط سے پائے جاتے ہیں۔

کہا جاپان کو جائیں، کہا جاپان کو جاؤ

آرے سے گئے نوحؔ تو نارے آئے

نارے سے گئے نوحؔ تو آرے آئے

یہ شعر اُردُو کے طوفان بدوش شاعر نوحؔ ناروی مرحوم کا ہے۔ اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی۔۔۔ نارےؔ کے رہنے والے تھے اور آرےؔ میں ان کی سسرال تھی۔ اس آمد و رفت میں ان کی زندگی تمام ہو گئی۔ ٹوکیو میں ہمارا بھی یہی حال تھا۔

ہمارا انارہ ہمارا ہوٹل گرینڈ پیلس تھا جو بالکل نیا نِکور ۲۳ منزل کا ہے، اور ہمارا آرہ، کیدن رن کائیکان بلڈنگ کوئی دو میل دور جس میں ہماری میٹنگ ہوتی تھی۔ نہ اس بلڈنگ کا نام ہمیں کبھی یاد ہوا (اس وقت ڈائری دیکھ کر لکھ رہے ہیں) اور نہ اس کا راستہ۔ کیونکہ ایک بس علی الصُبح آتی تھی۔ دو لڑکیاں اس میں سے نکل کر اپنی طوطا پری وردی میں ہم کو ڈنڈوت کرتی تھیں اور ہم سوار ہو کر منزل پر پہنچ جاتے تھے۔ اوّل تو راستے بھولنا اور بھٹکنا ہمارے لئے طرزِ زندگی بن چکا ہے، پھر یہاں پیدل چلنے کا موقع نہ ملا جس سے راستہ ذہن نشین ہو۔ علامت ۹۹ فیصد صورتوں میں فقط جاپانی زبان میں ہوتی ہیں۔ زیرِ زمین ریلوے میں بے شک انگریزی بھی بکفایت استعمال ہوتی ہے۔ سو وہاں ہم تنہا نہ گئے۔ ہمارے دوست سیّد محمود شاہ ساتھ تھے۔ راستہ دریافت کرنا ان کی ذمّہ داری تھی۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے بکھیڑے بھی ہم سے نہیں ہوتے۔ یہ ٹوکیو ہے۔ لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر بھی ہم بھٹکتے ہیں۔ کسی بغلی سڑک سے اس سڑک پر نکل آئیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماربل آرچ کس طرف کو ہے۔ اور ٹوٹنہم کورٹ روڈ کدھر۔۔۔ پہلے ہم نے ماربل آرچ کی طرف ایک اونچی بلڈنگ کی نشانی رکھی تھی، پھر انگریزوں نے ویسی ہی ایک بلڈنگ دوسری طرف بنا دی۔ پھر ہم سلفر تج کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کی نشانی رکھنے لگے

کیونکہ اس پر بہت سے ملکوں کے جھنڈے لگے رہتے ہیں۔ ستم ظریفوں نے دو فرلانگ دور ایک اور بلڈنگ پر ویسے ہی جھنڈے کھڑے کر دیئے۔ آکسفورڈ سرکس کا اسٹیشن ایسا ہے کہ اس کے چاروں طرف بھی آکسفورڈ سرکس ہی آکسفورڈ سرکس ہے۔ بارہا یہ ہوا کہ ہم کسی مقام کی تلاش میں آدھ میل دور چلے گئے۔۔۔ پھر خیال آیا کہ غَلَط سِمت میں آ گئے۔۔۔ اب آکسفورڈ سرکس کے دوسری طرف آدھا میل گئے تو اندازہ ہوا کہ غَلَطی اب بھی ہوئی ہے۔ پہلے ہم صحیح جارہے تھے۔۔۔ ہمارے بہت سے کام اسی میں رہ گئے۔

ٹوکیو میں یہ ہمارا تیسرا پھیرا تھا۔ لیکن ہم آرے اور نارے کے چکر میں گرفتار رہے۔ ایک روز ہندوستانی پاکستانی کھانے کی تلاش میں گنزہ نکل گئے۔ وہاں سب سڑکیں اور سب عمارتیں ایک ہی ہیں۔ ہر چند کہ بدرقہ ساتھ تھا، اتنا بھٹکے اتنا بھٹکے کہ بے حال ہو گئے۔ نائر ہوٹل جس کا راستہ ہمارے خیال میں ہمیں آتا تھا، نہ ملنا تھا نہ ملا۔ پی آئی اے سیلز آفس میں گئے۔ وہاں ایک جاپانی بیٹھا ایک افغانی کا ٹکٹ بنارہا تھا۔ وہ بھی ہماری مدد نہ کر سکے۔ آخر اشوکا ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر اندر چلے گئے اور وہیں بھوجن کیا۔۔۔ ہم سے کراچی سے ٹوکیو جانے کو کہیے تو ہم بہ دِل و جان تیّار ہیں۔ لیکن اپنے ہوٹل سے اُٹھ کر گنزہ یا کہیں اور جانے کو ہم سے نہ کہیے۔ ہمارے

ہوٹل کے کمرے میں ٹیلی ویژن بھی ہے اور رنگین ٹیلی ویژن۔ جب ذرا گردن اُٹھائی دیکھ لیا۔ لیکن جاپانی ہے۔ بعض اوقات ہم آواز کی گھنڈی بند کر دیتے ہیں اور فقط تصویر دیکھتے ہیں۔ ہمیں زیادہ تر رغبت کارٹونوں سے ہے اور وہ علی الصُبح شروع ہو جاتے ہیں۔ اسکرین کے ایک کونے میں وقت بھی آتا رہتا ہے کہ اس وقت اتنے بج کر اتنے منٹ ہو گئے، تاکہ لوگ دفتر یا کام پر جانے سے غافل نہ رہیں۔ ریڈیو بھی ہے لیکن اس میں فقط FEN یعنی فار ایسٹ نیٹ ورک کی گھنڈی ہمارے کام کی ہے۔ ہوٹل کی چوٹی پر ایک پُر تکلّف ریستوران ہے۔ یہاں سے سارا شہر پھیلا ہوا دیکھئے۔ لیکن یہ ٹوکیو کا سب سے اُونچا ہوٹل نہیں ہے۔ سب سے اُونچے ہوٹل کا نام کیو پلازا ہے۔ اس کی ۵۳ منزلیں ہیں۔ ہوٹل کیا بناتے ہیں آسمان میں تھگلی لگاتے ہیں۔
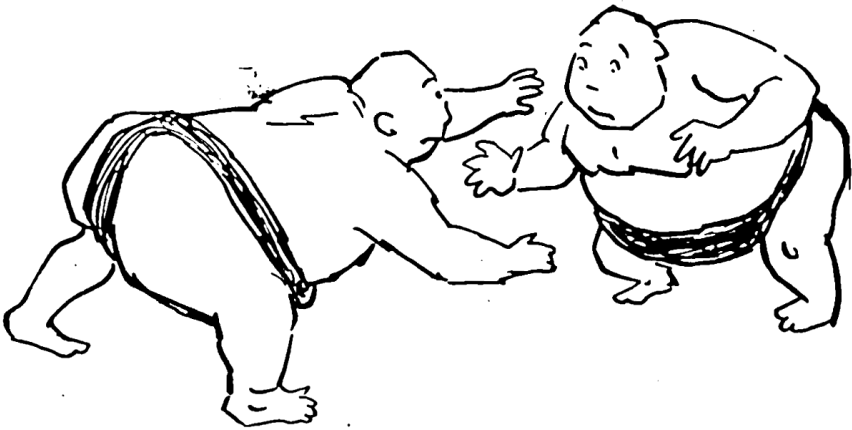
جاپانی پہلوانوں کی کشتی ہم نے ویسے تو نہیں دیکھی۔ ٹیلی ویژن پر دیکھی ہے۔ جو رائے کسی باہر والے کی ہمارے پکّے گانے کے باب میں ہو سکتی ہے، وہی ہماری اس کشتی کے بارے میں ہے۔ معیار ہمارے ہاں صحت و تنوم ندی کا یہ ہے کہ چھاتی نکلی رہے اور کمر دبی رہے۔ چنانچہ چیتے کی کمر کو رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جاپانی پہلوان اپنا پورا بدن نکالتا ہے، خصوصاً پیٹ، جب تک وہ نیل کے ماٹ کی طرح لٹک کر تھل تھل نہ کرے پہلوان کو کشتی کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ آدمی کیا ہوتا ہے۔ گوشت اور چربی کا پہاڑ ہوتا ہے۔ پہلے مینڈک کی طرح ہاتھ ٹیک کر پیٹھ اٹھا کر ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔ پھر نمک اٹھا کر چھڑکتے ہیں، کُچھ اپنے لنگوٹ پر ملتے ہیں۔ پھر دونوں حریف ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں یا نہ جانے کیا کرتے ہیں۔

اس کے لئے پہلوان کو بہت کھانا پڑتا ہے۔ بے تحاشا کھانا، لیٹنا اور ڈکارنا پڑتا ہے۔ ایسے کام کی ممانعت ہے جس میں چربی کے ذرا سا ڈھلنے کا بھی خطرہ ہو۔ اس کشتی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذوق چاہیے، اور وہ دو چار میں نہیں، دو چار نسل ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔

ایسا ہی ذوق جاپان کے روایتی تھیٹر "کابوکی" کو پسند کرنے کے لئے بھی مطلوب ہے۔ ہم نے ایک بار دیکھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہے، بلکہ تاب بھی نہیں

کابو کی تھیٹر

ہے۔ اس میں ایک سی کہانی ہوتی ہے اور ایک سی نفیری بجتی ہے اور ایک سی حرکات ہوتی ہیں، اور ایک سی سکنات ہوتی ہیں۔ حرکات والا شخص ہیرو ہوتا ہے، جو فریاد نما تقریر کرتا رہتا ہے اور سکنات کے لئے دو بیبیاں پس منظر میں بٹھا دی جاتی ہیں جو برابر گھٹنوں کے بل بیٹھی رہتی ہیں۔ ایک آدھ عورت جوڑا بنائے ہاتھ میں

خنجر یا قرولی لیے ہیرو کے آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ ہر کہانی میں ایک کٹا ہوا سر ضرور شامل ہوتا ہے اس لیے کٹا ہوا سر رکھنے کا ڈبّہ ساز و سامان کا لازمی جزو ہے۔ نہایت اُسپرو افزا کھیل ہے۔ ویسے تو ہمارا تمام کلاسیکل چیزوں کے متعلّق ایسا ہی خیال ہے۔

ہم تو گیشا گھر کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کرتے۔ ہم جب بھی جاپان گئے کوئی نہ کوئی مہربان ہمیں گیشا گھر لے گیا۔ ہم اپنی ذات سے نیک آدمی ہیں لیکن وضع دار اور مروّت والے بھی ہیں۔ کوئی کہیں جانے کو کہے تو ہم سے انکار نہیں ہو گا۔ اب کے جس گیشا گھر میں ہمارے ایک میزبان نے ہماری دعوت کی، وہاں کی پیشتر گیشائیں

سال خوردہ بلکہ عمرِ طبعی کو پہنچی ہوئی تھیں۔ طنبورہ سنبھال کر وہ زار نالی اُنھوں نے کی کہ بس۔۔۔۔۔۔

خودکشی، اُن کی اور ہماری

ٹوکیو میں ہوٹل والے ہر روز ایک ماچس اور ایک چھپے ہوئے کپڑے کا کوئی جامہ ہمارے کمرے میں رکھ دیتے تھے۔ ایک روز کھول کے دیکھا تو وہ کیمونو تھا۔ ڈریسنگ گون نما چیز۔ شاید اس کو نائٹ سوٹ کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔ ایک آدھ بار ہم نے پہن کر دیکھا، ڈھیلا ڈھالا تھا۔ ہمیں تو خوش نہ آیا۔ اس پر ٹھپّے سے جگہ جگہ گرینڈ پیلس ہوٹل بھی لکھا تھا، ورنہ ہم بھُول چُوک سے اُسے اپنے کپڑوں میں رکھ کے لے آتے اور آپ صاحبان کو دکھاتے۔ اسے آپ چوری کا نام نہیں دے

سکتے۔ نماز ہمارا فرض ہو تو ہو، چوری ہمارا پیشہ نہیں ہے۔ تحفہ لانا الگ چیز ہے، جیسے ہم ماچسیں جمع کر کے لے ہی آتے ہیں۔ ایک چپل بھی ہمارے کمرے میں دھری رہتی تھی۔ اس پر بھی ظالموں نے گرینڈ پیلس ہوٹل نقش کر رکھا ہے ورنہ تُحفے کے لیے بُری نہیں تھی۔ ہم بد نیتی سے تو نہ لاتے، لیکن ہمارے جوتوں کے ساتھ غَلَطی سے تو آسکتی تھی۔ ہمیں یہاں آکر پتہ چلتا کہ ہم لے آئے ہیں۔ بھلا اتنی سے چیز پر ہوٹل کا ٹھپّہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ٹوکیو سے باہر "ہاکونے" بھی گئے کہ ایک ٹھنڈا پہاڑی صحت افزا مقام ہے۔ راستے میں ایک آدھ جگہ ٹھیکی لی، کوکا کولا وغیرہ پیا اور بھُٹّہ خرید کے کھایا۔ مہنگا نہیں تھا۔ ایک بھُٹّہ ہمارے حساب سے چار روپے کا پڑا۔۔۔ اُبلا ہوا۔۔۔ نمک سمیت۔ یہاں ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا وہ بہت بڑا، ہزار کمرے سے زیادہ کا دُور دُور تک پھیلا ہوا، ہوٹل تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور اطراف میں جنگل ہی جنگل تھا۔ وہ دِن ہفتے کا تھا۔ اس لیے رش بہت تھا، بے شمار جاپانی جوڑے چھُٹّی منانے پہنچے ہوئے تھے۔ ہماری مغربی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے پلنگ ماڈرن ڈالے گئے تھے۔ لیکن ایک کونے میں چبوترا بھی تھا جس پر چٹائیاں بچھی تھیں اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے لیے گدّے تھے۔ بیچ میں چوکی اور چوکی پر چائے کا پورا سامان۔۔۔ کیمونو پہن کر بیٹھیے اور چُسکی لگائیے۔

کمرے میں پارٹیشن سا کر کے دو پلنگ اِدھر دو اُدھر ڈالے گئے تھے۔ اِدھر ہم اور ہمارے ایک دوست، دوسری طرف لاؤس کے دو مندوب۔ ڈنر اکٹھا تھا۔۔۔ اور یہ ہدایت تھی کہ پہلے آپ لوگ نیچے جا کر تالاب میں ڈُبکی لگائیے پھر کیمونو پہن کر ڈنر پر آئیے۔ اس پر پہلے ہم ہنسے پھر روئے۔ نہانے کو پہلے ہمارا جی چاہا پھر نہ چاہا۔ اس تالاب میں عورتیں اور مرد اکٹھے نہاتے ہیں اور کپڑوں کے تکلّف کے بغیر۔ ہم آدھا راستہ جا کر آ گئے کہ خواہ مخواہ ہمارا اخلاق خراب ہو گا۔ جاتے تو آپ کو ضرور بتاتے، آپ سے کیا پردہ؟

ہاکونے کے راستے میں مسٹر نوما کا پرانا مکان پڑتا ہے۔ مسٹر نوما کون ہیں؟ ان کے تعارف کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف اتنا جانیے کہ جاپان کے سب سے بڑے پبلشر ہیں۔ ہماری کئی برس سے یاد اللہ ہے۔ پاکستان بھی آ چکے ہیں۔ خود تو وہ ٹوکیو میں بیمار ہیں لیکن یہاں ہمارے خیر مقدم کا انتظام اُن کے داماد نے کیا تھا۔

یہ روایتی طرز کا دیہاتی مکان ہے۔ چٹائیاں ہی چٹائیاں، کھڑکیوں میں شیشوں کے بجائے کاغذ۔ نیچی نیچی چوکیاں۔ یہاں جاپانی انداز کی مٹھائیوں، چائے، اور پینے والوں کے لیے ساکی کا انتظام تھا۔ بہر حال اس مکان اور ہوٹل کو دیکھ کر جاپان کا کُچھ کُچھ نقشہ معلوم ہوا ورنہ مرکزی ٹوکیو کی عمارات تو ویسی ہی ہیں جیسی کسی بھی ماڈرن

نوما اور ابنِ انشا

شہر میں ہوتی ہیں۔ جدید، مستحکم اور فلک پیما۔ اے صاحبو! جاپان تو جدید ہے لیکن جاپانی اتنے جدید نہیں ہیں۔ ان کا طرزِ فکر وہی ہے کہ جو تھا۔ سلام و طعام اور

نشست و برخاست سب میں سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ چوغے پہنے پھرتے ہیں یا ساری عورتیں سر پر جوڑے بنائے کمر کے پیچھے گدی باندھے پنکھا کرتی نظر آتی ہیں۔ کام کاج کا سارا لباس مغربی ہے کہ آسانی اسی میں ہے۔ تاہم آپس میں سلام سر جھکا کر ہی کرتے ہیں، خواہ سڑک پر ٹریفک ہی چل رہا ہو اور لوگوں کا راستہ بھی رُکتا ہو۔ اس کے لیے فاصلے کا بھی التزام ہے (مصافحے کا دستور نہیں) اور یہ آداب بھی مقرّر ہیں کہ کس درجے کے آدمی کے آگے کتنا جھکنا چاہیے۔ تھوڑا جھکنا یا کمر کو دوہرا کرنا لازمی ہے۔ تحفے کا لین دین بھی ان کی طبعی عادات و رسوم میں ہے۔ جس کو تحفہ دیا جائے اُس کے لیے لازم ہے کہ اس سے دو پیسے زیادہ کا تحفہ لائے اور جوابی تحفے کی قیمت کچھ قدر زیادہ ہونی چاہیے۔ اگر دو فریقوں میں پے در پے تحفوں کا تبادلہ ہوتا ہے تو جان لیجیے کہ تھوڑے دِنوں میں یا تو دونوں دیوالیہ ہو جائیں گے، یا سمجھ دار ہوئے تو کوئی بات نکال کر ترکِ تعلّق کر لیں گے۔
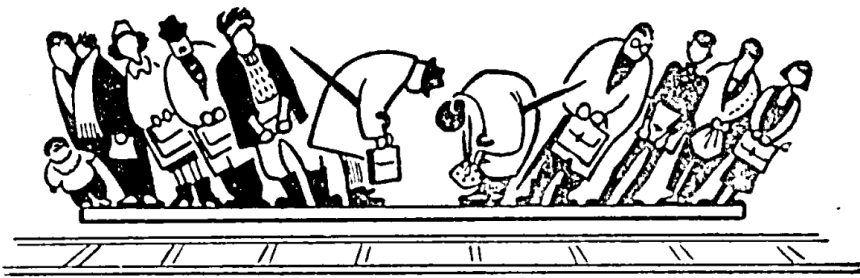
اور اے لوگو! آداب کے ذکر میں سنئیے کہ جاپان میں خود کشی تک کے آداب ہیں۔ ہارا کیری ایک رسم ہے۔ لوگ مجمع عام میں کرتے ہیں۔ دو مشہور مصنّفین نے جِن میں ایک نوبل انعام یافتہ بھی تھے اور جن سے اسٹاک ہوم میں ملاقات کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے، کھلے خزانے خود کُشی کی ہے۔ اس کے لئے قاعدے مقرر ہیں کہ خنجر پیٹ میں کس طرف گھونپا جائے، کتنا گھونپا جائے، اور گھونپتے وقت کپڑے کیسے ہونے چاہئیں اور نشست کیسی رہنی چاہیے۔ خود کُشی ایک پورا فلسفہ ہے، یہ نہیں کہ ریل کے نیچے سر دے دیا، زہر پھانک لیا یا چھت سے چھلانگ لگا دی، یا سمندر میں ڈوب گئے۔ ہر بات کا کوئی قاعدہ ہوتا ہے، قانون ہوتا ہے۔

اب ہم تھوڑی دیر کو جاپان سے پاکستان آتے ہیں، جو کمال جاپان والوں نے انفرادی خود کُشی میں پیدا کیا ہے، وہ ہم نے اجتماعی خود کُشی میں حاصل کیا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے سبھی شریک ہیں۔ وہ بھی جو ۹۳ ہزار سپاہیوں کو دُشمن کی قید میں جا پھنساتے ہیں، وہ بھی جو بسوں کو جلاتے ہیں۔۔۔ وہ بھی جو کارخانے بند کر کے اور ہڑتالیں کرا کے ملک کو اقتصادی طور پر مفلوج کرتے ہیں اور لوگوں کو بے روزگار کرتے ہیں۔۔۔ وہ بھی جو رینجرز پر پتھّر پھینکتے ہیں اور کرفیو لگواتے ہیں۔ ہم نے کل ایک جلی ہوئی بس اور پانی کی گاڑی کو دیکھا تو پوچھا کیا یہ گاڑیاں دُشمن کی ہیں؟ کیا یہ

ٹریفک کے کھمبے دُشمن کے ہیں؟ کیا یہ سڑکیں اور یہ کھسوٹے ہوئے پودے کسی دُشمن ملک کے ہیں؟ معلوم ہوا سب ہمارے اپنے ہیں۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں تو یہ جو کُچھ ہم کر رہے ہیں، جلاتے ہیں، نوچتے ہیں، کھسوٹتے ہیں، یہ سب خود کُشی کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں۔ پچھلی دسمبر میں ہم لوگوں نے اپنے مکانوں کو جو مٹّی تھوپی تھی وہ ابھی تک نہیں دُھلی، اور ان دھواں دھار دِنوں کی یاد دلاتی ہے جب کیماڑی سے اُٹھتا ہوا دھواں ہماری روح میں سرایت کر گیا تھا۔ اس وقت ہم اپنی کھڑکی میں سے بزنس روڈ سے اُٹھتا ہوا دھواں دیکھ رہے ہیں۔ وہ دُھواں دُشمن کی عنایت تھی، یہ دوستوں کی ہے۔ لیکن آگ دوست نے لگائی ہو یا دُشمن نے، ہر شے کو یکساں جلاتی ہے۔ پاکستان اس کی قدروں اس کے وسائل کو تباہ کرنے میں ایک سا حکم رکھتی ہے۔

کیسے اجڑی بستیوں کو آباد کرو گے

لوگو کل تم ہم لوگوں کو یاد کرو گے

جوتے کا مقام ہمارے معاشرے میں

آپ ضیا محیؔ الدّین شو دیکھتے ہیں؟ پچھلے دِنوں ضیا نے ایک شو میں دِکھایا کہ جاپانی لوگ کس تکلّف سے چائے بناتے، پیتے اور پلاتے ہیں۔ ایک جاپانی صاحبہ ہی سارا اہتمام کر رہی تھیں اور سامان بھی موقع کی مناسبت سے مہیّا کیا گیا تھا۔ چوکیاں، چٹائیاں، پیالیاں وغیرہ۔ ضیا صاحب بھی جوتا اُتارے موجود تھے اور گھٹنوں کے بل اِدھر سے اُدھر پھُدک رہے تھے۔ ان کے اس خوبی سے پھُدکنے پر کہ جاپانی بھی رشک کریں، پہلے ہمیں تعجّب ہوا، پھر نظریۂ ارتقا کا خیال آیا بلکہ اس پر ایمان آیا۔

آپ کسی گائے یا اونٹ یا ہاتھی کو کبھی اس خوبی سے پھُدکتا نہیں دیکھیں گے، اس لئے کہ ان کا رشتہ اس ذات شریف سے نہیں ملتا جسے انسان کا مورث اعلیٰ کہا جاتا ہے۔

ضیا کی بات تو بیچ میں یوں ہی آ گئی۔ ذکر جاپانیوں کے چائے نوش کرنے کا تھا۔ بلکہ چائے نوش کرنے کا بھی نہیں، تکلّفات کا۔ چائے تو ایرانی ہوٹل میں بھی مل جاتی ہے اور گھر میں بھی ہم نوش کر لیتے ہیں جس کے ڈانڈے کبھی کبھی شیرے اور کاڑھے سے جا ملتے ہیں۔ جاپانیوں نے چائے نوشی کو عبادت بنا دیا ہے۔ چائے کیا پیتے ہیں، آرتی اُتارتے ہیں۔ اگر اتنی ہی مشقّت کرنی ہے تو انسان چائے پینے کے بجائے سیدھا عبادت ہی کیوں نہ کرے۔ کم از کم ثواب تو ملے گا، عاقبت تو درست ہو گی! اور جس کی عاقبت درست ہے اس کے لئے چائے کیا چیز ہے، اس کو تو اور بھی بہت کچھ پینے کو مل جائے گا۔ جوتے یا ہم اتارتے ہیں یا پھر جاپانی اتارتے ہیں۔ یورپ کے معاشرے میں جوتے کو ہرگز وہ حیثیت حاصل نہیں جو ہمارے یہاں ہے۔ وہاں تو جوتا بس پہن لیا جاتا ہے۔ سردی سے یا سڑک کے روڑوں سے بچنے کے لئے۔ ہمارے یہاں پہنا جاتا ہے، گانٹھا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، کھایا جاتا ہے، چٹخایا جاتا ہے اور دال بانٹنے کے برتن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سگھڑ بیبیاں اپنے سرتاجوں

اور خداوندانِ مجازی کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔ یورپ میں جوتی کی نوک ہی نہیں ہوتی، لہٰذا اس سے یہ کام بھی نہیں لیا جا سکتا۔

ہم نے جو جاپان میں مسٹر نوما کے گھر پر جوتا اُتار کر کھڑاؤں پہنی اور کھٹ کھٹ چلنے لگے جبکہ ہمارے ایک مغربی دوست دو قدم چل کر گر گئے اور دوسرے کے پاؤں میں موچ آ گئی تو جاپانی میزبان بھی حیران ہو گئے اور کہنے لگے۔ بھئی یوں تو کھٹ کھٹ ہم بھی نہیں چل سکتے۔ ہمارے بزرگ اٹھارویں، انیسویں صدی میں سُنا ہے

اسی طرح چلا کرتے تھے۔ ہم نے کہا تم اپنے حساب سے یعنی مادّی ترقّی میں ہمیں اٹھارویں انیسویں بلکہ پندرہویں سولہویں صدی ہی میں سمجھو۔ تم لوگ اور سب باتوں میں ہمارا مقابلہ کر سکتے ہو اس میں نہیں۔ یہ تو کھڑاؤں ہے ہم ننگے پاؤں عمر گزار دیں۔ ایک لنگوٹی ہمارے لئے زندگی بھر کو کافی ہے، بلکہ اس کو پہنتے بھی ہیں، اس میں پھاگ بھی کھیلتے ہیں۔ تم ہمارا صوفیانہ کلام پڑھو۔ اُردُو شاعروں کی غزلیات پڑھو۔ اچھّا کھانے پینے کی، اچھّے مکان میں رہنے کی، کوئی کام کرنے کی یا ترقّی کرنے کی ہمارے ہاں سخت منادی ہے، کیونکہ یہ سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، آنی جانی ہیں، موہ مایا کی تعریف میں آتی ہیں۔ حتّٰی کہ محبّت تک میں وصل پر ہجر کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ اس سے دِل گداز ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں تو ان رشیوں اور جوگیوں اور فقیروں کو رشک و احترام سے دیکھا جاتا ہے جو راکھ مل کر اور الاؤ جلا کر تپسّیا کرتے ہیں، جوئیں اُٹھا اُٹھا کر اپنے بالوں میں ڈالتے ہیں، کانٹوں کے بستر پر سوتے ہیں، فاقہ کرتے ہیں، کشٹ بھوگتے ہیں۔ ہم نے مثالیں بھی دیں کہ ایک بابا سنگل والا تھے۔ وہ کئی من زنجیریں اپنے گلے میں ڈالے لاہور میں گھوما کرتے تھے۔ ایک جوگی تھے، انہوں نے اپنا ہاتھ عمر بھر سر سے بُلند کر کے کھڑا رکھا حتّٰی کہ جم گیا اور سوکھ گیا۔ ہم نے بتایا کہ کیلوں کے نکیلے بستر تو ہمارے یہاں عام ہیں۔ ہم خود کیلوں

کے بستر پر سوتے ہیں۔ بیرون ملک تھوڑا سا مبالغہ کرنے میں ہرج نہیں اور جاپانیوں کو ہم ٹرانسسٹر یا مشین بنا کر تھوڑا ہی مرعوب کر سکتے ہیں۔ اپنی روحانیت ہی سے چت کر سکتے ہیں۔

ہمارے گرد مجمع لگتا دیکھ کر ہمارے ہندوستانی دوست ادھر آ نکلے اور کہنے لگے تم ہندوستان کی روحانیت اپنے پاکستان کے حصّے میں ڈال رہے ہو۔ یہ بُری بات ہے۔ اس پر ہم نے ان کو تو معاہدہ شملہ یاد دِلایا اور حاضرین سے کہا۔ لیجیے اوم پرکاش جی آ گئے۔ بزرگ اِن کے اور ہمارے ایک ہی تھے۔ ہمارے بزرگ مسلمان ہو گئے اور کپڑے پہننے لگے اور کیلوں کے بستر کی جگہ کھری چارپائی پر سونے لگے۔ یہ کھڑاؤں اور لنگوٹی اور الاؤ اور بھبوت دیکھنے کا شوق ہو تو بھارت جاؤ۔ کاشی جاؤ، ہر دوار جاؤ۔۔۔ کیوں اوم پرکاش جی! اب تو آپ خوش ہیں نہ؟

کچھ ذکر اوم پرکاش جی کا ہو جائے۔ یہ ہندوستان کے نمائندے تھے۔ لمبے تڑنگے دلچسپ رنگین آدمی۔ دوسرے ہی دِن کہنے لگے۔ ”تم نے مالش کرائی؟“ ہم نے کہا ”کیسی مالش؟“ بولے۔ ”دیکھا نہیں، ہوٹل میں مالش کا انتظام ہے۔ کُچھ پیسے ضرور لگتے ہیں۔ میں نے فون کر دیا تھا۔ ایک صاحبہ رات کو بارہ بجے آئیں، مالش کر گئیں، تھکن دُور ہو گئی۔“ ہم نے کہا ”سر کی مالش کرائی ہو گی؟ یا شاید ٹانگوں کی؟“ ہنسے اور

کہنے لگے۔۔۔ ”میاں جی پورے جسم کی مالش ہوتی ہے۔“ ہم نے زیادہ تفصیلات میں جانا مناسب نہ خیال کیا اور کہا۔۔۔ ”ہمیں تو تھکن ہی نہیں ہوتی جو مالش کرائیں۔ کُچھ تھکن ہوتی بھی ہے تو گرم پانی کے ٹب میں لیٹنے سے دُور ہو جاتی ہے۔“

ذکر جوتے کا تھا۔ وہ بھی اس کے دوسرے افعال سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اُتارنے اور پہننے کا۔ ہمارے لئے تو اس میں کوئی نُدرت نہ تھی۔ انگریزوں اور امریکیوں کے لئے اچھّی خاصی مُصیبت ہے۔ یہ تسموں والے جوتے کہ اُتاریں تو پہن نہ سکیں اور پہنیں تو آسانی سے اُتار نہ سکیں، ہمارے یہاں مغرب ہی سے آئے ہیں۔ اتنا کھڑاگ ہمارے یہاں نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ ہمارے یہاں تو قدم قدم پر جوتا اُتارنا پڑتا ہے۔ کھانے پر بیٹھنے کے لئے، نماز کے لیے، کسی کو مارنے کے لیے۔ یہ لوگ جوتوں سمیت نماز ادا کرتے ہیں، جوتوں سمیت آپ کے گھر میں گھُس جاتے ہیں اور پھر شرافت سے نہیں نکلتے، نکالنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو اس نکالنے کے عمل میں بھی جوتا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے پاس ایک ہتھیار تو ہے ورنہ ایسٹ انڈیا کمپنی والے ابھی تک یہاں بیٹھے ہوتے۔

میاں اس جوتے میں بھی تھوڑی سے دال ڈال دو۔۔۔۔
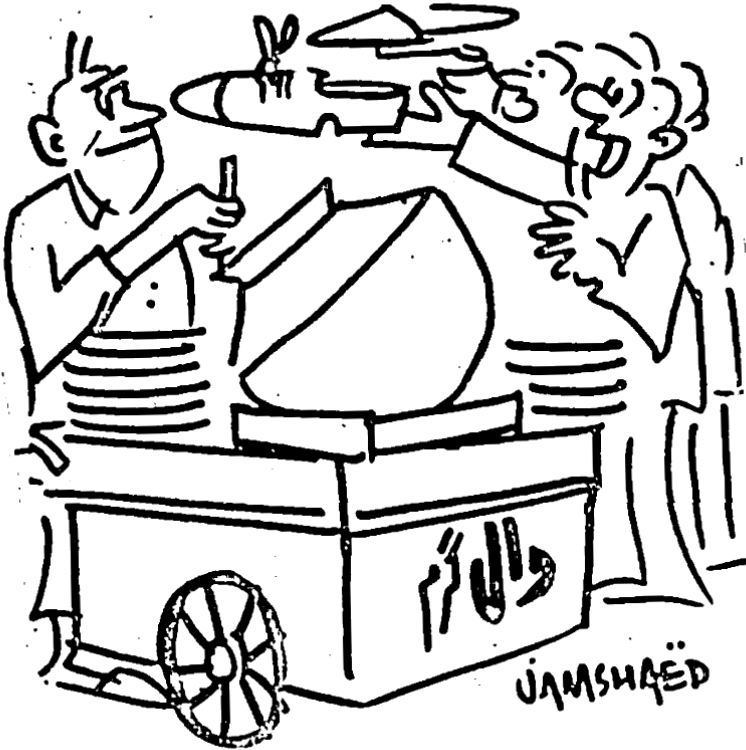
مالش ہم نے نہیں کرائی، اور مشترکہ تالاب میں جامۂ عُریانی پہن کر گنگا ہم نہیں نہائے۔ پینے کا خانہ ہمیشہ سے خالی ہے اور اس لحاظ سے صوبہ سرحد میں بھی ہنسی خوش رہ سکتے ہیں۔ پھر ہمارا گیشا گھر یا گیشا پارٹی میں جانے کا کیا مطلب؟ صاحبو! یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی انگریز آئے تو ہم اسے طرحی مشاعرے میں بُلا لیں اور وہ ہماری واہ

واہ پر حیران ہو۔ ہر ملکے و ہر رسمے۔ ہم نے جوتے اُتارے اور گیشاؤں نے ہمارا خیر مَقدم کیا۔ ایک کمرے میں جا اُترے اور چوکی کے سامنے بیٹھ آلتی پالتی مار کر کوکا کولا پینے لگے۔ یہاں کچھ چرندم خورندم ہوئی۔ معلوم نہیں کیا کیا تھا۔ اب دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں مزید چرندم خورندم ہوئی۔ لیکن اب کے اس ساتھ کچھ سوز خوانی بھی ہوئی۔ ہمیں تو گیشاؤں کا گانا ہمیشہ سوز خوانی ہی معلوم ہوا۔ جانے سُبکیاں لے لے کر کیا کیا گاتی ہیں۔ پھر تیسرے کمرے میں گئے، یہاں طرح طرح کی سبزیاں اور مچھلیاں ہمیں تل تل کر کھلائی گئیں اور واقعی مزے کی تھیں۔ یہاں ہم پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے جس طرح لوگ قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہیں۔ یہ نامبارک محاورہ تو ناحق بیچ میں آ گیا۔ ایک چورس سا گڑھا تھا۔ اس میں پاؤں لٹکا لیے جس طرح پرانے زمانے میں جولاہے کھڈّی بنا کرتے تھے۔ آگے چوکیاں تھیں، ورنہ اس قصرِ مذلّت میں گِرنے کا ڈر تھا۔ اسی گڑھے کے وسط میں جاپانی باورچی کھڑے چیزیں تل تل کر دے رہے تھے۔ اسی دوران میں گیشائیں برابر مہمانوں کی بلائیں لیتی رہیں۔ اب کے پھر طنبورہ نوازی ہوئی لیکن خُدا کا شکر ہے جلد ختم ہو گئی اور ہمیں ساکورا ساکورا والے رقص میں شامل نہیں ہونا پڑا۔ ہم ایک بار اس میں شامل ہو چکے ہیں لیکن قصّہ کئی برس پرانا ہے۔ اس کی تصویریں ہم ہر کسی کو نہیں دکھاتے۔ آپ دیکھنا

چاہیں تو دِکھا سکتے ہیں۔
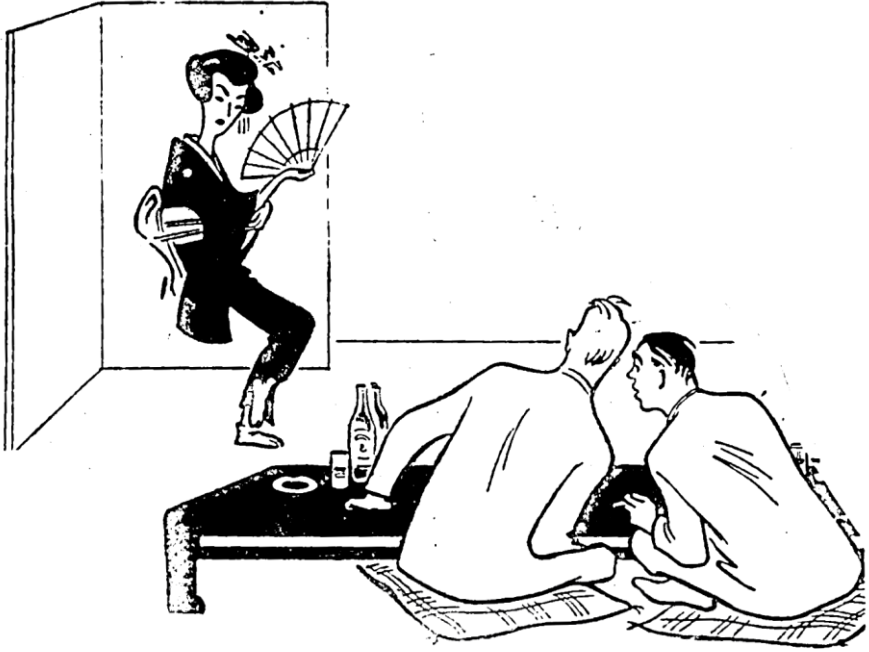
ہر ملک کے اپنے آداب اور اپنی رسمیں ہوتی ہیں۔ جاپانی میزبانی کا بزنس لنچ یا ڈنر گیشا گھر میں ہوتا ہے اور مہمان کے لئے نسوانی صحبت فراہم کرنا، دعوت اور بزنس کا حصّہ ہے۔ اس میں وہ جتنا گُڑ ڈالے گا اُتنا ہی میٹھا ہو گا۔ لیکن بار اور گیشا گھر سے قطع نظر ہم نے گلیوں بازاروں میں چوما چاٹی کا وہ سلسلہ زیادہ نہیں دیکھا جو بعض دوسرے ملکوں میں ہے اور ہانگ کانگ میں ہے۔ ہانگ کانگ کا احوال ہم پہلے بھی لکھ

چکے ہیں۔ اب کے بھی میر امار ہوٹل والوں نے ہمیں ہانگ کانگ کی جو گائیڈ دی وہ دردِ تنہائی دُور کرنے کے لئے تیر بہدف نسخوں کی پوٹ تھی۔ ایک اشتہار کا اقتباس:

"ایسکورٹس لمیٹڈ۔ ۷۵ پیکنگ روڈ، کولون

مہمانانِ عزیز کے لئے رفیقِ تنہائی مہیّا کرنے کی یہ سروس یوروپئین ملکیت میں ہے۔ ہمارے یہاں سے ہر طرح کی لڑکی مل سکتی ہے۔ شام کو آپ کو جی بہلانے کے لئے چُلبُلی اور نوجوان لڑکی سے لے کر تنہائی کے ڈنر میں عمدہ گفتگو کرنے والی مادام تک۔ آپ جسے بھی منتخب کریں وہ خوش اندام، خوش پوش اور فرمانبر دار رفیق ہو گی۔ ہر قوم اور نسل کی انگریزی بولنے والی۔ فیس فی گھنٹہ ۳۳ (ہانگ کانگ) ڈالر۔

خواتین کے لئے دلکش شخصیت کے مرد بھی ۲۲ (ہانگ کانگ) ڈالر کے حساب سے مہیّا کئے جاتے ہیں۔ ناپسند ہوں تو دام واپس۔"

گویا خواتین مہنگی ہیں اور مرد سستے ہیں۔ ویسے ۲۲ ڈالر بھی کچھ کم نہیں، ہمارے یہاں تو ٹکے ٹکے میں آدمی ملتا ہے۔ اس قسم کی خدمت کے لئے تو ہم پلّے سے بھی دینے کو تیّار ہیں۔

فلپائن

دسمبر ۱۹۷۲ء

جانا ملک سے باہر اور ہونا قدر ہماری

ہمارے ہاتھ میں سفر کی لکیر پھر کھجلائی اور بولی "چل چلئے دنیا دے اس نکڑے" ہم نے کہا "بسم اللہ، لیکن بھاگوان؟ اب کے کہاں؟ اے جانِ قیس تیرا ارادہ کِدھر ہے آج؟" بولی "منیلا۔ دور مشرق کا مجمع الجزائر فلپائن۔۔۔" ہم نے کہا "منیلا ہم دیکھ چکے اور اس کے بارے میں 'دنیا گول ہے' میں کافی لکھ چکے 'جانا ہمارا فلپائن اور ڈرنا بات بات پر' والا مضمون نہیں دیکھا؟ کسی اور جگہ کا حکم کرو تو البتہ ہم اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکالیں۔ ہاتھ کی لکیر نے کہا۔ اب کے قرعہ وہیں کا نکلا

ہے۔ اٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو۔۔۔

پس ہم نے ایک سوٹ کیس اور دوسری طرف امام ضامن باندھ بلکہ بندھوا کر یارِ عزیز جمیل الدّین عالیؔ کو فون کیا بولے۔ ”جہاز کب روانہ ہوتا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”صُبح سات بجے۔ لیکن ہوائی اڈّے پر ایک گھنٹا پہلے پہنچنے کی شرط ہے۔“

فرمایا۔ ”سواری؟“

ہم نے کہا۔ ”ہمارے پاس اوپر کو تو ہمیشہ سواری رہی ہے، نیچے کو کبھی نہیں رہی۔ اگر ہے تو اُس کا ڈرائیور چھُٹّی پر ہے۔ مُنہ اندھیرے نکلیں گے۔ پاپوش نگر جا کر کسی ٹیکسی والے کی خوشامد کریں گے۔ اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ دیں گے۔ زرِ کثیر کا وعدہ کریں گے۔“

بولے۔ ”نہیں۔ تم فون کر دینا میں آجاؤں گا۔“

ہم نے کہا۔ ”پہلے تولو پھر بولو۔ آج کی حد تک پہلے بولنے اور پھر تولنے کی روش چھوڑ دو۔ سوچ لو کہ بہت صُبح اٹھنا ہو گا۔ دوستی ایک طرف، صُبح کی بے آرامی ایک طرف۔“

فرمایا۔ ”تم فون کر دینا جی۔ حد سے حد اُٹھ کر تُم کو دو چار گالیاں دے لوں گا۔ سو وہ ویسے بھی دے لیتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اب کے کالم میں پھر تم نے میری علمیت اور فلسفہ نگاری پر کمینے پن سے چوٹیں کی ہیں، تاہم میں آؤں گا۔“

بے شک وہ آئے اور راستے میں حیران بھی ہوئے کہ ہیں صُبح ایسی ہوتی ہے؟ سپیدۂ صُبح اِسے کہتے ہیں۔

ہم نے کہا، ”تم نے آج دیکھی ہے صُبح؟ ہم تو کئی بار سُورج کو نکلتے دیکھ چکے ہیں۔“

فرمایا۔ ”ارے کیا میرا شمار چرند پرند میں کرتے ہو؟ یہ کوئی بھلے مانسوں کے اُٹھنے کا وقت ہے؟“

ہوائی اڈّے پر پہنچ کر گاڑی سے کے ایل ایم کے کاؤنٹر تک ہمارا سوٹ کیس بھی وہی اُٹھا کر لے گئے۔ ہم نے واجبی سی نہ نہ کی، پھر چُپ رہے۔ وہاں بہت سے لوگ ہمارے پاس سے گزرے اور ہمیں پہچانا بھی۔ اس شخص کو جو حسینوں کے ناز تک نہیں اُٹھا سکتا، ہم نے سوٹ کیس اٹھائے دیکھا تو طے کیا کہ ہم اس احسان کا بدلہ چکائیں گے۔ دو تین ہفتے تک ان کے بارے میں کوئی چبھتا ہوا کالم نہ لکھیں گے۔

یہ منیلا ہے اور یہ منیلا کی خلیج کے عین سامنے ہمارا منیلا بے ہوٹل ہے۔ نویں منزل کی کھڑکی سے سامنے جہاز کھڑے نظر آتے ہیں۔ آج صُبح طوفان کا سگنل نمبر ۳ ہوا تھا۔ ولے بخیر گذشت۔ چند ماہ پہلے یہاں ایسا ہولناک سیلاب آیا تھا کہ کیا ہے زمین فلک پہ تھا پانی کمر کمر۔ ڈامر اور پتھرّ کی سڑکوں کو بہالے گیا۔ چنانچہ اب نئی سڑکیں سیمنٹ کی بنائی جا رہی ہیں اور چونکہ سیمنٹ کی سڑکیں بھی ٹھیکیدار ہی بنائیں گے اور ٹھیکیدار اور اہلکاروں کے درمیان خیر سگالی اور امدادِ باہمی کا یہاں ہمارے ملک سے بھی زیادہ رواج ہے، لہٰذا سیمنٹ کی کارکردگی بھی دیکھنا چاہیے۔ ایک بات ضرور ہے۔ یہاں مارشل لا ہے اور ابھی تازہ ہے۔ تین ماہ ہوئے لگا ہے۔ ڈانڈا پیر ہے بگڑیاں تگڑیاں دا!

علی الصُبح اخبار کی تلاش ہوئی۔ پچھلی بار منیلا ٹائمز اور اس کا میگزین ہمیں پسند آیا تھا۔ ایک اخبار "کرانیکل" بھی اچھا تھا۔ اب کے بازار میں ان میں سے تو کوئی نہ دیکھا۔ فقط ایکسپریس اور جرنل اور بلیٹن دکھائی دیئے۔ ایکسپریس تو پہلے کا ہے۔ سُنا ہے مارکوس صاحب کا اپنا ہے۔ جرنل اور بلیٹن حال کی پیداوار ہیں۔ خبروں کے لحاظ سے بلیٹن ذرا سا غنیمت ہے۔ ویسے سب خشک اور بے مزہ۔ معلوم ہوا منیلا ٹائمز وغیرہ بند کر دیے گئے بلکہ منیلا ٹائمز نے خود اپنے کو بند کیا۔ حکومت نے ان لوگوں سے کہا

تھا کہ تم لوگ ایڈیٹوریل وغیرہ میں اینڈی بینڈی باتیں لکھ جاتے ہو جو مُلک کے مفاد میں نہیں ہوتی اور جن سے ہماری طبیعت منغّض ہوتی ہے۔ ہم تم کو بند نہیں کرتے اگر اخبار اداریے کے بغیر نکالو۔ منیلا ٹائمز والے ایک ہی بیوقوف نکلے۔ کہنے لگے۔ نہ صاحب اخبار نکلے گا تو اداریے سمیت نکلے گا۔ چنانچہ ورنہ والا معاملہ ہوا۔ یعنی نہیں نکلا۔

یہاں اخباروں کی سرخیوں میں ہر جگہ ہم نے دیکھا کہ FM نے فلاں بات ارشاد کی۔ FM نے فلاں بھاشن دیا۔ ہم نے پوچھا کہ اس مارشل لا کا فیلڈ مارشل کون ہے۔ معلوم ہوا کوئی نہیں۔ FM کا مطلب ہے ”فرڈی ننڈ مارکوس۔“ فلپائن میں پچاس ریڈیو اسٹیشن تھے۔ FM نے سب بند کر دیے، صرف تین رہنے دیے۔ وہ بھی سرکار کی مَہِما گانے میں لگے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی کئی تھے۔ FM نے ان کو بھی مختصر کیا۔ دو تین رہنے دیے۔ آج کل فوج دُکانوں پر جالیاں لگا رہی ہے اور سڑکوں پر جھاڑو دے رہی ہے۔ یعنی جو بھی کسی نئے نئے مارشل لا میں ہوتا ہے، وہ کر رہی ہے۔ لیکن یہ بات اگر ماند شے ماند شب دیگر نمی ماند۔ لوگوں سے غیر قانونی ہتھیار واپس لے لینے کا فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ اب لوگ پستول دِکھا کر نہیں لوٹتے۔ اندھیرے اجالے میں مسافر کی کلائی مروڑ کر یا گردن میں انگوٹھا دے

کر گھڑی اُتار لیتے ہیں۔ کرفیو ۱۲ بجے سے ۴ بجے تک مُستقل چل رہا ہے۔ اس سے پہلے آپ ہوٹل کے کمرے سے باہر ہوا کھانے کو قدم نکالیں تو دس آدمی لپک کر آتے ہیں۔ صاحب چلیے جنّت کی سیر کرا دیں، حور و غلمان کا بار عایت انتظام ہے۔ آپ کے کمرے میں بھی آپ کی تواضع کے لیے کوئی مہمانِ عزیز بھیجا جا سکتا ہے۔ کرفیو کی وجہ سے نائٹ کلبوں کے کاروبار پر اثر پڑا ہے تو نائٹ کلبوں کے مکین گاہکوں اور مؤکلوں کی تلاش میں سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔

یہاں ہر چیز بکتی ہے خریدارو بتاؤ کیا خریدو گے؟

کہتے ہیں سرحد کے صوبے میں کوئی شاہ صاحب یعنی سیّد بادشاہ گئے تھے۔ عقیدت مندوں نے ان کے ہاتھ پاؤں چومے، خاطر عاطر کی اور بعد ازاں کہا یا حضرت! ہماری خوش قسمتی کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ اب ہم آپ کو مار کر یہیں دفن کریں گے اس پر درگاہ بنائیں گے۔ عرس کیا کریں گے۔ ہمارے گاؤں میں کوئی درگاہ نہیں تھی۔ چڑھاوے چڑھانے کے لیے بڑی دور دوسرے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ منیلا میں کسی پاکستانی شاعر کا آنا بھی ایسا ہی امر سمجھیے۔ ہمیں مار کر دفن کرنے کا عزم تو کسی نے نہیں کیا۔ لیکن ہمارا کلام خواتین و حضرات نے شاید مرزا کے گھر پر جو ایشین ڈویلپمنٹ بینک میں ہیں فرمائش کر کے سُنا۔ اے اہلِ کراچی! نہ سنو ہمارا

کلام۔ ہمارا کیا نقصان ہے؟ تمہارا ہی نقصان ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہم منیلا آ کر یا ٹوکیو جا کر لوگوں کو سُنا آیا کریں گے۔

جواہر کی قدر کان سے نکل کر اور آدمی کی قدر وطن سے باہر جا کر ہی ہوتی ہے۔ ہم جو اکثر وطن سے باہر جانا پسند کرتے ہیں کچھ بے وجہ نہیں ہے۔

بیاض
۱۹۷۰
بیاض ۱۹۷۲
JAMSHAED
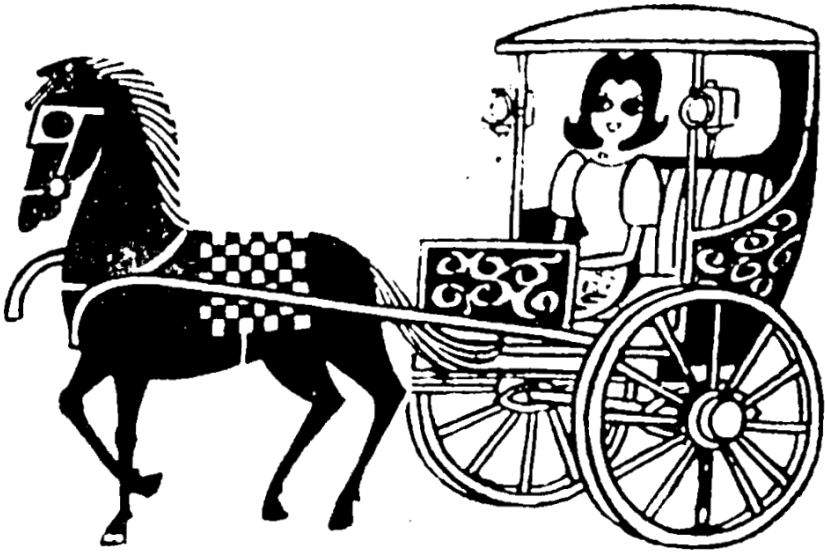
منیلا میں ہم ملک الشعراء ہوتے ہوتے رہ گئے

ہم نے پچھلے باب منیلا والوں کے ہاتھوں اپنی قدر افزائی کا ذکر کیا تھا۔ تفصیل اس لئے نہ دی تھی کہ ہماری طبیعت میں انکسار کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہے۔ دعوتیں ہوئیں ایک سے ایک پُر تکلّف، حتّٰی کہ ہمارا جی چاہنے لگا کہ یہیں رہ جائیں۔ باقی عمر یادِ خُدا اور صحبتِ بُتاں میں یہیں گزار دیں۔ مشاعرے بھی ہوئے۔ ہماری زندگی کے یہ واحد مشاعرے تھے جِن میں ہم کو سب سے آخر میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جن دو تین صاحبوں اور بیگموں نے ہم سے پہلے پڑھا، شعر تو اِن کے ہم سے

زیادہ اچھے تھے لیکن خوش قسمتی سے (ہماری خوش قسمتی سے) ان کا نام اتنا مشہور نہ تھا۔ پھر وہ منیلا کے مقامی شعراء تھے، اور ہماری حیثیت ایک بیرونی شاعر کی تھی، اور اس لحاظ سے ہم اس ساری عزّت و تکریم کے سزاوار تھے جو ہمیں حاصل ہوئی۔ اتنے بڑے مشاعروں میں پڑھنے کا بھی یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ ایک روز تو تین آدمی تھے، ایک روز اس سے بھی زیادہ۔ اگر ہم غوری کی تین سالہ بچی کو، جو جاگ رہی تھی، اور دو سالہ بیٹے کو جو سو رہا تھا، شامل کر لیں تو پورے پچاس سامعین تھے۔ پاس والے گھر میں رہنے والے چاہے ہماری زبان نہ جانتے تھے، فلپائن کے مقامی باشندے تھے۔ لیکن ہماری گرج دار اور کھرج دار آواز ان کے کانوں تک بھی پہنچتی ہوگی۔ اگر آپ شعر سمجھنے کی شرط نہ لگائیں تو اس طرح سامعین کے تعداد ستّر پچھتّر گِنی جا سکتی ہے۔ یہ شرط لگنی بھی نہیں چاہیے کیونکہ آپ کی زبان سمجھنے والوں میں بھی سارے لوگ شعر سمجھنے والے نہیں ہوتے۔ مرد ہوں تو ٹک ٹک دیکھتے رہتے ہیں۔ عورتیں ہوں تو سوئٹر بُنتی رہتی ہیں۔۔۔ فلپائن کی فضا شاعروں کے لئے یوں بھی ساز گار ہے۔ ہمارے تو صرف شعر ہی سُنے گئے اور داد ہی دی گئی۔ ہمارے محترم جی الانا صاحب کو تو فلپائن کے کسی ادارے نے پاکستان کا ملک الشعراء کا سرٹیفکیٹ بھی عطا کیا تھا۔ اب اگر ہم کو پاکستان میں کوئی نہیں سُنتا یا الانا صاحب کو

پاکستان کا ملک الشعراء نہیں مانتا تو یہ ہمارے اہلِ ملک کی بے ذوقی اور بے سوادی کے علاوہ کیا ہے۔ ویسے ہم نے بھی منیلا میں اس ادارے کا سُراغ لگانے کی کوشش کی تھی کہ اور نہیں تو نائب ملک الشعراء ہو کر ہی واپس آئیں۔ لیکن کسی نے بتایا نہیں۔ یہ کہا کہ ہم کو معلوم نہیں۔ معلوم تو ہو گا، ہمیں بتانا نہیں چاہتے ہوں گے۔

غوری صاحب کی بیگم عابدہ، جن کے نام کا اعلان عابدہ ناز کراچوی کے نام سے کیا گیا، شعر روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں کہتی ہیں، لیکن اچھے کہتی ہیں۔ ان کے میاں کرامت اللہ خاں غوری جو کراچی یونیورسٹی میں پہلے پڑھتے پھر پڑھاتے رہے ہیں، منیلا میں پاکستان کے سفارت خانے کے سیکریٹری ہیں۔ نوکر ہو جانے کے بعد قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو لکھنا پڑھنا چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن غوری صاحب ایسے پڑھاکو ہیں کہ کتابوں میں ڈوبے بلکہ نہائے رہتے ہیں۔ ان کی بیگم کو اُن کا یہ انہماک پسند نہیں، اور پسند آ بھی کیسے سکتا ہے۔ پس عابدہ غوری کی ساری شاعری کا موضوع اُن کی رقیب یعنی کتاب ہی ہے۔ ارشاد کیا ہے۔

تمہارے باب میں ہر باب بابِ اُلفت ہے

ہر ایک لفظ میں ہے اس جناب کی صورت

کتاب ہی سے اگر تم کو اتنی رغبت ہے

ورق ورق مُجھے پڑھ لو کتاب کی صورت

وطن کے اعتبار سے تو عابدہ ناز کو جھانسوی کہلانا چاہیے۔ لوگ وطن کی محبّت میں اپنے نام کے ساتھ گڈھ مکتیسری اور ڈبائیوی اور سر گودھوی تک لکھتے ہیں لیکن عابدہ کو اس لیے عُذر ہے کہ جھانسوی سے یہ معلوم نہیں ہوتا آیا یہ لفظ جھانسی سے نکلا ہے یا جھانسا سے۔ ویسے ہم نے ایک بزرگ کا نام تاباں جھانسوی سُنا ہے۔ یہاں منیلا میں دوسری شاعرہ خورشید تاباں تھیں۔ وہ شعر کم کہتی ہیں، انکسار زیادہ برتتی ہیں۔ بہت ہی خوش ذوق بی بی ہیں۔ ان کے میاں مظہر عارف ایشین ڈویلپمنٹ بینک میں ہیں۔ خوش کلام اور خوش جمال۔ ان کے شعروں میں عجب رچاؤ اور مٹھاس ہے اور پڑھنے کا مترنّم انداز بھی بے حد دِل نشین ہے۔ اُن کی ایک غزل تو ہم نے اپنے قارئین کے لئے پوری نقل کر لی۔ ؏

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

بیتے ہوئے اِک اِک پل سے اِک اِک پل نے پایا کیا کیا

یاد اک باسی پھول سہی اس پھول نے مہکایا کیا کیا

آنسو دو نکلے لیکن اک جادُو تھا ان بوندوں میں

آنکھ سے دل کے آنگن تک سبزہ سالہرایا کیا کیا

ہم کو بسنت سے کیا لینا تھا رُت آئی رُت بیت گئی

دھنک نے کیا کیا انگڑائی لی بادل بھی چھایا کیا کیا

تارے بن گئے اوس کے موتی چاند نے چاندی برسائی

پھیر کے منہ بھی ہم نے نہ دیکھا لٹتی رہی مایا کیا کیا

جانے پہچانے چہرے، یہ غم یہ مٹتی تصویریں

ان مٹتی تصویروں میں، دیکھا کیا کیا، پایا کیا کیا

ہم نہ سمجھتے زیست کے نکتے؟ کون سے ایسے مشکل تھے

تیری زلف نے بیچ میں آکر بات کو اُلجھایا کیا کیا

اِک خوابِ بے خوابی ہی میں ساری رات بسر کر دی

نیند سے بوجھل جھونکے آئے ہم کو چونکایا کیا

ترکِ محبّت وہ بھی تجھ ایسے سے کوئی آساں ہے؟

پاس آکر سمجھایا کیا، دُور سے تڑپایا کیا

وقت پڑے تو غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں، دیکھ ہی لو

باتیں کیں تنہائی نے کیسی، یاس نے بہلایا کیا

اپنی اماں میں آجانے والوں پر آنچ نہ آنے دی

دھوپ میں اپنے آپ ہی دِن بھر جلتا رہا سایا کیا

سب انسان دکھی ہیں عارؔف جب سے یہ احساس ہوا

سُکھ میں ہم نے دُکھ جھیلا اور دُکھ میں سُکھ پایا کیا

منیلا میں کلچر کی ایک اور خوراک بھی ہم نے لی۔ ایک دِن غوری کہنے لگے۔ کچھ

دلچسپی آرٹ اور کلچر سے بھی ہے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے مجرّد مصوّری، غیر مجرّد مجسّمہ سازی اور پکّے گانے کے مظاہر ناچنے لگے۔ تاہم ہم نے جی کڑا کر کے کہا۔ "دلچسپی کیا معنی؟ یہ چیزیں تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ آرٹ اور کلچر کا ذوق ہمیں مبداءِ فیاض سے بقدرِ وافر ودیعت ہوا ہے۔"

بولے "اتنی مشکل زبان بولنے کے بجائے ہاں یا نہ میں جواب دیجیے۔"

ہم نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ پاکستان میں تو سبھی ہم سے پوچھ کر تصویریں بناتے ہیں، اور ہمارا مشورہ لے کر گاتے بجاتے ہیں۔ ساری آرٹ کونسلوں کے ڈائریکٹر ہمارے برخوردار ہیں اور ہمارے بغیر پاکستان میں کلچر کا پتہ تک نہیں ہل سکتا۔"

اب غوری صاحب نے کہا۔ "کٹھ پُتلیوں کا کھیل دیکھا ہے کبھی؟"

ہم نے کہا۔ "ہماری تو ساری عُمر کٹھ پُتلیوں کا کھیل دیکھتے گزر گئی۔ ہمارے ملک میں یہی ایک کھیل تو ہوتا ہے۔"

بولے۔ "میں سیاست کی بات نہیں کر رہا۔ سچ مچ کے Puppet Show کی بات کر رہا ہوں۔ آج فلپائن کلچرل سنٹر میں ہمارے ساتھ چلیے۔۔۔ جاپانی کٹھ پُتلی کا شو ہو

گا۔"

جاپان ہم کو بہت پسند ہے۔ لیکن جاپان کے تھیٹر خصوصاً کابو کی کا نام سُن لیں تو اسدؔ کی طرح ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ لیکن خوشی سے نہیں۔ ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ اختلاج ہونے لگتا ہے۔ پاکستانی فلمیں اور جاپانی تھیٹر دیکھتے وقت ہم اپنے ساتھ اسپرین اور لخلخہ ضرور رکھتے ہیں۔ کیا عجب کب ضرورت پڑ جائے۔
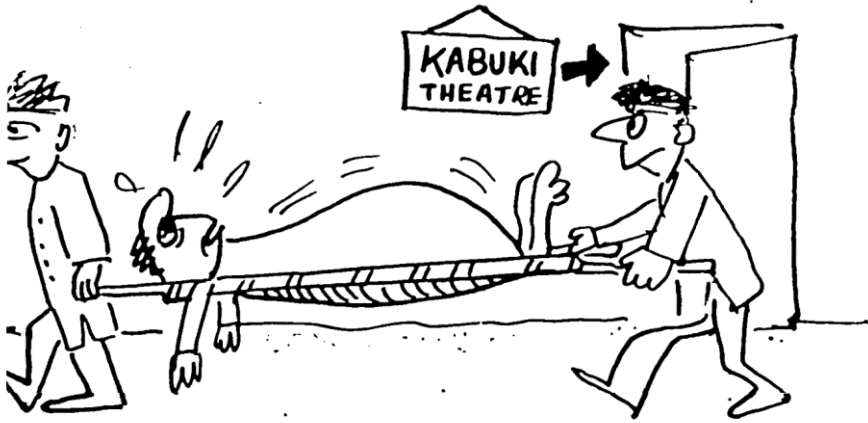
تھا تو یہ کٹھ پُتلی کا کھیل۔ لیکن بالکل کابُوکی کی طرز کا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس قوم کا یہ تھیٹر ہو وہ ٹرانسسٹر اور کاریں کیسے بنا لیتی ہے؟ بھاری بھاری چوغوں والے تلوار باز، ٹیلی ویژن کے پوپائے دی سیلر کی محبوبہ سے ملتی جلتی دوشیزائیں یا

شہزادیاں۔ غن غن کرتے بادشاہ یا سردار۔ بولتے نہیں فریاد کرتے ہیں۔ اور گاتے نہیں کراہتے ہیں۔ چُن چُن کر بد آواز گانے والے لائے جاتے ہیں اور بے سُری دَف پر گوائے جاتے ہیں۔ ہم نے پہلے حصّے میں اپنے کو ضبط کیا بلکہ ایک دو تحسین کے کلمات بھی کہے تا کہ میوزک خصوصاً جاپان کے کلاسیکل میوزک سے ہماری آشنائی اور رغبت ثابت ہو۔

دوسرے حصّے میں اپنے چُٹکیاں لیتے رہے تا کہ سو نہ رہیں۔ جماہی روکنا بڑا مشکل کام ہے۔ جانے لوگ کیسے روک لیتے ہیں۔ تیسرے حصّے میں۔۔۔ لیکن تیسرے حصّے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ہم نے غوری سے کہا۔ غضب ہو گیا۔ ہم نے تو ایک صاحب کو عین اس وقت ملنے کے لئے ہوٹل میں بُلا رکھا تھا۔ اتنا دلچسپ پروگرام چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن مجبوری۔۔۔ بولے میں بھی چلتا ہوں۔ ہمارا خیال ہے نکلنے کی ضرورت اُن کو اور اُن کی بیگم کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جاپان میں تو سُنا ہے اسپتال میں آپریشن کرنے سے پہلے مریض کو بے سُدھ کرنے کے لئے دوا کا انجکشن وغیرہ نہیں لگاتے، کلوروفام نہیں سنگھاتے۔ بس کابُوکی تھیٹر دِکھاتے ہیں۔ ایک آدھ سین دیکھ کر ہی ایسا غین ہو جاتا ہے کہ مزے سے چیر پھاڑ کر لیجیے، اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔

OPERATION
THEATRE

ایک اور خط منیلا سے

جب ہمارے ہاں چینی کا کال پڑتا ہے ہم مشرق بعید کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی ہم مشرقِ بعید کا رُخ کرتے ہیں، ملک میں چینی کی کمی پر ہاہا کار مچنے لگتی ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ہم سنگاپور اور ہانگ کانگ گئے تو کراچی کے ترسے ہوئے پیالی میں مُٹھّیاں بھر بھر چینی ڈالتے تھے۔ بلکہ چینی میں چائے ڈالتے تھے۔ اب کے ۱۹۶۸ء کا سا حال تو نہ تھا جب لوگ ذیابیطس کے مریضوں پر رشک کیا کرتے تھے کہ اُسے شکر آتی تو ہے، خواہ کسی عنوان آتی ہے۔ تاہم یہاں آدھا چمچہ

پیتے ہوئے گئے تو منیلا میں ڈھائی چمچے ڈالنے لگے اور شیریں لبوں پر جاں نثار کرنے لگے۔ فلپائن میں آج کل مارشل لاء لگا ہوا ہے۔ ہم نے نہیں لگوایا۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اب کے منیلا اپنے گھر کا سا لگا۔ ہم اتنے دِن تک مارشل لاء کے تحت رہے ہیں کہ جمہوریت میں دم گھُٹنے لگتا ہے۔ صدر فلپائن مارکوس نے اپنے فلسفۂ حکومت پر جو کتاب لکھی ہے اس میں صدر ایوب کا ذکر تحسین کے لہجے میں کیا ہے، ان کے تصوّرِ جمہوریت کا حوالہ دیا ہے کہ سبھی لوگ جمہوریت کا مذاق نہیں رکھتے، اس کے اہل نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ چیز ناپ تول کر، ڈراپر کے ساتھ بقدر اشکِ بُلبُل دینی چاہیے۔ زیادہ خوراک سے نشہ ہو جاتا ہے۔ صدر مارکوس نے مارشل لاء کے لئے یہ عذرِ شرعی بیان کیا تھا کہ بائیں بازو کی شورش کا خطرہ ہے۔ جس طرح ہمارے ملک میں پرانے سیاستدان جب چاہتے تھے اسلام کو خطرے میں ڈال دیتے تھے، اسی طرح فلپائن میں بائیں بازو کی شورش کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ پورے ملک میں کوئی اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ وہاں بائیں بازو والے لوگ تو ضرور ہیں اور کہاں نہیں ہیں۔ لیکن مسلح شورش کی بات الحاقی ہے۔ ہم سیاسی بحث میں نہیں پڑتے، فلپائن والوں کے ذاتی معاملوں میں دخل نہیں دیتے۔ اس لئے بھی کہ بہت سے لوگوں کو مارشل لاء سے خوش پایا۔

فلپائن اسی طرح مشرق میں جرائم کا گڑھ گنا جاتا تھا جس طرح واشنگٹن یا شکاگو امریکہ میں۔ یہ کُچھ غَلَط بھی نہ تھا، ہماری کتاب ''دُنیا گول ہے'' کے فلپائن کے باب میں اس بات کو مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے۔ اُس وقت وہاں جان و ایمان خطرے میں ہوتے تھے۔ گھر سے یا ہوٹل سے باہر قدم رکھنا اقدامِ خُودکُشی کے ذیل میں آتا تھا۔ اب کے ایمان کا خطرہ تو پایا۔۔ ایمان کے خطرے والے ہمارے ہوٹل کے باہر ہی منڈلاتے رہتے تھے اور رستے میں بھی گھیراؤ کرتے تھے۔ لیکن جان کا خطرہ کم ہو گیا ہے۔ لوگوں کے ہتھیار بہت ضبط ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے تو ہر شخص سِلح شور ہوتا تھا۔ پانچ لاکھ ہتھیار بر آمد کئے گئے ہیں جن میں اسٹین گنیں اور مشین گنیں تھیں، بلکہ بکتر بند گاڑیاں بھی۔ مارشل لاء کے احکام اور آرڈیننس روز نئے نئے نکلتے ہیں۔ تعداد سینکڑوں میں ہے۔ لِفٹ میں سگریٹ پینے کی ممانعت جو درج ہے اِس کے ساتھ آرڈیننس نمبر ۱۰۸۸ لکھا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے ڈرے ہوئے ہم اپنے ہوٹل سے کم کم نکلتے تھے۔ ایک روز اپنے دوست ڈاکٹر مختار بھٹی کو ساتھ لے کر جو ہمارے ساتھ یہاں سے گئے تھے، شہر میں دُور تک نکل گئے اور سلامت واپس آ گئے۔ منیلا کا وہ حصّہ جس سے ہم آشنا ہیں بہت بدل بھی گیا ہے۔ پہلے جو نام کا پارک تھا، اب سچ مچ کا خوبصورت پارک ہے۔ لیونیتا پارک۔ ہم نے ایسے خوبصورت پارک

بہت کم دیکھے ہیں۔ اس کے سامنے رزال پارک۔ سڑکوں کی روش بندی کے بھی کیا کہنے۔ ہوٹل بھی ان چھ سال میں بہت سے بن گئے ہیں۔

موسم منیلا کا۔۔۔ مشرق بعید کے بہت سے شہروں کی طرح ایسا ہے کہ نہ بھادوں ہرے نہ ہاڑ سوکھے۔ موسم کی دو قسمیں ہیں۔ گرم۔۔۔ گرم تر۔ ہم سوٹ لے کر گئے تھے، بہت پچھتائے۔۔۔ ہوٹل مرکزی ائیر کنڈیشنڈ تھا اس لئے اندر امن رہتا تھا۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ اس موسم کو اہلِ منیلا موسمِ سرما کا نام دیتے تھے۔ ایک روز شام کو ذرا سی خُنکی البتّہ ہو گئی تھی۔ مارشل لاء کے علاوہ وہاں کرفیو بھی مُستقل ہے۔ ہر روز بارہ بجے شب سے چار بجے صُبح تک رہتا ہے۔ صُبح کا تو ہمارے لئے کوئی مصرف کبھی نہیں رہا۔ رات کو تکلیف تھی۔ دوستوں کے ہاں دعوت کھاتے اور شعر پڑھنے میں بعض اوقات آدھی غزل چھوڑ کر اُٹھنا پڑتا تھا۔ ایک روز تو قافیہ پڑھ دیا، ردیف کو چھوڑ کے بھاگنا پڑا۔

مارکوس صاحب کی بیگم بڑی دِلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ اور اُن کو الیکشن جتوانے میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ بے چاری اچھی ہیں۔ ایک شام ہم پین امریکن کے دفتر میں بیٹھے ٹکٹ بنوا رہے تھے کہ خبر آئی کہ ان پر کسی نے چاقو سے حملہ کیا ہے۔ کس نے کیا ہے؟ کیوں کیا ہے؟ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ہمیں یہی فکر تھی کہ جنوبی ریاستوں کے

کسی مسلمان نے نہ کیا ہو؟ حملہ کرنے والا بے شک جنوبی ریاستوں ہی کا تھا لیکن مسلمان نہیں۔ سیّد اکبر کی طرح پولیس والوں نے اُسے وہیں گولی مار کر ڈھیر کر دیا، جس سے اُس کی عقدہ کشائی اور مشکل ہو گئی ہے۔ ہم نے ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ قاتل قصابوں کی طرح چاقو چلا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے بڑے حوصلے سے مدافعت کی، اور غنیمت ہوا کہ نیچے گر گئیں۔ ہاتھ کی انگلیوں اور بانہوں تک بات رہی ورنہ بچنا ممکن نہ تھا۔ فلپائن میں چوکی پہرے اور سیکورٹی کا سخت انتظام رہتا ہے۔ لوگ تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی قاتل قریب آ سکتا ہے۔ بلکہ فوٹوگرافر کا کہنا ہے کہ میں یہی سمجھا یہ شخص بیگم مارکوس کو چاقو نذر میں پیش کرنے جا رہا ہے۔

مشرق کی طرف کہیں بھی جایئے بینکاک سے مُفر نہیں۔ چنانچہ ہم کوئی بارہ چودہ بار بینکاک کے ہوائی اڈّے سے گزر چکے ہیں۔ اُترے فقط تین بار، وہ بھی ایک ایک دِن کو۔ بنکاک میں دھرا ہی کیا ہے۔ جس طرح الہ آباد فقط اکبر اور امرود سے عبارت تھا اسی طرح بینکاک میں دریائی مارکیٹ اور حماموں اور لاتعداد بودھ مندروں کے علاوہ کوئی چیز دیکھنے کی نہیں۔ یہ ویت نام سے چھٹّی پر آنے والے امریکی فوجیوں کا ٹھکانہ البتّہ ہے۔ ڈالر چھنکاتے آتے ہیں اور پتلونیں سنبھالتے جاتے ہیں۔ باقی کپڑے یہاں کے نائٹ کلب، مے خانے، حمام اور مالش کے کارخانے اُتار لیتے ہیں۔

دریائی مارکیٹ تو علی الصُبح ہوتی ہے اور ہم جو رات کے ڈھائی بجے منیلا سے بینکاک پہنچے تھے، صُبح پانچ بجے اُٹھ کر جا بھی نہ سکتے تھے۔ پی آئی اے کے اسلم خان صاحب نے البتّہ مہربانی کی ہمیں اپنی کار دے دی اور سفارت خانے کے سلطان شیخ صاحب نے ہماری رہنمائی کے لئے اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکالا۔ وہ ہمارے رفیقِ سفر اور دوست ڈاکٹر مختار بھٹی کے دوست تھے۔ حسنِ اتّفاق سے وہ دِن اتوار کا تھا اور سنڈے مارکیٹ کا جو بینکاک کی خاص چیز ہے۔ بس ہم نے کچھ پگوڈے دیکھے۔ پگوڈوں کے احاطوں میں بھی پگوڈوں کے جھنڈ ہیں۔ جو آتا ہے ایصالِ ثواب کے لئے ایک پگوڈا کھڑا کر جاتا ہے اور مہاتما بدھ کی مورتی سجا جاتا ہے۔ ہم نے لنکا، جاپان، چین، ہانگ کانگ اور بینکاک میں ہر طرح کے بُت دیکھے ہیں۔ بیٹھا ہوا بُدھ، کھڑا ہوا بُدھ، چلتا ہوا بُدھ، پھرتا ہوا بُدھ، لیٹا ہوا بُدھ، آدھا لیٹا ہوا بُدھ، سویا ہوا بُدھ، آدھا سویا ہوا بُدھ۔ ایک لیٹے ہوئے بُدھ پر لوگوں نے سونا منڈھ رکھا ہے۔ ایک بُدھ زمرد کا بنا ہوا ہے۔ بہر حال کہلاتا Emerald Buddha ہی ہے۔ لوگ اگر بتّیاں جلا رہے تھے، پھول چڑھا رہے تھے، اور ڈنڈوت کر رہے تھے۔

ہم نے زمردیں بُدھ کے مندر میں آلتی پالتی مار کر آرتی اترتی دیکھی اور عقیدت کا نُور لے کر نکلے۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ ”آر یو اے بُدھسٹ؟“ ہم نے کہا

بُدھسٹ تو نہیں، بُدھو البتّہ ہیں اور خیر سے گھر کو جا رہے ہیں۔ ایک کھڑا ہوا بُدھ لکڑی کا ہم نے منیلا ہی سے حصولِ برکت کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔ اسے ہم کسی کسی کو دِکھاتے تھے۔ یہ سب کے دیکھنے کی چیز بھی نہیں۔

جاپان (۲)

جولائی ۱۹۷۳ء

ٹوکیو
6000 میل
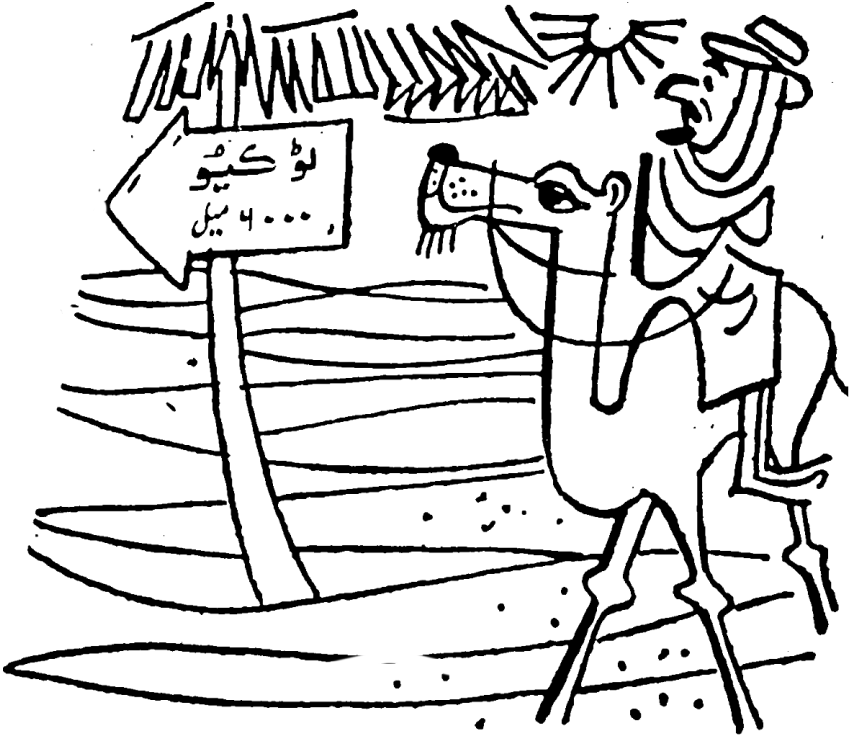
ہم تو سفر کرتے ہیں!

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

مصرعہ تو یہ بہت پرانا ہے لیکن اس میں خوش رہو کے معنی نئے ہیں۔ قصّہ دو مسافروں کا آپ نے سنا ہو گا کہ کہیں چلے جا رہے تھے۔ مالک کا پاؤں رپٹا تو ایک اندھے کنوئیں میں گر گیا اور واویلا کیا۔ دوسرے صاحب کچھ افیم اور کچھ انا کے نشے میں مست تھے۔ چونک کے بولے۔ از کجا می آید ایں آوازِ دوست۔ اے یار عزیز

کہاں ہو؟ اے میاں بُدھن کچھ بولو تو۔ انہوں نے اطلاع بہم پہنچائی کہ گڑھے میں گر گیا ہوں، بلکہ اندھے کنوئیں میں۔ حضرت نے لمحہ بھر توقّف کیا اور پھر یہ دُعا دے کر آگے چل دیئے کہ اچھا بھئی جہاں رہو خوش رہو۔

آج کراچی میں قیامت کا سماں تھا، پورا شہر جل تھل، ایسا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب گیا میخانہ بھی۔ جسے دیکھو بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ ہم بھی لشتم پشتم بخرابی بصرہ بندر روڈ سے یونیورسٹی روڈ ہوتے ہوئے گھر پہنچے، پھر شام ہوئی۔ یہ شام بھی دھواں دھواں تھی۔ گھنگور گھٹا تُلی کھڑی تھی۔ زاں پیشتر کہ پھر بوند پڑتی اور اس قطرے کے دِل میں مزید خطرہ پیدا ہوتا، ہم نے پین امریکن کے جمبو جیٹ کے پائیدان پر پاؤں رکھا اور آوازہ لگایا۔۔۔ جانے دوس۔ جمبو یعنی بوئنگ ۷۴۷ میں جگہ بہت ہوتی ہے۔ اندر سے یہ جہاز نہیں دیوان خانہ بلکہ سینما ہال نظر آتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں لوگ پھینٹے باندھے کوکا کولا اور مونگ پھلی بیچتے دِکھائی دیتے ہیں، یہاں شائستہ اور مہربان بی بیاں آپ پر ہزار جان سے نہ سہی، مروّت سے مُسکراہٹوں کا چھڑکاؤ کرتی گزرتی ہیں۔ ہمیں جس قطار میں جگہ ملی وہاں ایک تُرک بی بی بیٹھی تھیں جو دانتوں کی ڈاکٹر تھیں۔ ہمیں بے اختیار بَر محل اشعار یاد آنے لگے۔ اگر آں ترک شیر ازی بدست آرد دل مارا۔ وغیرہ۔ لیکن یہ فارسی تھی۔ زبانِ

یار مَن تُرکی و من تُرکی نمی دانم۔ اُدھر وہ عفیفہ تھیں کہ گردنِ موڑ کر ایک امریکی سے باتیں کرتی چلی جارہی تھیں جو ان کی سیٹ کے پیچھے کھڑا تھا اور ان کو نہیں جانتا تھا اور زبردستی تعارف کرائے جارہا تھا کہ میرا نام یہ ہے اور میں کلیولینڈ میں رہتا ہوں جو امریکہ کے مغربی ساحل پر ہے۔ اس بی بی نے کہا میرا ایک کالج کا استاد بھی امریکہ کے مغربی ساحل کا رہنے والا تھا۔ اگر دِل کو دِل سے راہ ہو اور طبیعتیں مائل بہ یک دیگر ہوں تو اتنا رشتہ بھی بہت ہوتا ہے۔ اور اگر نہ ہوں تو اسلام اور RCD بھی بے کار ہوتے ہیں۔ ہم ان دونوں چیزوں کو اپنی جیب میں رکھے مُنتظر تھے کہ یہ اس مکالمت سے فارغ ہوں تو ہم بھی اپنی رطب اللّسانی کے جوہر دِکھائیں اور ان کو بتائیں کہ انقرہ و استنبول ہم نے دیکھ رکھے ہیں اور تُرکوں پر ہم جان چھڑکتے ہیں۔ ان میں بھی صیغۂ تانیث پر بالخصوص۔

یہ بی بی سیّاحوں کے ایک گروپ کے ساتھ ہیں۔ یہاں سے یہ دِلّی میں اُتریں گی۔ تُرک عموماً دِلّی ہی میں اترا کرتے ہیں لیکن اُن کا مقصد کشور کشائی معلوم نہیں ہوتا۔ ہو بھی تو وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے۔ دِلّی اُترتے ہی یہ تاج محل دیکھنے جائیں گی۔ ہم نے کہا اے بی بی آتے جاتے میں ٹک کراچی میں اُترو تو اپنی بساط اور تمہاری صورت کے مطابق خدمت کے کچھ حقوق ہم بھی ادا کریں جو اسلام اور RCD کے

علاوہ دوسرے رشتوں سے بھی ہم پر واجب ہوتے ہیں۔ لیکن دانتوں کے سبھی ڈاکٹر طیّب محمود کی طرح ادب، شاعری اور فنونِ لطیفہ کے رسیا نہیں ہوتے۔ فنونِ لطیفہ تو ایک طرف بعض ڈاکٹروں کی سمجھ میں تو لطیفہ تک نہیں آتا۔ معلوم ہوا کہ یہ محترمہ صرف دانت دیکھتی ہیں اور کوئی چیز نہیں دیکھتیں، دِل وغیرہ تک نہیں دیکھتیں۔ پس ہم بے مزہ ہو کر اُٹھ گئے۔ سبھی مسافر تین تین سیٹوں پر لمبی تانے سو رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک کونا تاکا جہاں چار سیٹیں ایک ساتھ خالی تھیں۔ RCD کو ہم نے کسی اور مناسب موقع کے لئے اٹھا رکھا اور سوچنے لگے کہ ہندوستان سے ربط ضبط بڑھانا چاہیے۔ آخر اس سے بھی ہمارے بہت سے ثقافتی رشتے ہیں۔

فوری وجہ ہندوستان کے لئے ہمارے دِل میں گداز پیدا ہونے کی یہ ہوئی کہ ہم سے اگلی صف میں ایک دیوی اُس ملک کی اپنے لمبے بالوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دِلّی کوئی گھنٹے بھر میں آنے کو تھا اور وہ اس کی تیّاری میں سولہ سنگار کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے آنکھوں پر اُس چیز کی دھڑی جمائی جس کا نام ہمیں نہیں آتا۔ پھر پاؤڈر لگایا اور پھر دوبارہ بال بنانے لگیں۔ آئینہ ہمہ وقت پیشِ نظر تھا۔ ہم نے فارسی اور تُرکی کا دفتر تہ کر کے ہندی کے دوہے یاد کرنے شروع کئے۔ کبیر کے دوہے تو کم یاد آئے اور جو آئے زیادہ تر بے ثباتیٔ دنیا سے متعلّق تھے، یا پند و نصائح کا دفتر

تھے۔۔۔ ہاں جمیل الدّین عالؔی کے دوہے اُڑ اُڑ کر چسپاں ہو رہے تھے۔ یہ شخص کیا عمدہ شاعر ہے۔ بات ہمارے دِل کی ہوتی ہے کہتا یہ ہے۔ آج کل اپنے کالموں میں کامیابی کے پہاڑے مع گُر لکھ رہا ہے۔ اے صاحب! یہ بتاؤ کہ جس صورتِ حال میں ہم ہیں اس میں کامیابی کیسے ہو؟ انسائیکلوپیڈیا تو کوئی اور بھی لکھ لے گا۔ دوہے اور غزلیں اور گیت تو ایسے میٹھے اور ایسے پیارے اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ ہر چند کہ اب کے عالؔی میاں ہم کو ائیر پورٹ پر چھوڑنے نہیں آئے تھے۔ نہ ہمارا بستر اُٹھایا تھا۔ تاہم ہمارے اخلاق کی خوبی دیکھئے کہ یاد آتے چلے جا رہے تھے۔ آخر ہم نے پھر اس قولِ متین سے کام لیا کہ جہاں رہو خوش رہو۔ اشارہ تُرک بی بی کی طرف بھی تھا، ہندوستانی دیوی کی طرف بھی تھا اور جمیل الدّین عالؔی کی طرف بھی۔ اور پھر لمبی تان کر سو گئے۔

اب کے جس بی بی نے ہمیں خوابِ غفلت سے جگایا بلکہ چونکایا یہ جاپانی تھیں یا تھائی۔ جاپانی ہمیں خوب آتی ہے کم از کم ایک لفظ تو آتا ہے۔ آری گاتو گزائی۔ یعنی بہت بہت شکریہ۔ تھائی ہم کو نہیں آتی اس لئے چُپ رہے۔ وہ ہم سے ناشتے کا پوچھ رہی تھیں۔ ہم نے کہا۔ بی بی ہم مسلمان ہیں، زیادہ نہ سہی بقدرِ ضرورت تو ہیں۔ بس یہ یاد رکھو کہ ہم انڈے کے ساتھ بیکن نہیں کھاتے اور پورک نہیں کھاتے بولیں۔

اچھا تو تم پورک چاہتے ہو OK۔

ہم نے کہا۔ نہیں OK نہیں، ہماری بات سمجھو۔

بولیں۔ تو گویا تم انڈے بھی چاہتے ہو اور بیکن بھی OK۔

ہم نے کہا۔ اے مس OK! ہم کو کچھ بھی نہیں چاہیے۔ بس ہمارے حال پر رحم کرو۔ سوچا ناشتہ آنے تو دو۔ دیکھا جائے گا۔ بے شک ناشتے میں گوشت کا ٹکڑا تھا۔ لیکن یہ لیمب چاپ تھی۔ ایمان بچ گیا۔ میرے مولا نے خیر کی۔ ہمارا ایمان محض سؤر نہ کھانے سے بچ جاتا ہے۔ اپنے دوست ابوالخیر کشفی کی طرح ہم زیادہ تردّد نہیں کرتے۔ بے چارے تین سال سے جاپان میں ہیں۔ مُرغ تک نہیں کھاتے کیونکہ وہ ذبیحہ نہیں ہوتا۔ انڈے کھاتے ہیں، دال کھاتے ہیں۔ یہودیوں کی دُکان سے قیمہ لاتے ہیں کہ وہ ذبیحہ ہوتا ہے۔ ہمارے مولوی محبوب عالم بھی یہی کرتے تھے۔ رستے میں سیام آیا۔ اب اس نام کو لوگ نہیں جانتے۔ تھائی لینڈ کہتے ہیں، اور انام پر سے جہاز گزرا۔ انام کو بھی اب لوگ کم جانتے ہیں۔ یہ وہی خطہ ہے کہ شمالی اور جنوبی ویت نام میں تقسیم ہے۔ ہم نے برسوں پہلے ایک نامعلوم چینی شاعر کی نظم ترجمہ کی تھی۔

ملک انام سے طوطا آیا

تحفے میں

آدم کی وہ بولی بولے

میٹھی نرم

اور لوگوں نے اس کے ساتھ

وہی کیا

جو دِ و دانوں سے، پڑھے لکھوں سے

میٹھی بولی بولنے والوں سے دنیا میں ہوا کیا ہے

موٹی موٹی تیلیوں والا پنجرہ لے کر

بند کیا طوطے کو اندر

لے اب بول۔۔۔لے اب بول

ٹوکیو۔۔۔ گرینڈ پیلس ہوٹل کا کمرہ ۱۸۲۸۔ اسی ہوٹل میں ہم پار سال فروکش ہوئے تھے۔ چھوٹا سا کمرہ۔ بستر، ٹیلی ویژن، غُسل خانہ۔ یہاں کے نئے اور عمدہ ہوٹلوں میں سے ہے۔ پہلی بار کمرہ ساتویں منزل پر تھا لیکن سر مُو فرق نہیں۔ ایک فلور کو دوسرے سے اور ایک کمرے کو دوسرے سے پہچاننا ناممکن ہے۔ ہمارے لئے کمیونو تہ کیا رکھا ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ نیند آتی ہے پر نہیں آتی۔ آئے تو کس طرح آئے۔ کراچی میں تو ابھی ساڑھے آٹھ کا عمل ہے۔ لوگ کھانے پر بھی نہیں بیٹھے ہوں گے۔ آ جاری نندیا آ کیوں نہ جا۔ اچھا تو ہم کیمونو پہنتے ہیں۔ تھوڑی دیر کو یہ فاضلانہ کتاب پڑھتے ہیں جو ایک پُر مغز پاکستانی نقّاد نے لکھی ہے۔ نیند لانے کا مجرّب نسخہ ہے۔ ہماری خوراک اس کا ایک صفحہ ہے۔ اچھا بھئی نقّاد صاحب! تم بھی جہاں رہو خوش رہو۔

ٹوکیو سے ایک خط

ٹوکیو کا ٹیلی ویژن ہمارا خیال ہے چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے۔ ہم نے تو جب بٹن دبایا تصویر نظر آئی۔ لیکن ہر چیز جاپانی میں حتّٰی کہ انگریزی فلمیں بھی اگر دِکھاتے ہیں تو جاپانی میں ۔۔۔ ایک خاص چینل ایسا ہے جس پر انگریزی میں پروگرام آتا ہے، لیکن وہ صرف چند بڑے بڑے ہوٹلوں کے لئے ہے، اس سے باہر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کو ہم دیکھ لیتے تھے ورنہ آواز بند کر کے تصویریں دیکھتے رہتے تھے۔ سو یہ نسخہ ہم کبھی کبھی کراچی میں بھی برتتے ہیں بالخصوص قوّالی کے پروگراموں میں۔

اگرچہ کبھی کبھی اس سے اُلٹ بھی کر لیتے ہیں کہ آواز کھلی ہے، تصویر کا بٹن بند ہے۔ یہ پروگرام پر منحصر ہے کہ جنّت نگاہ ہے یا فردوس گوش ہے یا دونوں میں سے کُچھ بھی نہیں ہے۔

جاپانی فلموں کا ایک مرغوب موضوع کسی پُر اسرار سیّارے کی غیر انسانی مخلوق کا حملہ ہے یا کوئی مافوق الفطرت جانور سمندر کی گہرائی سے نکلتا ہے جس پر توپیں، بندوقیں، بم کوئی چیز اثر نہیں کرتی۔ ٹرینوں کو اکھاڑ کر اپنے دانتوں میں ماچس کی ڈبیہ کی طرح چباڈالتا ہے۔ ان میں سے ہمارے ہاں بھی گوڈزیلا وغیرہ کئی فلمیں آ چکی ہیں۔ ٹوکیو کے ٹیلی ویژن پر ہم اکثر اس قسم کی فلمیں دیکھتے تھے سو اس کے لئے زبان جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں آج کل ایک ناول دھڑا دھڑ بِک رہا ہے بلکہ دس لاکھ سے زیادہ بِک چُکا ہے جس میں جاپان کی غرقابی کا منظر کھینچا گیا ہے۔ یہ منظر ایسا قرین قیاس ہے کہ لوگوں میں ہراس پھیل گیا ہے۔ لکھنے والے نے جو سائنس کا گریجویٹ ہے، سائنس اور قوّتِ متخیلہ کا ملغوبہ تیّار کیا ہے۔ علم الارض کی تحقیقات کے حوالے دیے ہیں۔ جاپان کے پہاڑوں اور چٹانوں کی ساخت اور پانی کے اُتار چڑھاؤ کا اصلی اور سائنٹیفک تجزیہ پیش کیا ہے۔

آغاز اس کا یوں ہوتا ہے کہ جاپان کے ساحلی جزیروں میں سے ایک جزیرہ جو کل

تک پانی سے باہر تھا، ایک روز پانی میں ڈوبا ہوا پایا جاتا ہے۔ سائنسدان حیران اور پریشان ہوتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کا عفریت بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اِدھر کوہ آتش فشاں کا لاوا پھٹنے کو ہے۔ ٹوکیو اور جاپان میں چھوٹے موٹے زلزلے تو روز آتے رہتے ہیں اور خاصی طاقت کا زلزلہ بھی وقفے وقفے سے آتا ہے۔ ایک تحقیق یہ ہے کہ زُود یا بدیر ایسا ہی تباہ کن زلزلہ آنے کو ہے جیسا ۱۹۲۳ء میں آیا تھا، اور جس میں ٹوکیو، یوکوہاما، کوبے وغیرہ سبھی تباہ ہو گئے تھے۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی مر گئے تھے اور سارا شہر نئے سرے سے تعمیر کرنا پڑا تھا۔ اب ٹوکیو میں فلک بوس عمارتیں بنتی ہیں لیکن لوہالاٹ یکجان۔ یہ نہیں کہ جھٹکا آیا تو دو منزلیں گر گئیں یا دیوار اُدھر جا پڑی۔ مضافات میں ٹوکیو سے اوساکا جاتے ہوئے ہم نے ہلکے پھلکے مکانوں کی قطاریں دیکھیں کہ گر جائیں تو جانی نقصان کم سے کم ہو۔ ہر اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنّف نے اپنی کتاب میں تباہی کی جو نشانیاں بیان کی ہیں، ان میں سے بعض نمودار بھی ہو گئی ہیں۔ پہلی فروری کو وسطی جاپان میں کوہِ آتش فشاں "اسما" جاگا۔ مئی کے اواخر میں سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ ٹوکیو کے نواحات میں زمیں دھنستی جا رہی ہے۔ اسی روز جزیرہ بونن کے نزدیک ایک زیرِ آب آتش فشاں پھٹا۔ پہلی جون کو ساحلی جزیرہ کیوشو کا پہاڑ ساکوراچی بھی پھٹ کر

لاوا اُگلنے لگا۔ ان شواہد کے بعد بعض طبقوں میں ہر اس پھیلنا قدرتی بات ہے بلکہ بعض لوگ دفتر جاتے ہیں تو آہنی خود اور ایمر جنسی کے دوسرے سامان کا تھیلا لے کر جاتے ہیں کہ کیا جانے کب کیا ہو؟ لکھنے والا اس کتاب کا ۴۲ سالہ کمتسو ہے جو مصنّفِ کتب کثیرہ ہے۔ سو سے زیادہ سائنس فکشن کے ناول لکھ چکا ہے۔

ہم پچھلی بار آئے تھے تو تناکا کو وزیر اعظم بنوا گئے تھے۔ اگر لوگ ہمیں اس کا کریڈٹ نہیں دیتے تو مضائقہ نہیں۔ اب کے ٹوکیو کی شہری حکومت میں ہم نے کمیونسٹوں کو جتوا دیا۔ اکثریت تو خیر نہیں ہوئی لیکن سیٹیں لوگوں کی توقع سے کہیں زیادہ ملیں۔ یعنی ۲۴۔ اس کے اثرات پر خوب قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ دوسری تبدیلی اس سال میں یہ ہوئی کہ ڈالر ِگر گیا۔ پہلی ایک ڈالر کے ۳۰۸ ین ملتے تھے اب ۲۶۴۔ اُدھر ڈالر کے مقابلے میں ہمارا روپیہ گرا۔ یعنی کہاں تو ڈالر میں پانچ روپے ہوتے تھے اب دس روپے ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹوکیو جو ویسے ہی دنیا کا سب سے مہنگا شہر تھا، ہمیں اور مہنگا لگنے لگا۔ ہمارا ایک سوٹ، وہ بھی ٹھنڈا، سفر میں بلکہ سوٹ کیس میں پڑے پڑے ذرا شکن دار ہو گیا تھا۔ ہم نے استری کرانے بھیجا تو ۲۳ روپے کے برابر بِل آیا۔ سوٹ کی ڈرائی کلیننگ کے ۴۸ روپے ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ ذرا شوقین یعنی تھری پیس پہننے والے ہیں تو ۴۰ روپے دیجیے۔ ٹائی پانچ

روپے میں ڈرائی کلین ہوتی ہے اور ٹائی پر استری دو روپے میں کرائی جاسکتی ہے۔۔۔ یاد رہے کہ یہ ٹوکیو کا سب سے بڑا ہوٹل نہیں ہے۔ اچھا ہے۔ لیکن اس سے بھی اچھے اور ہیں۔ یہ نیا ہے اور مرکز شہر سے کُچھ دور ہے لہٰذا نسبتاً سستا ہے۔ پھر یونیسکو کے مہمانوں کے لئے یہ خاص رعایت بھی کرتے ہیں۔ غالباً ۲۵ یا ۳۰ فیصد۔ پھر بھی رعایتی کرایہ ایک سو اسّی روپے روز ہے۔ خست کر کے بغیر انڈے کا ناشتہ جو ہم لیتے ہیں، کم از کم بیس روپے کا ہوتا ہے۔ ٹوکیو سے گردن پھیر کر اپنے ملک کی طرف ہم دیکھتے ہیں تو ہر چیز سستی لگتی ہے۔

بس یا ٹیکسی کے لئے قطار لگانے کا جنوں انگلستان میں تو ایسا ہے کہ مشہور ہے ایک آدمی ہو تو بھی قطار بناتا ہے۔ ٹوکیو میں بھی قطار بنتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لمبی خوبصورت قطار بن جاتی ہے۔ لیکن جُونہی بس آتی ہے سب سلیقہ بھول قطار توڑ اس پر پہلے سوار ہونے کے لئے پل پڑتے ہیں۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ کُچھ نہ کُچھ تو مشرقیت کی روح اِن لوگوں میں باقی ہے۔ بالکل کرسٹان نہیں ہو گئے۔

تم آؤ گے تو کیا لاؤ گے، ہم آئے تو کیا دو گے؟

تحفے دینے دِلانے کی رسم ہمارے ہاں بھی ہے اور پرانی ہے۔ کسی کے ہاں گئے تو لڈّو لیتے گئے۔ اس سے تعلقات میں مٹھاس پیدا ہوتی ہے اور ازاں بعد آپ جب تک چاہیں مہمان ٹھہر سکتے ہیں۔ ویسے اس میں جتنا گُڑ اتنا میٹھا کا اصول ہے۔ بیچ میں میزبان کی نگاہیں بدلتی نظر آئیں تو مزید لڈّو لے جایئے۔ اس پنجابی ٹپّے کا کُچھ خیال نہ کیجیے کہ:

کچّی یاری لڈّواں دی

لڈّو مُک گئے، یارانے ٹُٹ گئے

کسی بچّے کے ہاتھ میں نقد بھی تھمانے کا رواج ہے۔ کبھی کبھی بڑوں کے ہاتھ میں بھی نقد تھمانے کا موقع آتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ کوئی اہلکار ہو اور اس سے کوئی کام اٹکا ہوا ہو۔ بعض لوگ اسے کچھ اور نام بھی دیتے ہیں۔ لیکن میاں، آزاد لوگوں کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ ہم تو اسے تحفہ ہی گردانیں گے۔ چیز کو دیکھنا چاہیے۔ نیّت کو نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس کا حال صرف خُدا جانتا ہے۔ عید پر ہمسایوں کو سویّاں بھیجتے ہیں تا کہ وہ ہمیں شیر خُرما بھیجے۔ بقر عید پر چھانٹ چھانٹ کر بوٹیاں بھیجتے ہیں۔ چھانٹتے اس لئے ہیں کہ کوئی کام کی بوٹی کسی کے ہاں نہ چلی جائے۔ ہاں اہلِ مغرب کے ہاں بھی تحفہ دینے دلانے کی رسم ہے، لیکن روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں۔ کرسمس پر تحفوں کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ ورنہ آپ نے کوئی چیز دی اور انہوں نے تھینک یو کہہ کر رکھ لی۔

وصل کی صُبح پہلوئے بُت سے

اُٹھ گئے یار تھینک یو کہہ کر

ظالم یہ تک نہیں کہتے کہ ارے صاحب، کیوں تکلّف کیا اس کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن جاپانیوں کے لئے تحفہ کی رسم طرزِ حیات ہے بلکہ بمنزلہ مذہب کے ہے۔ ان کی ساری عمر اس شُغلِ عزیز میں گزرتی ہے اور بعض لوگ تو اس چکر میں دیوالیہ بھی ہو جاتے ہیں، یا ہانک لگاتے سنائی دیتے ہیں۔

میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا

ابتدا اس کی معمولی ہوتی ہے کہ آپ نے رومال تحفہ میں دیا انہوں نے جواب میں ٹائی پیش کی۔ اگلی بار ٹائی سے زیادہ قیمت کی کوئی چیز دیں گے۔ مثلاً واسکٹ اور جواب میں آپ کو سوٹ ملے گا۔ اب اس سوٹ کو آنک کر اگلی بار یا تو سونے کا کنٹھا پیش کیجیے یا شہر چھوڑ جایئے۔ اس صورتِ حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بیچ میں کوئی بہانہ نکال کر تعلقات خراب کر لیجیے۔ تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں۔

تحفہ کے بارے میں ہمارا اپنا اصول وہ ہے جو پنڈت کیفی دہلوی نے اپنے ایک مصرعہ میں بیان کیا ہے۔

تم آؤ گے تو کیا لاؤ گے۔۔۔۔۔ہم آئے تو کیا دو گے؟

پس جب جاپانی دوستوں سے ہمارا ربط ضبط شروع ہوا یعنی ان میں سے کُچھ اصحاب آج سے سات سال پہلے ہمارے ہاں آئے تو دو تین تحفے بھی لائے۔ ہم نے رکھ لئے کہ ہاں بھئی ان کا فرض تھا۔ اتنی دور سے آئے ہیں تو کیا تحفے بھی نہ لاتے؟ تھینک یو بھی کہا یا نہیں۔ یہ ہمیں یاد نہیں کیونکہ خاصی پرانی بات ہے۔ پھر ہم جاپان گئے تو سلام، محبّت اور خیر سگالی کے جذبات تو ہمارے پاس وافر تھے، اسبابِ دنیوی میں سے کوئی چیز بطور تحفہ ساتھ نہ تھی۔ بایں ہمہ انہوں نے ہمیں رخصت کیا تو کچھ دے دلا کر کیا۔ بے شک اُن کی وضعداری اُن کے ساتھ، ہماری وضعداری اور پنڈت کیفی کا شعر ہمارے ساتھ، تاہم دوبارہ جانا ہوا تو ہم نے بھی سب کے لئے کُچھ نہ کُچھ خریدا اور پیش کیا۔

جاپانی مادّہ پرست لوگ ہیں اس لئے ان کے تحفے بھی مادّی قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی تصویر دے دی، کوئی سکارف دے دیا، کوئی ریڈیو دے دیا۔ کوئی دِن میں یہ چیزیں پھوٹ کر یا گھِس گھِسا کر برابر ہو جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم روحانیت اور جذبات کی دولت سے مالا مال ہیں اس لئے کسی کو کم سے کم تحفہ بھی دیتے ہیں تو دل دیتے ہیں: ع

لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں، کیا یاد کرو گے

یا پھر جان ہے۔ جس کو دیکھو قوم کے لئے جان قربان کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ صاحب جان اپنے پاس رکھو، کوئی روپیہ دھیلا دے دو تو سخن دریں ست کہ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے اسے کیسے دیں۔ شروع میں ہم نے بھی جاپانیوں کو تحفے میں دِل و جان ہی پیش کئے تھے، لیکن دیکھا کہ اس کی کما حقہ قدر نہیں بلکہ گمان ہوا کہ اسے ہماری خست پر معمول کیا جا رہا ہے تو مرتبان اور تھال وغیرہ خریدنے پڑے۔ اس لحاظ سے ہمارا ملک اچھا ہے۔ دل و جان سے کام چل جاتا ہے۔ بلکہ شاعروں اور عشق پیشہ لوگ تو اپنے ساتھ دِلوں کی پوٹلی رکھتے ہیں۔ جہاں اچھی صورت دیکھی ایک نکال کر اُدھر پھینکی۔ لینے والا بھی خوش، دینے والا بھی خوش۔ پیسے الگ بچے۔ ہم چونکہ مصنّف بھی ہیں کبھی کبھی دِل کے ساتھ کتاب بھی نذر کر دیتے ہیں۔ اس میں ہمارا فائدہ یہ ہے کہ کتاب کا ایڈیشن نکل جاتا ہے۔ ہماری ساری کتابوں کا پہلا ایڈیشن اسی طرح تو نکلا ہے۔ کتابیں خریدتا کون ہے؟

ایک شکایت ہمیں اپنے ملک والوں سے بھی ہے۔ سبھی مہذب ملکوں میں دستور ہے کہ تحفہ دیتے ہیں تو سلیقے سے باندھ کے دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو اتنی خوبصورت پیکنگ ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے تحفہ پھینک دیجیے، ڈبّہ رکھ لیجیے۔ طرح طرح کے

ڈبّے، لفافے، ڈوریاں، فیتے، پات پھول۔ ایک سے ایک دیدہ زیب۔ وہاں اس بات کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے کہ کاغذ کو کیسے تہہ کیا جائے، فیتے کا رنگ کیا ہوا، اس کو گرہ کس طرح دی جائے۔ خاصا علم دریاؤ ہے۔ سلیقے کی انتہا ہے۔ ادھر ہم اپنی اسمال انڈسٹری کی ہینڈی کرافٹ شاپ میں جاتے ہیں تو سلیز مین دانت نکال دیتا ہے کہ صاحب یونہی جیب میں ڈال لیجیے، ورنہ یہ لیجیے براؤن کاغذ کا لفافہ ہے، اس میں ڈال لیجیے یا آج کے اخبار میں باندھے دیتے ہیں۔ اس میں آپ کا کالم بھی ہے۔ جس کے پاس تحفہ جائے گا اس بہانے آپ کا کالم بھی پڑھ لے گا۔

اب کے جو ہم گئے تو ہماری طبیعت بہت جھجھلائی۔ ہم نے ان لوگوں کو بہت سخت سست کہا کہ کئی بار لکھ کر شکایت کی ہے پھر بھی یہ حال ہے۔ جواب ملا کہ صاحب ہمارے افسران بہت کفایت شعار ہیں۔ کہتے ہیں کہ خوبصورت کاغذ اور ڈبّہ دیں تو لاگت بڑھ جائے گی۔ ہم نے کہا: حضرات روپیہ دو روپیہ زیادہ ہو جائیں تو مضائقہ نہیں۔ یہ دُکانیں ٹورسٹوں کے لئے ہیں۔ غریب غربا یہاں نہیں آتے۔ جو شخص پچاس روپے کی چیز لے گا، وہ دو روپے اوپر بھی دے دے گا۔ ہم ٹورزم کے محکمے کو دہائی دیتے ہیں کہ صاحبو یہ نکتہ سمجھو اور سمجھاؤ۔ تحفے کے ساتھ پیکنگ اچھی ہو تو لینے والے کا جی خوش ہوتا ہے۔ اور دینے والے کی عزّت رہ جاتی ہے۔ ہم نے ائیر پورٹ

کی دُکان سے یہ چیزیں خریدیں تو ایسے ہی ننگی بُوچی ملیں۔ بعض اوقات تو ان کے پاس براؤن کاغذ کا لفافہ بھی نہیں ہوتا۔

تحفہ لے کر شکریہ ادا کرنے کے آداب بھی جاپانیوں سے سیکھنے چاہئیں۔ وہ کھول کے نہ دیکھیں تب بھی کہیں گے کہ صاحب بہت عمدہ ہے۔ کمال کی چیز ہے۔ کوئی کھانے کی چیز پیش کیجیے تو اسے چکھنے سے پہلے ہی آپ کا جاپانی دوست رطب اللسان ہو جائے گا کہ صاحب بہت لذیذ ہے۔ بہت مزے کی ہے۔

لاتے ہیں سرور اوّل، پیتے ہیں شراب آخر
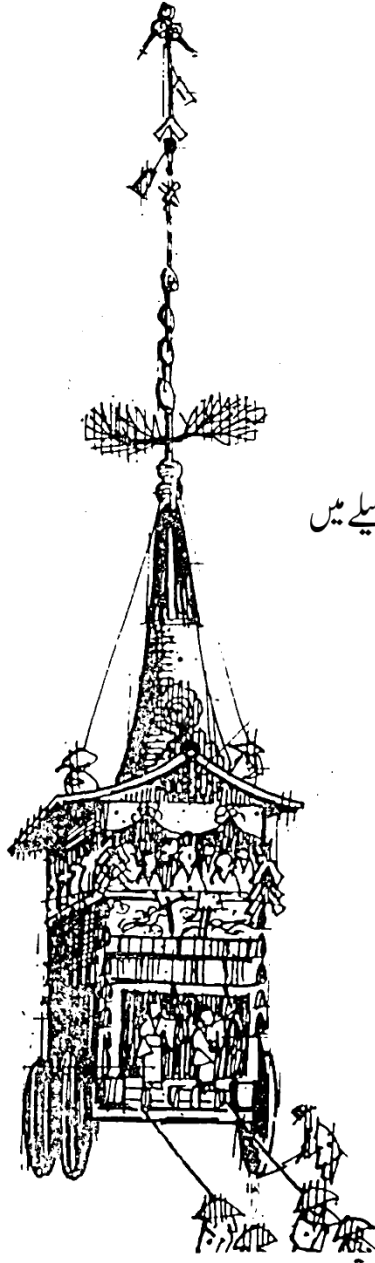
کیوٹو کے میلے میں

جاپان کشفیؔ صاحب کا

ہمارے دوست پروفیسر ابو الخیر کشفیؔ جو اوساکا میں پڑھاتے تھے، پاکستان واپس تشریف لے آئے ہیں۔ جاپان میں وہ کئی چیزیں پڑھاتے تھے۔ طالبِ علموں کو اُردُو اور اسلامیات اور باقی جاپانیوں کو پٹّی، پاکستان کی پٹّی۔۔۔ سُنا ہے پڑھانے کی مد میں ان لوگوں کے نکاح بھی پڑھا دیتے تھے جن کو کوبے کے امامِ مسجد مایوس کر کے واپس بھیج دیتے تھے۔ اشاعت اسلام سے کوبے کے امامِ مسجد کو بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کشفی صاحب کو ہے۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ جو شخص میرے دستِ حق

پرست پر اس جمعے کو اسلام قبول کرتا ہے، اگلے جمعے سہرا باندھ کے آتا ہے کہ حضرت اب نکاح بھی پڑھادیجیے۔ ان لوگوں کو مسلمان کرنے کا کیا فائدہ؟

جاپانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود بھی سچ بولتے ہیں، دوسروں کو بھی سچّا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ میں جارج پنجم کا داماد ہوں تو بھی مان لیں گے، بلکہ فوراً بازار سے تحفہ لینے دوڑیں گے۔۔۔ پچھلے دِنوں ایک صاحب ان کے پاس گئے کہ حضرت مولانا! مُجھے اسلام کے دائرے میں داخل کر لیجیے، بے حد ممنون ہوں گا۔ انہوں نے کہا۔ بسم اللہ لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مسلمان کیوں ہونا چاہتے ہو؟ کوئی اور ہوتا تو اسلام کی وحدانیت اور حقانیت کی بات کرتا۔ عاقبت کی فلاح کا ذکر درمیان لاتا۔ لیکن ان صاحب نے کہا کہ حضرت مجھے میری کمپنی بزنس کے لئے سعودی عرب بھیج رہی ہے۔ وہاں خاصے دِن رہنا ہو گا۔ میں مسلمان ہو جاؤں تو آسانی رہے گی۔۔۔ امامِ مسجد نے انکار کر دیا اور یوں جاپان میں فرزندانِ اسلام میں ایک کا اضافہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کل کشفی صاحب کراچی کے جاپان سینٹر میں اپنے سہ سالہ قیامِ جاپان کے تجربات پر گفتگو کر رہے تھے۔ اہلِ ذوق کا بہت بڑا مجمع تھا۔ خواتین بھی بہ تعدادِ کثیر تھیں۔ لہٰذا بعض بد گُمانوں کو گمان ہوا کہ کشفی صاحب صرف گفتنی کو درج گزٹ کر رہے ہیں۔ اپنے احوال و اشغال کی پوری تصویر نہیں

کھینچ رہے۔ یہ لوگ منتظر تھے کہ اب ذکر گیشاؤں کا آتا ہے، نائٹ کلبوں کے اسرارِ نہاں فاش ہوتے ہیں، ساکی اور ساقی کی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ بعضے تو رال ٹپکانے کے لئے گلے میں بِب باندھ کر بھی آئے تھے۔ لیکن نہ ہوا۔ ہم یقین دِلاتے ہیں کہ انہوں نے کُچھ چھُپا کر نہیں رکھا۔ ہمارے دوست ہونے کے باوجود نیک معاش آدمی ہیں۔ اوساکا میں ہم ان کے گھر فروکش رہے۔ ہم جتنے دِن وہاں رہے وہ خود نماز پڑھتے رہے اور ہمیں دال اور بھنڈیاں کھلاتے رہے۔ ایک روز ہم نے مشتاق احمد یوسفی کا قول نقل کیا کہ چند دِن متواتر ویشنو بھوجن کرتے رہیں یعنی دال اور سبزی کھائیں، تو ہمارا اسلام پر اعتقاد کمزور ہونے لگتا ہے اور ہندو ہونے کی سوچنے لگتے ہیں۔ اگرچہ فقہ کی کتابوں میں نہیں آیا لیکن اسلام کا چھٹا رُکن گوشت خوری ہے۔ ہماری یہ بات سن کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔ بولے بازار میں جو گوشت ہوتا ہے وہ ذبیحہ نہیں ہوتا۔ اس پر اللہ اکبر اور بسم اللہ وغیرہ نہیں پڑھی ہوتی۔ لہٰذا میں نہیں کھاتا۔ کوبے میں ضرور حلال گوشت ملتا ہے لیکن کوبے کوئی تیس میل کی مسافت پر ہے۔ ہمارا خیال ہے وہ بھنڈی کی گردن کاٹتے وقت بھی تکبیر پڑھتے ہیں۔۔۔ ویسے بھنڈی وہاں یہاں کے گوشت سے بھی مہنگی ہے۔ ایک روپے کی ایک بھنڈی سمجھیے۔ ہم نے قیمت سُن کر اس کو گوشت سمجھ کے کھانا شروع کیا تب کہیں اسلام کا

تھوڑا سا نور ہم میں واپس آیا۔ زیادہ تردّد تو خیر ہم بھی نہیں کرتے اور ہمارے ہاں بھی مسلمانی در گور رہتی ہے۔ لیکن دوسری قوموں کے ہاں تو مذہب نرا تبرّک ہے۔ کُچھ جنتر منتر، کچھ شادی اور تجہیز و تکفین کے آداب۔ تھوڑا سا دُھندلا سا، موہوم سا اللہ میاں۔ جاپان کی کل آبادی نو دس کروڑ ہے۔ ایک صاحب نے کشفی صاحب سے سوال کیا کہ اس میں سے بودھ کتنے ہیں اور شنتو کتنے ہیں؟ کشفی صاحب نے کہا کہ نو دس کروڑ بودھ سمجھ لیجیے، اور نو دس کروڑ ہی شنتو۔ شنتو ان کا پرانا مذہب ہے۔ بودھ ہو کر بھی اس سے مروّت کا رشتہ وہ ایسا ہی رکھتے ہیں جیسی مرزا غالبؔ نے تمنّا کی تھی:

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو

ہم کو بھی پوچھتے جو رہو کیا گناہ ہو

ہمارے ہاں بھی ایک بنئے کا قصّہ مشہور ہے کہ مسلمان ہو گیا تھا لیکن کوئی بُت نظر آئے تو اس کو بھی ماتھا ٹیک لیتا تھا۔ کسی نے کہا یہ کیا دو عملی ہے؟ فرمایا۔ کیا ہرج ہے۔ ہم صلح کُل بیوپاری آدمی ہیں۔ تعلّقات کسی سے خراب نہیں رکھنے چاہئیں۔ کیا پتہ کل ان سے کام پڑ جائے۔

کیوٹو میں ہم نے لکھنو کا محرم الحرام بھی دیکھا۔ یہ بات۔۔۔ چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا کی سی نہیں ہے۔ نہ ع

کوا اندھیری رات میں دِن بھر اڑا کیا

کا لطیفہ ہے۔ ۱۶ جولائی کو کیوٹو شہر میں جس میلے کا آغاز ہوتا ہے اسے کہتے تو گیون متسوری ہیں لیکن ہمیں رتن ناتھ سرشار یار آئے اور لکھنؤ کے محرم الحرام کے باب میں ان کا بیان یاد آیا۔ میاں آزاد اپنی ترنگ میں ادھر جا نکلے تو دیکھتے ہیں وہ بھیڑ وہ ریل پیل کہ عیاذاباللہ۔ تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے شانے سے شانہ چھلتا ہوا۔۔۔ جب بعد خرابی بصرہ، کہیں گزر پائے تو ضیق النفس ہو جائے۔ یہاں وہی دھوم دھام تھی، وہی اژدہام تھا۔ ع

مشتاقِ سخن خلق چلی آتی ہے

آپ ہجوم میں ایک بار پھنس گئے تو سمجھیے کہ فٹ ہو گئے۔ اِدھر اُدھر ہلنا ناممکن۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تعزیے بھی کھڑے تھے۔ صاحبو! ان تعزیوں کا سلسلہ عزّاداری سے نہ ہم ملاتے ہیں نہ تم ملانا۔ ان لوگوں کو سبھی غم ہیں، غمِ حسین کے سوا۔ یہ دو منزلہ کھٹولے ہوتے ہیں۔ زرق برق کاغذوں اور جھنڈیوں سے آراستہ،

ان کو کاندھوں پر اٹھاتے ہیں، ریڑھیوں پر گھماتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں۔ لوگ نذریں بھی دیتے ہیں اور پھر ان کو ایک خانقاہ میں لے جا کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہماری تو ہِمّت نہ ہوئی۔ ہمارے ساتھی مع کشفی صاحب کے قطار میں لگ کر ان کے اوپر گئے جہاں کچھ ناؤ نوش، باجے گاجے کا سامان بھی تھا۔ ان لوگوں نے پیسے نذر کئے اور تبرک پایا۔ کچھ آپ کھایا کچھ ہمیں چکھایا۔۔۔ یہاں کئی درگاہیں ہیں۔ لیکن سامنے سڑک کے اُس سرے پر جو خانقاہ ہے۔ لوگ یہاں آتے ہیں۔ درختوں پیڑوں کی شاخوں سے تعویذ باندھتے ہیں۔ مرادیں مانگتے ہیں۔ منتیں مانتے ہیں۔ مکھانے خریدتے ہیں۔ کچھ چڑھاتے ہیں، کچھ تقسیم کرتے ہیں۔ یہ میلہ کئی روز کا ہے اور اس کی بڑی پرانی تاریخ ہے۔ لیکن ہم تاریخ کے آدمی نہیں ہیں۔ اتنا بتا دیں کہ بات صدیوں پرانی ہے۔ اس شہرِ غدّار میں کہ ٹوکیو سے پہلے یہی دارالحکومت تھا، بلکہ گزشتہ صدی تک رہا، ایک بار طاعون کی وبا پھیلی۔ صفایا ہو گیا۔ لوگوں نے ردِّ بلا کے لئے جنتر منتر پڑھے۔ گنڈے تعویذ کئے اور یہ کھٹولے تیّار کئے۔ القصّہ جہاں تک روحانیت اور ڈھلمل یقینی کا تعلق ہے، یہ ٹرانزسٹر اور کمپیوٹر بنانے والے کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت۔ جاپانیوں کا مشینوں پر اتنا انحصار ہے کہ ہر چیز انہی سے کرتے ہیں، بلکہ ان

کے بغیر نہیں کر سکتے۔ اگر کسی جاپانی سے کہیں کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو وہ کہے گا کہ کمپیوٹر لاؤ اس پر حساب کرتا ہوں۔ اس کے بغیر کیسے بتا سکتا ہوں۔ خود کشفی صاحب بھی ان کی صحبت میں ایسے ہی ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب نے پوچھا آپ جاپان میں کتنے سال رہے۔ انہوں نے جیبی کمپیوٹر نکال کر ۱۹۷۳ء میں سے ۱۹۷۰ء کو منہا کیا اور جواب دیا۔ "تین سال۔"

ہمارے کشفی صاحب نے تو وہاں جاپانی زبان میں زیادہ کمال نہیں پیدا کیا۔ ہاں ان کے بیٹے عاکف خوب فَر فَر بولتے تھے۔ عاکف نے ہمیں نارا دکھایا۔ جاپان کا قدیم ترین دارالحکومت۔ اس کے پرانے مندروں کی سیر کرائی۔ نارا کے غزالوں میں گھمایا اور ڈریم لینڈ پھرایا۔ یہ ایک جگہ ڈزنی لینڈ کے نمونے کی نارا شہر میں ہے جس کے مختلف حصّے ہیں۔ جنگل لینڈ، ایڈونچر لینڈ اور نا جانے کیا کیا لینڈ۔ ایک مونو ریل بھی ایک مصنوعی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھتی ہے اُترتی ہے۔ زوں کر کے برق رفتاری سے فراز سے نشیب میں آتی ہے تو خوف کے مارے آنکھیں کھُلی رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس عزیز کی خاطر بیٹھ گئے اور عاکف میاں کے ہاتھ بھی ہماری کمر میں حمائل تھے، لیکن یہ لگتا تھا کہ اب گرے، اب ہمارے پرخچے اُڑے۔ ہم نے کہا خداوندا! اب کے جان بچائیو، آئندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔ واقعی نہ کریں گے۔ کشفی

صاحب کا محلّہ دیکھا جہاں سے وہ ناشتہ لیتے تھے، جہاں سے پھل لیتے تھے، سبزی لیتے تھے، جہاں سے جوتا گھٹاتے تھے۔ بالکل ہمارے ہاں کا قصباتی ماحول تھا اور دُعا سلام کے قصباتی تعلّقات تھے۔ اور غیر شہری قصباتی خلوص۔ بڑی ہی محبّت کے لوگ تھے۔ کشفی صاحب کے السنہ خارجہ کے انسٹیٹیوٹ میں پروفیسر کان گگایا سے ملنے گئے جو اُردُو کے عالم اور فارسی کے فاضل تھے۔ ان کا کام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہیں ایک مہاشہ جی ملے، ہم سے برج بھاشا باتیں کرتے رہے، بعد میں پتہ چلا یہ بھی جاپانی ہیں، ہندی پڑھاتے ہیں۔ ٹوکیو میں اُردُو ہمارے دوست سوزکی تاکیشی پڑھاتے ہیں۔ یہ واقعی پروفیسر ساوا اور پروفیسر گامو کی روایات کے وارث ہیں۔ یہاں کراچی یونیورسٹی میں پڑھے ہیں۔ پروفیسر سوزوکی اور کان گگایا نے ہمارے ادب کو ان نئے نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ جن کی ابھی تک ہمیں توفیق نہیں ہوئی۔

جاپان (۳)

جنوری ۱۹۷۴ء

JAL
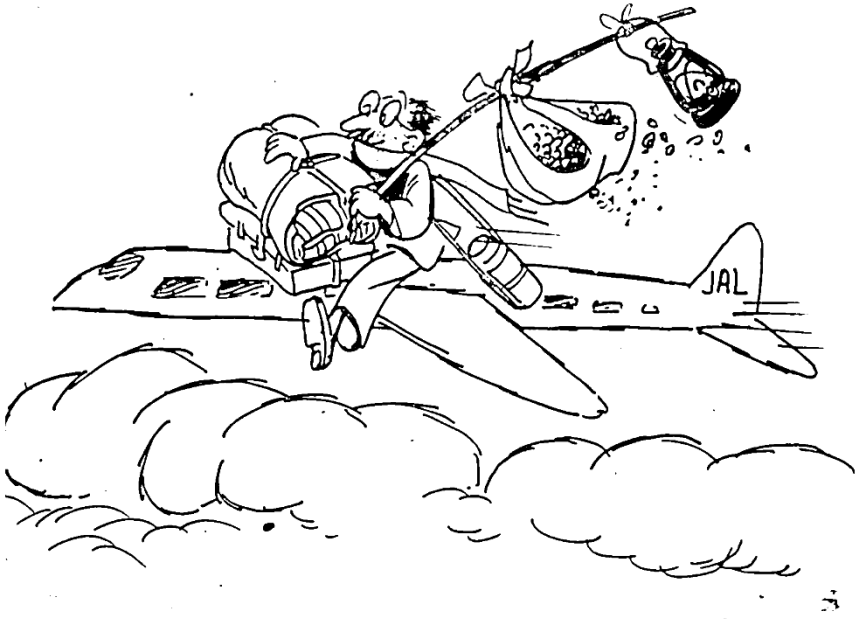
جاپان جایئے تو لالٹین لے کے جایئے

جب کبھی ہم سفر پر نکلتے ہیں تو کچھ لوگ ہمیں آشیر واد دیتے ہیں کہ جہاں رہو خوش رہو، کچھ اپنے عزیزوں کے نام اس قسم کے خط دیتے ہیں کہ ”عزیزی انعام الحق طالعمرہ، حامل رقعہ ہذا اپنے ہی آدمی ہیں۔ ان کے ہاتھ چار سیر اچار آم کا اور سیر بھر مونگ پھلی تمہارے لئے بھیج رہا ہوں۔ واپسی میں دو تھان جارجٹ کے، تین گھڑیاں اور ایک استری بجلی کی بھیج دینا۔ اور ہاں اپنے قیام و طعام کا بندوبست یہ ٹوکیو میں خود کریں گے، تم کو تردّد کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کچھ دِلاسا دیتے ہیں کہ

دیکھنا گھبرانا نہیں۔ جہاز کی سیٹ پر بیٹھ کر پیٹی ضرور باندھ لینا۔ اور اللہ ہو، اللہ ہو، کی ضربیں لگاتے جانا۔۔۔ آج کل جہاز بہت گر کر تباہ ہو رہے ہیں۔ لیکن موت سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

چُو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اب کے جو ہم چلے تو عالی صاحب شہر میں نہ تھے، حج پر گئے ہوئے تھے۔ ع

وہ دیکھیں گے گھر خدا کا

ہم خدا کی شان دیکھیں گے

ہم ان کی سعادت پر رشک اور اپنی دنیاداری پر نفرین کر رہے تھے کہ موقع دیکھ کر دوسرے ناصحانِ مُشفق نے گھیر لیا کہ جاتے ہو کس طرف کو کِدھر کا خیال ہے۔ اتّفاق سے اب کے مشوروں کی گنجائش بھی زیادہ تھی کیونکہ تیل کا توڑا یعنی انرجی کا کرائسس چل رہا ہے۔

ایک صاحب نے کہا۔۔۔ اے میاں! لحاف رکھ لیا ہے کپڑوں میں؟ ہم نے کہا۔ وہ کا

ہے کو؟ ہمیں تو ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔ وہاں کمبل لحاف کا بندوبست ہوتا ہے۔ فرمایا وہ کافی نہیں رہے گا۔ میری مانو تو ایک کانگڑی بھی گلے میں لٹکالو اور ہفتے بھر کے لیے کوئلے پوٹلی میں باندھ لو۔ میں سری نگر میں گلے میں کانگڑی لٹکائے رہتا تھا، سردی پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ ہم نے کہا "اے صاحب! پہلے تو ٹوکیو میں کمروں کو خوب گرم رکھتے تھے، اب بھی کچھ نہ کچھ تو رکھیں گے ہی۔"

بولے۔ "میرے ایک جاننے والے کے جاننے والے کے جاننے والے پچھلے دِنوں ٹوکیو سے آئے ہیں۔ وہ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ہوٹل والے سرِ شام مسافروں کو کمروں سے نکال دیتے تھے کہ باہر جا کر لکڑیاں یا درختوں کی ٹہنیاں اکٹھی کر کے لاؤ۔ اپنے کمرے گرم کرنے کے لیے بھی اور ہمارے باورچی خانے کے لیے بھی۔ ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔ ایک کرم فرما تو لالٹین بھی اٹھالائے کہ آج کل جاپان میں بجلی کی کفایت کا حکم ہے، اسے لے جاؤ، ورنہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھروگے۔ تیل ڈلوادوں یا ڈلوالوگے۔"

ہم نے یہ مشورے نہیں مانے اور خوش خوش جہاز میں جا بیٹھے۔ وہاں ہمارا وہی حال ہوا جو بزرگوں کے مشورے نہ ماننے والوں کا ہوتا ہے۔ اے صاحبو! ٹوکیو کے ہوائی اڈّے پر روشنی کی رونق خاصی تھی۔ لیکن جب شہر کو چلے تو افسوس ہوا کہ ان

بزرگ کی لالٹین کیوں نہ لے لی۔ ہوٹل تلاش کرنے میں بھی خاصی دقّت ہوئی۔ کیونکہ اس کے نام کی روشنیاں تک گُل کر دی گئی تھیں۔ ہم تو ماننے کو تیّار ہی نہ تھے کہ یہ ہوٹل ہے۔ لیکن ہمارے دوست امان اللہ سردار ٹوکیو ہی میں رہتے ہیں، انہوں نے اس کا دروازہ دریافت کر ہی لیا۔ رات کو جب ہوٹل میں سردی لگی اور بخار ہوا تو کانگڑی والے بزرگ بھی یاد آئے۔ وہ بات البتّہ مبالغے سے خالی نہ تھی کہ مسافروں کو لکڑیاں چننے کیلئے بھیج دیا جاتا ہے۔ کم از کم ہمارے ساتھ یہ نہیں ہوا۔

آکاساکا پرنس ہوٹل۔۔۔ بارے ہوٹل کا کُچھ بیان ہو جائے۔ ہوٹل کیا ہے، بھول بھلیّوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ خاصی پرانی چیز ہے۔ ہم اپنا نام درج کرا کے پہلے غلام گردش میں گئے۔ وہاں سے داہنے ہاتھ دوسری میں مُڑے۔ اس کے بعد یک لخت ایک بہت پتلا سا نشیبی راستہ آ گیا۔ اس میں جا کر آگے دو بار بائیں ہاتھ اور ایک بار داہنے ہاتھ مڑے تو ۱۱۷ نمبر کا کمرہ آیا۔ بیرے نے کہا اے جناب! بھلے وقتوں میں یہ شاہ کوریا کا محل ہوا کرتا تھا۔ آج کل ہوٹل ہے۔ اب یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ سامنے کے حصّے میں جہاں پناہ رہتے ہوں گے اور اس کمرہ ۱۱۷ میں اپنے ہاں کے اپوزیشن لیڈروں کو الٹا لٹکا کر اُن کی مومیائی نکالتے ہوں گے۔ اوپر چھت میں ایک کنڈا بھی تھا۔ ہمیں رات بھر وحشت ناک خواب آتے رہے کہ اُلٹے لٹکے ہیں اور

ٹپ ٹپ مومیائی نکل رہی ہے۔ چونکہ یہ زمانہ جمہوریت کا اور عوام کا زمانہ ہے، لہٰذا ہوٹل بنانے کے بعد اس کا ماحول غریبانہ کر دیا گیا ہے۔ تاہم شاہی کی رعایت کُچھ نہ کُچھ اب بھی موجود ہے۔ مثلاً قیمتیں شاہانہ ہیں۔ کوکا کولا پانچ روپے کا۔ چائے کی پیالی تیرہ روپے کی۔ دو ایک روز بیماری کی وجہ سے ہم کھانا کھانے کے قابل نہ تھے، اس لیے روم سروس کو فون کیا کہ ایک پیالہ چکن سوپ کا بھیجو۔ فرمایا نہیں ہے۔ ہم نے کہا، ٹماٹو سوپ سہی۔ ارے کُچھ تو پیٹ میں جائے۔ اس سے بھی انکار ہوا۔ ہم نے کہا اچھا جو دال دلیا ہے وہ بھیج دو۔ انہوں نے پانی گرم کر کے نمک ڈال کے بھیج دیا کہ صاحب ہاٹ کنسومے سوپ حاضر ہے۔ ناچار نوشِ جان کیا۔ اس کا بل تھا ۵۰۰ ین جمع ۵۰ ین سروس، ۵۰ ین ٹیکس۔ کل ۶۰۰ ین۔۔۔ یعنی ہمارے بیس روپے۔ یہاں ہوٹل کے کمرے کے داموں پر تو سروس چارج لگاتے ہی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک اور چیز ہے۔ گریجویٹی ٹیکس، یعنی اللہ کے نام کی خیرات۔ یہاں ہمیں اس تقریب سے اتنی خیرات کرنی پڑی کہ خود خیرات مانگنے کے قابل ہو گئے۔ یہ حال تو دوسرے درجے کے ایک چھوٹے ہوٹل کا ہے، بڑے ہوٹلوں کی باتیں اور بڑی ہوں گی۔

ہمارے اس کمرے کے اندر انگریزی میں جو نوٹس ہے، معلوم نہیں وہ شاہ کوریا

جاتے ہوئے لگا گئے تھے یا بعد میں ہوٹل والوں نے لگایا ہے۔ بہر حال اسے پڑھ کر ہم بہت گھبرائے۔ پہلی نظر میں مطلب یہی سمجھ میں آیا کہ یہاں ہم کو بند کر کے تالا لگا دیا جائے گا اور دریں اثنا دوسرے مہمانوں یعنی ہوٹل کے مسافروں کو آگ میں بھونا جائے گا۔ آگ سے بچنے کے لیے ہوٹل کے عملے کو خود کِس راستے سے بھاگنا چاہیے، اس کے دریافت کرنے کی ذمّہ داری بھی ہوٹل والوں نے ہم پر ڈال دی تھی۔ اس میں کچھ قصور ہماری فہم کا بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ لیکن اصل عبارت آپ خود ہی ملاحظہ فرما کر منصفی کیجیے۔

You should be locked the door even if you are in the room or out of it especially in bed. And for the other guest special care will be required by a fire. Ask and .confirm yourself the position of fire exit for room staff
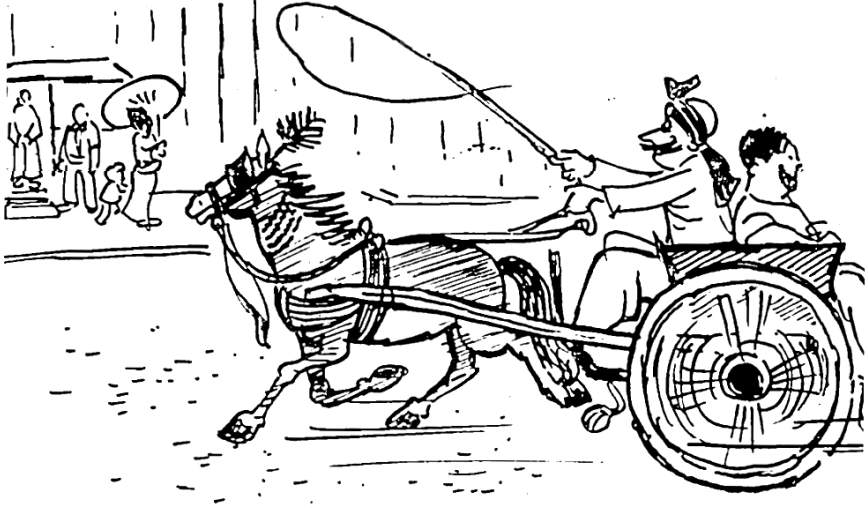
اب گھوڑوں کی ضرورت ہے

ہم نے پچھلی بار جاپان سے آ کر ایک مضمون لکھا تھا کہ "ضرورت ہے جاپان کے لیے ایک گدھے کی" اس پر ہمیں بہت سے خط آئے کہ ہم بالکل گدھے ہیں ہمیں جاپان بجھوا دیجیے۔ ہمیں وضاحت کرنی پڑی کہ صاحبو! گدھے مت بنو۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو، وہاں تمہاری نہیں بلکہ سچ مچ کے گدھے کی، یعنی جانور کی ضرورت ہے۔ چڑیا گھر کے لیے۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ جاپانی بچّے چڑیا گھر میں گدھا دیکھیں گے، اور اُن کو معلوم ہو گا کہ یہ پاکستان سے آیا ہے تو وہ اس رشتے سے پاکستان سے

بھی متعارف ہوں گے، اور پاکستان جاپان دوستی کا راستہ کھلے گا۔ لیکن ہمارے ہاں کے لوگوں نے ہچر مچر کی اور کہا کہ اونٹ منگوالو، بکرا منگوالو، کُچھ اور منگوالو، گدھے پر اصرار مت کرو۔ جاپان والے بہت مایوس ہوئے، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب ان کے پاس اتنے گدھے ہیں تو ایک ہمیں دینے میں کیا حرج ہے۔ بہرحال مژدہ ہو کہ اسپین نے گدھا بھیج دیا اور پاکستان کی گلو خلاصی ہو گئی ہے۔ اب یہ فرمائش ہے کہ گھوڑا بھیجو، بلکہ گھوڑے۔۔۔ چلئے کچھ ترقّی تو ہوئی، گدھے سے گھوڑے پر تو آئے۔ جاپان میں آدمی زیادہ ہیں اور رقبہ کم ہے۔ چپّے چپّے کو کام میں لانا چاہتے ہیں۔ بعض پہاڑی ڈھلانیں وہاں افتادہ پڑی ہیں جہاں مشینی سواریوں کے جانے کا کام نہیں۔ گھوڑے درکار ہوں گے۔ پس جاپان کے ایک ادارے نے ہمارے نمائندوں سے کہا کہ دس ہزار گھوڑے لاؤ اور منہ مانگے دام پاؤ۔ گھوڑوں سے ہمارے آباؤ اجداد کو نسبتِ خاص رہی ہے۔ بحرِ ظُلمات تک میں گھوڑے دوڑا دیے تھے، ڈوب جائیں تب بھی ہرج کی بات نہ تھی۔ وسط ایشیا سے مزید آجاتے تھے۔ گھوڑوں کی دُمیں پکڑے پکڑے ہندوستان آئے اور یہاں نہ صرف سلطنتیں قائم کیں بلکہ گھوڑوں اور گھڑ سواروں کے بل پر خوش اسلوبی سے کئی صدیوں تک چلائیں۔ یہاں تک کہ سوتے بھی گھوڑے بیچ کر تھے۔ اب گھوڑے کا زمانہ نہیں۔

تانگے میں جتتا ہے یا دولہا سہرا باندھ کر اُس پر چڑھتا ہے، وہ بھی اس لیے کہ لڑکیاں "ویر میرا گھوڑی چڑھیا" گا سکیں۔ موٹر پر چڑھنے کے گیت ابھی ایجاد نہیں ہوئے۔

قصّہ مختصر ہمارے ہاں کے ایک صاحب نے اس کی بھنک پائی اور ان پر ایسی دُھن سوار ہوئی کہ راتوں کو خواب میں بھی یہی بڑبڑاتے تھے کہ اب تو میں امیر کبیر بن جاؤں گا۔ ایک گھوڑے پر ہزار ڈالر، ڈیڑھ ہزار ڈالر منافع ہوا تو دس ہزار گھوڑے پر کتنا منافع ہو گا۔ یہ حساب لگانا کسی پاکستانی کے لئے آسان نہیں۔ لٰہذا بے چاروں کو ایک چھوٹا سا کمپیوٹر خریدنا پڑا۔ اُدھر کسی نے بھانجی ماری کہ اے صاحب! جاپانیوں کا اپنا سلوتری اُن کو دیکھے گا۔ بیس پچیس دِن، تیس دِن قرنطینہ میں رکھے گا۔ پھر تم کو یہ گھوڑے لا کر جہاز کے انتظار میں کراچی میں رکھنے ہوں گے۔ یہاں طویلے تلاش کرنے ہوں گے، کرایہ دینا پڑے گا۔ ان کو دانہ کھلانا پڑے گا۔ ان کے لیے گھاس کھودنی پڑے گی، یا خریدنی پڑے گی۔ ان میں سے کُچھ بیمار ہوں گے۔ کچھ مر بھی جائیں گے۔ ان کی تجہیز و تکفین کا سوال اُٹھے گا۔ یہ سارے خرچ تُم کو اُٹھانے ہوں گے۔ خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا۔ انہوں نے دانے گھاس کا خرچہ پھیلایا تو یہ سمجھ میں آیا کہ یہ لاگت تو گھوڑوں کی قیمت سے بھی آگے نکل جائے گی۔ سُنا ہے اب وہ خواب میں گھاس کا حساب لگاتے ہیں اور واویلا

کرتے ہیں کہ ہائے میں لُٹ گیا۔ میرے گھوڑے بیمار ہو گئے۔ میرے گھوڑے مر گئے۔ اگر ہمارے پڑھنے والوں میں سے کسی صاحب کے پاس دس ہزار گھوڑے ہوں تو اپنے ہاتھ کھڑے کریں اور ٹوکیو میں پاکستان کے سفارت خانے کو خط لکھیں۔ دس ہزار ایک کھیپ میں نہیں ملتے تو قسطوں میں سہی۔ سو روپے فی گھوڑا ہمارا کمیشن یاد رکھیں۔

ادھر گنزا میں تانگہ چلانے کی تجویز بھی ہے۔ گنزا کیا چیز ہے، یا گنزا کیا ہوتا ہے؟ اکبر الہ آبادی کی زبان میں ایسی جگہ جہاں:

روشنیاں ہوں ہر سو لامع

کوئی نہیں ہو کسی کا سامع

سب کے سب ہوں دید کے طامع

یہاں مثال کے لیے الفنسٹن اسٹریٹ سمجھ لیجیے۔ انارکلی قیاس کر لیجیے۔ لیکن یہ کچھ ایسے ہی ہے جیسے آغا حشر کو ہم ہندوستان کا شیکسپیئر کہتے تھے۔ الفنسٹن اسٹریٹ کی رونق اور چکاچوند کوئی سو سے ضرب دے لیجیے۔ لیکن آج کل نہیں۔ آج کل تو شام

ہی سے بجھا سا رہتا ہے۔ تانگہ چلانے کی تجویز ایک پاکستانی کی ہے جو مدّت سے جاپان میں رہتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں۔ خود پنجابی ہیں۔ لہٰذا فرماتے ہیں، میں خود لاچا باندھ کر اور پگڑی باندھ کر پیچ موڑ توں کیا کروں گا۔
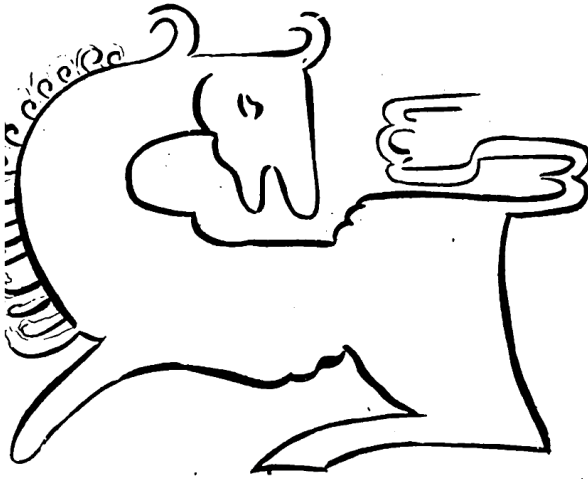
پہلے جاپان والوں کا کہنا تھا کہ اچھا تانگہ وہاں سے لاؤ گھوڑے یہاں سے لو، یا کوچوان یہاں کے رکھو۔ ان کو سمجھانا پڑا کہ حضور یہ گھڑ دوڑ یا میدانِ جنگ نہیں ہے کہ جس گھوڑے کو لے آؤ کچھ نہ کچھ کر لے گا۔ تانگہ کھینچنا خاصا ریاض چاہتا ہے۔ تانگے کے گھوڑوں کی نسل ہی الگ ہے، اور وہ محاورہ اور روزمرّہ بھی خاص بھاٹی اور لوہاری کے کوچوانوں ہی کا سمجھتے ہیں۔ جاپان والے ہمارے تانگہ والوں کی فصیح البیانی کی قدر تو

کیا کر سکیں گے، سواری کا لطف البتّہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اتوار کو گنزا میں شاپنگ کا تو زور ہوتا ہے لیکن گاڑیاں لانے کا حکم نہیں ہے۔ گنزا کوئی ایک سڑک کا نام نہیں ہے، لمبا چوڑا شاپنگ ایریا ہے۔ فی الحال یہ تانگہ اتوار کے دِن یہاں چلا کرے گا اور گنزا میں یہ آوازہ گونجا کرے گا "او تانگے والا خیر منگدا" البتّہ تیل کے یہی لیل و نہار رہے تو دوسرے علاقوں میں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے، اور کیا عجب ہے ہمارے لاہور اور گوجرانوالہ اور حیدر آباد اور ملتان سبھی جگہ کے تانگوں کے لئے جاپان میں گنجائش نکل آئے۔ بی ہائینڈ جیکب لائن والے بھی تیّار رہیں۔

کچھ بھاؤ آٹے دال کا

صاحبو! اس سفر میں آٹے دال کا بھاؤ کُچھ ہمیں اپنے آپ معلوم ہو گیا، کُچھ ہم نے جستجو سے معلوم کیا۔ آٹا فی الحال تو محاورے میں ہی سمجھیے، لیکن جاپانی حکومت کی کوشش ہے کہ لوگ گیہوں کھانے لگیں تا کہ خوراک میں تنوّع آئے اور بدن طاقت پائے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ گیہوں کھانے والے کو بالآخر جنّت سے نکلنا پڑتا ہے۔ بہر حال جاپان کے ایک نامی گرامی اخبار نے پاکستان سفارت خانے سے رجوع کیا کہ ہمارے قارئین کو بتایئے گیہوں سے کیا پکوان تیّار ہو سکتا ہے۔

ہمارے دوست امان اللہ سردار نے ہنڈ کُلھیا اور خانہ داری کی باقاعدہ تربیت خود حاصل نہیں کی، اپنی بیوی سے پوچھ کے روٹی، پراٹھا، پوری، کچوری اور سموسے وغیرہ پکانے کی ترکیبیں بھیجیں۔ وہ اخبار میں چھپیں اور خانہ دار خواتین نے آزمائیں۔ جاپانیوں کو سب سے زیادہ قیمے بھرا پراٹھا مرغوب ہوا۔ کل کے خط میں ہم نے تانگوں اور گھوڑوں کی ضرورت کا ذکر کیا تھا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ تانگوں والے جائیں تو کچھ حکیم کھچڑے والوں کو، جلیبی والوں کو، پکوڑے تلنے والوں کو، نان بائیوں کو اور کلچے باقرخانیاں بنانے والوں کو بھی ساتھ بٹھا لے جائیں۔ لاہور کے مُرغ چھولوں والے بھی جاسکتے ہیں اور چناجور گرم والے بھی قسمت آزما سکتے ہیں۔

کچھ کرلو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں

لیکن بات آٹے دال کے بھاؤ کی تھی۔ ہم ٹوکیو میں بھی ٹھہرے اور ہانگ کانگ میں بھی ڈیڑھ دِن قیام کیا۔ ہانگ کانگ میں پنجاب ہاؤس والوں سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ اب کے بھی ہماری دعوت کی تو ہم نے پوچھا بھئی یہ گوشت کس بھاؤ کا ہے؟ پاکستان میں تو اتنا مہنگا ہے کہ ہم مہینے میں ایک دو بار کھاتے ہیں۔ یہاں سستا ہوگا کیونکہ ہانگ کانگ میں چیزیں سستی مشہور ہیں۔ فرمایا چالیس روپے سیر ہے۔ یہ شرح بکرے کے گوشت کی ہے۔ ٹوکیو میں بیف ہی ملتا ہے یعنی بڑا گوشت۔ اس کا

بھاؤ سُننے کے لیے قارئین کرام اپنے اپنے کلیجوں اور کلیجیوں پر ہاتھ رکھ لیں۔ قیمت میں ادنیٰ اعلیٰ کا فرق ہے۔ سب سے ادنیٰ درجے کا بیف جسے آپ خود بھی کھا سکتے ہیں، اپنی بلّیوں کو بھی کھلا سکتے ہیں، ۶۰ روپے سیر ہے، اور اعلیٰ درجہ کا دو سو روپے۔ ہم نے کہا دو سو روپے من ہو گا۔۔۔ بولے، نہیں صاحب دو سو روپے سیر۔ ہم نے کہا۔ پھر تو گھی ہی گھی ہو گا؟ آپ نے خود کبھی کھایا ہے؟ ہمارے میزبان نے کہا ایک دفعہ عرب سفارت خانے کی دعوت میں کھایا ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ خستہ ہوتا ہے۔ ہم نے کہا۔ کبھی ہمیں بھی کھلوائیے۔ ایک آہِ سرد بھری اور چُپ ہو گئے۔

جاپان میں اسلام ترقّی کر رہا ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اب وہاں دو بقر عیدیں ہوئیں۔ ایسا اختلاف وہیں ہوتا ہے جہاں مسلمان زیادہ ہو جائیں۔ عربوں نے ۵ جنوری کو عید کی۔ ترکوں نے ۴ تاریخ کو۔ ترکوں نے مسلمان سفارت خانوں کو تار دیے کہ دیکھنا ۴ جنوری یاد رکھنا۔ اِدھر اُدھر ہو کر ایمان کو بٹّہ مت لگانا (کوبے کے بڑے امام تُرک ہی ہیں)۔ اِس کے مُقابلے میں عربوں نے اشتہار شائع کیے کہ پانچ کو عید منائیے، پانچ کو۔۔۔ آج کل عربوں کی زیادہ چلتی ہے۔ تاہم کُچھ لوگوں نے ایک دِن عید کی، کُچھ نے دوسرے دِن۔ بعضوں نے جو ہماری طرح مرنجاں مرنج تھے دونوں دِن۔ جاپان میں اسلام کی مقبولیت کی ایک وجہ اس کی حقانیت کے علاوہ

یہ معلوم ہوئی کہ وہاں شادی پر خرچ بہت اُٹھتا ہے۔ اگر شنتو مذہب کی رسوم کے ساتھ کیجیے تو ۵ لاکھ ین (۳۰۰۰ ین۔ اڈالر۔ ۱۰ روپے)۔ بدھ مت کے قاعدے سے کوئی تین لاکھ ین۔ عیسائی رسوم کے ساتھ ایک لاکھ۔ مسلمانوں میں چند ہزار ین میں بھگتان ہو جاتا ہے۔ مُفت ہی سمجھیے۔ کوبے کے امام مسجد جو آسانی سے لوگوں کو مسلمان نہیں بناتے، اِس میں یہی رمز ہے۔ وہ اسلام قبول کرنے والوں کو صدقِ دِل سے مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں، جو فی زمانہ ذرا زیادتی ہے۔ اِدھر جاپانی روحانیت اور مابعد الطبیعات سے زیادہ معاشیات کے نقطۂ نظر سے اِس چیز کو دیکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس مذہب میں پیسے بچتے ہوں، کام مُفت ہوتا ہو، اُس سے سچّا مذہب کون ہو سکتا ہے۔

کولون کا ریلوے اسٹیشن

ٹوکیو سے ہانگ کانگ پہنچے تو دیکھا کہ پورا شہر جھنڈے جھنڈیوں سے آراستہ ہے۔ لوگ زرق برق لباس، اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن پہنے اہلے گہلے پھر رہے ہیں۔ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ اے بھائی! یہ ہمارا استقبال ہے؟ ہم نے تو آنے کی اطلاع بھی نہ دی تھی۔ بڑے باخبر لوگ ہو تم۔ اس نے کہا۔ جی یہ چینی نیو ائیر کی تیّاری ہے، سالِ نو کی۔ ہمیں معلوم نہیں چین میں نیو ائیر سال میں کئے بار آتا ہے۔ ہم تو جب بھی آئے یہاں نیو ائیر کا کھڑاک دیکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب بھی ہمارے آنے کی اطلاع ہوتی ہے چین والے نیو ائیر کا اعلان کر دیتے ہیں۔ کہیں ہم سال دو سال کو ناغہ کر دیں تو یہاں وقت رُک جائے، نیو ائیر آئے ہی نہیں۔ اسٹار فیری کے گھاٹ کے پاس ہی کولون (ہانگ کانگ) سے کینٹن جانے والی ریل کا اسٹیشن ہے۔ یہاں بھی عجب اہتمام تھا، خلقت کا اژدہام تھا۔ یہاں مسافر اپنا سامان بھنگیوں سے اٹھا کر چلتے ہیں۔ کاندھے پر بانس کا ڈنڈا۔ اُس کے ایک سِرے پر رسّی سے بستر لٹکایا، دوسری طرف سوٹ کیس پھنسایا۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے کینٹن جا رہے ہیں۔ چین کو اِن سب کے لیے مادرِ وطن کی حیثیت حاصل ہے۔ ہانگ کانگ، میکاؤ، سنگاپور وغیرہ سب اس کے بچّے بچونگڑے ہیں۔ جو اشتیاق ہمارے ہاں حج پر جانے والوں میں ہوتا ہے وہی نَوروز پر

چین جانے والوں میں ہم نے پایا۔ خود ہانگ کانگ میں ہجوم سے ٹریفک جام ہو گیا۔ سڑکیں رُک گئیں، بند ہو گئیں، یک طرفہ ٹریفک کی پابندی لگ گئی۔۔۔ پارکنگ ممنوع۔ پولیس کمشنر نے ٹیلی ویژن پر لوگوں کو مشورہ دیا کہ ذاتی کاریں باہر مت نکالو، بس پکڑو یا پیدل جاؤ۔

لوگ تو ہانگ کانگ فقط خریداری کے لئے جاتے ہیں، لیکن ہمیں اس کی فضا سے یک گونہ اُنس ہے۔ یہ ہم جزیرہ نما کی ٹکڑ کولون کا ذکر نہیں کر رہے، وکٹوریا کے جزیرے کی بات کر رہے ہیں۔ سمندر، فیری کا سفر، انگریزوں کی عظمتِ رفتہ کی یاد دِلانے والی عظیم و جسیم عمارتیں، وردی پوش سِکھ دربان، سڑکیں، ہوٹل، مغازے، اوپر ہی اوپر چڑھتی ہوئی پُرپیچ پراسرار گلیاں، پہاڑ کی چوٹی تک مکانوں کے سلسلے بلکہ عین چوٹی کے اوپر بھی پندرہ سولہ منزلہ اونچی عمارات۔ رات کو عجب جگر مگر کا عالم ہوتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک پیالہ یا بادیہ ہے۔ آپ اس کے پیندے میں بیٹھے ہیں اور اُس کے کناروں تک روشنیاں اُٹھتی چلی گئی ہیں۔ نیچے بازار میں خریداری کا عالم یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی دکانوں بلکہ کیبنوں پر لاکھوں کا کاروبار ٹورسٹوں کے ساتھ فقط انگریزی کے تین لفظوں میں ہوتا ہے۔ ایک تو How Much دوسرے No تیسرے O.K۔ آپ دُکان پر جاتے ہیں اور چیز اُٹھا کر پوچھتے How Much وہ کہتا

ہے چوبیس ڈالر آپ کہتے ہیں No اور جانے لگتے ہیں۔ اب اس کی باری ہے پوچھنے کی You How Much یعنی تُم بھی کُچھ مُنہ سے پھوٹو۔ آپ نے کہا دس ڈالر۔۔۔ وہ کہے گا No پندرہ۔ آپ نے پھر کہا دس۔ اب وہ کہے گا O.K نکالو پیسے۔ ہانگ کانگ کی ایک لہراتی اُوپر چڑھتی گلی میں ہمیں فقط ایک دُکاندار ملا جسے انگریزی کا فاضل کہہ سکتے ہیں۔ کم از کم تین لفظوں سے زیادہ جانتا تھا۔ جب اس سے ہمارا بھاؤ نہ بنا تو بولا Go, No Buy Go یعنی تُم کو خریدنا ہی نہیں ہے۔ جاؤ جاؤ۔۔۔ میری دُکانداری کھوٹی مت کرو۔ سُنا ہے جنگ کے دِنوں میں ہندوستانی دُکاندار بھی صاحب لوگوں سے یونہی کہا کرتے تھے کہ ٹیکنی ہے تو ٹیک، نہیں تو اور شاپ دیکھ۔۔۔ ہانگ کانگ کی دعوت میں سعید میر صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہمارے میزبان نے ہمیں اور اُن کو بڑے چاؤ سے یک جا بُلایا تھا۔ اُن کو یہ دیکھ کر شرمندگی ہوئی کہ نہ ہم نے کبھی اُن کا نام پہلے سُنا ہے۔ نہ انہوں نے کبھی ہمیں پڑھا ہے۔ وہ بے چارے سعید میر سے تو یہ کہتے تھے کہ بھئی یہ مشہور رائٹر ہیں پاکستان کے، کئی کتابیں لکھ رکھی ہیں، اِن کا کالم بہت پڑھا جاتا ہے۔ اِدھر ہم سے یہ کہ سعید میر صاحب مایہ ناز کھلاڑی ہیں، انہوں نے کئی میچ جیت رکھے ہیں، آج کے اخبار میں اِن کی آمد کی خبر بھی ہے۔ ہم نے کہا بہت خوشی ہوئی۔ آپ کیا کھیلتے ہیں جی؟ وہ

بولے ٹینس۔۔۔ ہم نے یہ پوچھ کر کہ ٹینس کیا ہوتا ہے یا کیا ہوتی ہے؟ اُن کے اور اپنے میزبان کے جذبات کو مزید ٹھیس پہنچانا پسند نہ کیا۔ آسٹریلیا سے آئے تھے۔ بہت خوش دِل جوان ہیں۔ بتایا کہ میرا رشتہ سر سیّد مرحوم سے ملتا ہے۔

ہم نے نہ کبھی کوئی کھیل کھیلا، نہ کھیلوں کے متعلّق کُچھ پڑھا۔ کھڑا کھیل فرخ آبادی تک کے متعلّق کُچھ نہیں جانتے کہ کیسے کھیلا جاتا ہے۔ ہمارے شاہد احمد دہلوی مرحوم کا بھی ایک بار کسی نے بمبئی میں تعارف کرایا تھا کہ یہ اشوک کمار ہیں۔ شاہد صاحب نے کہا اچھا؟ لیکن یہ کیا کرتے ہیں کُچھ تفصیل تو بتاؤ؟

ایک واقعہ سعید میر صاحب نے بھی اپنی خریداری کا بتایا کہ ایک دُکان پر ایک سویٹر مُجھے پسند آ گیا۔ دُکاندار نے دام بتائے پچاس ڈالر۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں بھاؤ تاؤ کرنا چاہیے۔ سوچا چالیس ڈالر کا مل جائے تو اچھا ہے۔ پس اُس سے کہا کہ بھائی دس یا بارہ ڈالر اِس میں سے کم کر دو تو بڑی مہربانی ہو گی۔ پورا فقرہ اور اُس کی صرف و نحو تو وہ سمجھا نہیں۔ دس اور بارہ اُس کی سمجھ میں آئے۔ بولا۔۔۔ بارہ ڈالر؟ نو نو۔۔۔ ففٹین ڈالر نکالو۔۔۔ میں نے پندرہ ڈالر دیے اور سودا O.K ہو گیا۔

لنکا

جنوری ۱۹۶۴ء

ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں

عزیزو! جب ایران کی شیرینی اور صباحت کے مزے پر پانچ ہفتے گزر گئے اور اس بلدۂ خوش نہاد کراچی کے در و دیوار سے جی اُچاٹ ہوا تو اس فقیر نے ایک بار پھر رختِ سفر باندھا اور جزیرۂ حسن و ملاحت کی راہ لی جسے رام لیلا دیکھنے والے لنکا کے نام سے اور ریڈیو سُننے والے سیلون کے عرف سے یاد کرتے ہیں۔ طوطا کہانی میں اسے سنگلدیپ کا نام دیا گیا ہے اور عرب سر اندیپ کہہ کر پُکارتے ہیں۔ الف لیلہ کا سندباد جب اپنے چھٹے سفر پر بصرہ سے روانہ ہوا تو ایک روز ناخدا نے غُل مچایا اور اپنی

پگڑی پھینک کر سر پیٹنے لگا۔ اور مارے رنج و غم کے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے پوچھا خیر باشد! بولا ہم راستہ بھول کر نئے سمندر میں نکل آئے ہیں۔ قصّہ مختصر جہاز ڈوبا۔ اور یہ ایک ٹاپو پر جا اُترے جہاں آب ہاضم اور عنبر کی بہتات تھی۔ انہوں نے ایک بجرا بنا کر دریا میں ڈالا اور ایک تنگنائے سے گزر کر ایک مرغ زار میں پہنچے جہاں لوگ کوئی اجنبی بولی بول رہے تھے اور اسے شاہ سراندیپ کے روبرو لے گئے۔

ابنِ بطوطہ بھی مالدیپ کے جزیروں میں چھ نکاح کرنے کے بعد یہاں پہنچا اور لوگ اسے بادشاہ کے حضور لے گئے تو اس کے پاس بہت اچھے اچھے موتیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے ابنِ بطوطہ سے پوچھا، تم نے اتنے بڑے موتی پہلے کبھی دیکھے ہیں؟ ابنِ بطوطہ نے کہا، جیسا کہ کسی بھی منجھے ہوئے اور گھاگ آدمی کو کہنا چاہیے تھا کہ حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ کبھی نہیں دیکھے۔ بھلا ایسے بڑے موتی کہیں ہو سکتے ہیں۔ اس پر بادشاہ نے حاتم کی قبر پر لات مار کر دو دانے اُٹھا کر دیئے اور کہا۔ شرم نہ کرو، جو کچھ درکار ہے مُجھ سے طلب کرو۔ ابنِ بطوطہ نے کہا، حضور! میری غرض یہاں آنے سے یہ تھی کہ قدم شریف کی زیارت کروں، حالانکہ بعد میں معلوم ہوا، موصوف کا ارادہ مزید نکاح کرنے کا تھا۔

ہرے بھرے جنگلوں اور پانی کے قطعوں کا نظّارہ تو پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اب ہم ہوائی اڈّے پر اترے۔ تھوڑی دور پر ایک بر آمدہ اور اس کے پیچھے دو تین کو ٹھڑیاں نظر آئیں۔ سبھی مسافر وہاں پہنچے۔ ہمارا خیال یہی تھا کہ ریستوران ہے۔ ائیر پورٹ کی بلڈنگ اس کے پیچھے ہو گی۔ لیکن معلوم ہوا جو کُچھ ہے یہی ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ ہم نے اس تھوڑے کو بہت سمجھا اور کسٹم میں چلے گئے۔ بعد میں سوچا کہ اس چھوٹے سے جزیرے کا ائیر پورٹ اس سے بڑا ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ائیر سیلون کی بین الاقوامی سروس بھی ایک جہاز پر مشتمل ہے جو اصل میں پی او اے سی سے ادھار لیا گیا ہے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی تھے اور کُچھ لوگ ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو اپنے ایک شناسا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک اور صاحب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور کہا، آپ ابنِ انشا ہیں۔۔۔ اور میں ہوں آسٹن جے وردھنا۔ ہم نے کہا خوب خوب۔ جی میں سوچا ہمارے ہاں بھی تو جارج گنڈا سنگھ اور پیٹر فضل دین وغیرہ نام ہوتے ہیں۔ یہ بھی لنکا کا دیسی کرسٹان ہو گا۔ اب ہم ان کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ سیلون کے نیشنل بُک ٹرسٹ کے سیکرٹری تھے۔

جب ہمیں چلتے چلتے پون گھنٹہ ہو گیا بلکہ زیادہ، تو ہم نے کہا آپ کا ملک تو بہت

خوبصورت ہے لیکن اس کی سیر ہم پھر کریں گے۔ فی الحال کولمبو چلئے۔

بولے ”کولمبو ہی تو جارہے ہیں۔“

ہم نے کہا، ہم یہ سمجھے تھے کہ آپ کا ارادہ پہلے سارے جزیرے کا چکر لگانے کا ہے، اچھا تو کتنی دور ہے کولمبو؟

بولے ”بس دس بارہ میل اور ہو گا۔“

آخر شہر نظر آیا۔ اور پھر ہم فورٹ کے علاقہ میں تھے۔ سامنے ایک بڑی محراب نظر آرہی تھی۔ ہم نے کہا ”یہ کیا ہے؟“

بولے: ”یہ بودھوں کا مندر ہے، اسٹوپا۔۔۔!“

”یہاں کیوں؟“

بولے: ”جو جہاز سمندر میں آتے ہیں ان کی نظر سب سے پہلے اس گرجا پر پڑتی تھی جو سب سے اونچی عمارت ہے۔ چونکہ یہاں بودھوں کی اکثریت ہے لہٰذا یہاں اب یہ بودھ عمارت کھڑی کی جارہی ہے تاکہ آنے والے اسی کو سب سے پہلے دیکھیں۔“

ہم نے کہا۔ "خوب۔" آسٹن کے عیسائی ہونے کی رعایت سے ہمارا جی تو چاہا کہ بودھوں کی غیر رواداری پر ایک فصیح و بلیغ تقریر کریں، لیکن پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ بعد میں معلوم ہوا کہ میاں آسٹن خود بودھ ہیں۔ مشہور مصنّف مارٹن وکرم سنگھ بھی بودھ ہیں اور ڈیوڈ ڈی سلوا بھی آٹھوں گانٹھ کمیت بودھ۔ یہ نام پرتگیزوں کے عہد کی یادگار ہیں جو کسی غیر عیسائی یا غیر عیسائی نام والے کو نوکری نہ دیتے تھے۔ چنانچہ سیلون کے ڈی سوزا اور ڈی سلوا وغیرہ نہ پرتگیزی ہیں نہ گوائی، خالص سیلونی اور سنگھالی بودھ ہیں۔ آسٹن نے بتایا کہ لوگوں نے حکومت کا تقرّب حاصل کرنے کے لئے اس قسم کے نام رکھ لئے تھے۔

"مسلمانوں نے بھی!" ہم نے پوچھا۔

آسٹن نے کہا "مسلمانوں نے البتّہ اپنے نام کبھی نہیں بدلے۔ وہ اپنی وضع پر قائم رہے۔ ہم بھی آئندہ کوشش کر رہے ہیں کہ خالص دیسی نام رکھیں۔"

بی او اے سی نے جب کراچی میں ہمیں ٹکٹ دیا تھا تو ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کے لئے "سی ویو کلب" میں کمرہ بُک کر دیا گیا ہے۔ جب ہم ہوٹل پہنچے تو Sea View کلب کی وجہ تسمیہ معلوم ہوئی۔ یہ ایک دو فرلانگ لمبی گلی میں واقع ہے۔ اسے طے

کر کے بڑی سڑک پر آئیں اور کوئی آدھ میل داہنے رُخ چلیں تو ایک جگہ ایسی آتی ہے کہ وہاں سے سمندر صاف دِکھائی دیتا ہے۔

اس وقت دِن کے گیارہ بج رہے تھے اور گرمی کا وہ عالم جو کراچی میں جولائی میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین نے کہا۔ ہمیں کمرے دکھایئے تاکہ نہا دھو کر آرام کریں۔ اس پر بیروں نے منیجر کی طرف دیکھا اور منیجر نے بیروں کی طرف۔ اس کے بعد نہایت ادب سے کہا۔ فی الحال یہیں تشریف رکھیے۔ ”آخر کیوں؟“

منیجر نے ایک پاؤں سے دوسرے پر اور دوسرے سے پہلے پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ”آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔“

”کس کا انتظار؟“

”کمرے خالی ہونے کا۔“

ہم نے فوراًبی او اے سی کی چِٹ دکھائی کہ آپ کے لیے سی ویو کلب میں فرسٹ کلاس کمرہ ریزرو ہے۔

منیجر نے کہا: ”یہ تو ٹھیک ہے لیکن کمرہ خالی ہونے میں وقت لگے گا۔ بس دو تین گھنٹے

اور یہیں انتظار کر لیجیے۔ اس کے بعد دو نہیں تو ایک کمرہ خالی ہونے کی قوی اُمّید ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین بہت بیتاب ہو رہے تھے۔ بولے "اجی میں تو چلا۔ کوئی بھی ہوٹل مل جائے گا۔ گال فیس (وہاں کا بیچ لگژری ہوٹل ہے) اس لئے نہیں گئے تھے کہ شور اور ہنگامہ بہت ہے۔ لیکن وہاں کمرہ تو کم از کم مل جائے گا۔ ہم نے خوشامد درآمد سے انہیں راضی کیا اور اناس کا شربت پلوایا۔ لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے دو بج گئے۔ آخر کمرہ ملا۔ معلوم ہوا دو جرمن اس ہوٹل میں فروکش تھے جنہوں نے ایک روز قبل جانے کا وعدہ کیا تھا اور اب اڑ گئے تھے کہ جب ہمارا جی چاہے گا جائیں گے۔ نہیں جاتے کر لو شکایت ہماری۔

سوادِ شہر کولمبو

کولمبو جانے سے پہلے ہم نے دیوندر سیتارتھی اور اے حمید کی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں، اور خیال یہ تھا کہ وہاں دِن بھر نسیمِ سحری چلتی ہو گی۔ یہاں دیکھا کہ یہ تو بلدۂ گرد و گرما ہے۔ ہوٹل کا کمرہ بھی اتّفاق سے ایسا آرام دہ اور گرم ملا کہ ہیٹر لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ ڈاکٹر اختر حسین گرمی سے بہت مُضطرب تھے بولے۔۔۔ ''تمہاری یہ کیفیّت کیوں نہیں؟'' ہم نے عرض کیا کہ ''بندہ کچھ روز ملتان رہ آیا ہے۔'' فرمایا ''مطلب کیا ہے؟'' ہم نے عرض کیا کہ ''جہنّم میں جہاں ہر طرف

گنہگاروں کی تادیب اور عقوبت کے لئے آگ کے الاؤ بھڑک رہے تھے اور لوگ گرمی سے جل بھُن کر الاماں الاماں پکار رہے تھے، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک شخص لحاف کی بُکّل میں بیٹھا ٹھنڈ سے کانپ رہا ہے، بلکہ دانت بج رہے ہیں۔ ایک فرشتے نے حیرت سے پوچھا "آپ کی تعریف؟" پتہ چلا ملتان کے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ حال جنوری کے مہینے کا ہے اور ہم ایران سے آرہے تھے جہاں جتنے دِن رہے، یہی خیال رہا کہ ریفریجریٹر کے اوپر کے خانے میں بیٹھے ہیں۔ بلکہ برف گرتی دیکھی۔ معلوم ہوا کولمبو کا موسم تو یہی ہے۔ جنوری ہو یا جون، مارچ ہو یا ستمبر، نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ یہ علاقہ جس میں ہمارا ہوٹل تھا، ایک طرح کی سول لائن سمجھیے جہاں بڑے بڑے بنگلے تھے۔ ان سے نکلیے تو ڈھاکہ شروع ہو جائے گا، وہی لباس، وہی پھل پھول پودے، وہی لوگوں کی رنگت اور نین نقش، ویسے ہی مکان اور دُکانیں۔ فورٹ کے علاقہ میں بھی جہاں چلے جایئے نئی اور نئے طرز کی عمارت شاید ہی کوئی ہو۔ بینکوں کی عمارات، انگریزوں کے زمانے کی ٹھاٹھ دار بلڈنگیں جا بجا ہیں۔ نیشنل اینڈ گرنڈلے بینک، مرکنٹائل بینک، چارٹرڈ بینک، وہی پتھّر کی ٹھوس بڑے آثار کی عمارتیں جن کی پیشانیاں موسم کے اثرات سے دھواں سی ہوئی، لمبے لمبے برآمدے، دھوتی پوشوں کے ہجوم، گپ کرتے ہوئے چپراسی،

چائے پیتے ہوئے کلرک۔

یہ زمانہ بیگم بندرانائکے کے عروج کا تھا۔ ابھی چند دِن پہلے حکومت نے پٹرول پمپوں کو نیشنلائز کیا تھا۔ برما شیل اور اسٹینڈرڈ آئل والوں کے بورڈ اُتارے جا رہے تھے اور ''سری لنک'' کے بورڈ ان کی جگہ لے رہے تھے۔ غیر ملکی بینکوں کا چل چلاؤ تھا۔ یہ پابندی لگائی جا چکی تھی کہ کوئی نیا اکاؤنٹ سوائے بینک آف سیلون کے کہیں نہیں کھولا جا سکتا۔ امریکہ امداد بند کرنے کا اعلان کر چکا تھا اور لوگوں کے چہرے نئے عزم کے ساتھ تمتما رہے تھے۔ شمالی علاقوں میں جو بھارتی اسمگلروں کی آماجگاہ تھی، حکومت سختی سے کارروائی کر رہی تھی اور روزانہ بہت سے لوگ اسمگلنگ کرتے گرفتار ہو رہے تھے۔ تامل سنگھالی جھگڑا ابھی چل رہا تھا۔ بھارتی سیٹھ اپنا پیسہ ہندوستانی روپے میں بدلوا رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ سیلون کے سِکّے کا بھاؤ بہت گر گیا تھا۔ پولیس والوں کی نگرانی کے باوجود فورٹ کے علاقے میں قریب قریب ہر دُکان کرنسی کی بلیک مارکیٹ کا اڈّہ تھی۔ امریکی ڈالر کا سرکاری بھاؤ تو پونے پانچ روپے تھا۔ لیکن بازار میں اس کے گیارہ روپے بآسانی مل جاتے تھے۔ بازار سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ لوگ لپک کر آتے اور پوچھتے بھارتی روپیہ ہے؟ بدلوایئے گا؟ پچاس دیجیے سو لیجیے۔ بارے ہوٹل کا کچھ بیاں ہو جائے۔ گال فیس ہوٹل کولمبو کا سب سے پرانا

اور مشہور ہوٹل ہے جس کی عقبی کھڑکیاں عین سمندر پر کھلتی ہیں۔ بی او اے سی کا دفتر اسی میں ہے اور سبھی غیر ملکی یہیں ٹھہرتے ہیں۔ لیکن یہ مہنگا بھی ہے۔ ہمارے دوست ہوشنگ ایرانی ہم سے پہلے فورٹ کے ہوٹل تپر دبان میں رہ گئے تھے۔ لوگوں کے شور و شغب اور کھانے کے احوال سے قطع نظر بیروں کے متعلّق ان کا بیان یہ تھا کہ آپ ماچس بھی منگائیں تو باقاعدہ طشتری میں سجا کر لاتے ہیں اور جھک کر آداب کرتے تھے کہ اُمّیدوارِ کرم ہیں۔ میز صاف کرنے پر بخشیش، چادر بدلنے پر بخشیش، پانی پینے پر بخشیش، گھوڑا آگے بڑھانے پر بخشیش۔ فرماتے تھے جب رُخصت ہوا تو پچیس آدمی قطار باندھے کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی میرے برآمدے میں جھاڑو لگاتا تھا، دو میری غیر موجودگی میں غسل خانے کی دیکھ بھال کرتے تھے، تین چار روم بیرے تھے، ایک دو چائے لانے والے، تین چار کھانا کھلانے والے۔ یہ بھی ہوشیار نکلے، سیلونی اخلاق کا ایرانی اخلاق سے جواب دیا۔ ان لوگوں کے مؤدبانہ سلاموں کا جواب اور زیادہ مؤدب سلام سے دے کر نکل آئے۔ ہم سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہمارا ہوٹل سی ویو کلب، ہوٹل کم اور کلب زیادہ تھا۔ زیادہ تر بُڈھے انگریز اور کُچھ امریکی، جرمن، پولش وغیرہ اس میں سالہا سال سے مقیم تھے۔ کھپریلوں کی

چھتیں تھیں۔ معلوم ہوا کہ انگریزوں نے جنگ کے دِنوں میں جو بیرکیں بنائیں تھیں انہی میں یہ بھی تھیں۔ آگے کمرہ، پیچھے لمبا لمبا برآمدہ نما غسل خانہ، کمرے اور غسل خانہ کے درمیان کوئی کواڑ نہیں تھے، کھُلا دروازہ تھا۔ لہٰذا کمرے میں ایک سے زیادہ آدمی ہوں تو غسل خانے والے کو برابر وقفے وقفے سے کھانس کھنکار کر اپنی موجودگی کی اطلاع دینی ہوتی تھی۔ پیچھے کی شیشے کی جھلملیوں میں سے کُچھ ثابت تھیں کُچھ ٹوٹی ہوئی اور ادھر سے نوکر چاکر بیرے، خانساماں، مالی وغیرہ برابر گزرتے تھے۔ ایک بار ہمیں خیال گزرا کہ شاید نیوڈ Nude کلب ایسے ہی کلب کو کہتے ہیں، لیکن ڈاکٹر اختر حسین نے فرق بتایا کہ اس میں آپ بھی دوسروں کو ننگا دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں معاملہ یک طرفہ ہے۔

کھانا یہاں ہمیشہ ولایتی ملتا رہا، یعنی پھیکا سیٹھا۔ دو دِن کے بعد ہم نے کھانا چھوڑ دیا اور اناس منگا کر کھانے لگے۔ اناس کا ٹکڑا ہر کھانے کے بعد ملتا تھا اور ناشتے میں بھی۔ چونکہ ہاضم ہوتا ہے لہٰذا لوگ چورن کے طور پر کھاتے ہیں۔ ہمارا حال اُلٹا تھا، ہم پانچ چھ قاشیں بڑی بڑی کھا کر پیٹ بھر لیتے تھے اور پھر اِس چورن کو ہضم کرنے کے لئے ایک دو توس نوشِ جان کرتے۔ سیلون کا مقامی کھانا مدراس کی طرز کا ہے۔ بھات میں دال ڈالو اور مٹھیوں میں بھینچ نچوڑ کر زبان سے چاٹ لو۔ اس کے لئے

مشق اور ذوق کی شرط ہے۔ پاکستانی طرز کا ایک ہوٹل تلاش کے بعد ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں اور کرنل مجید ملک کبھی کبھی یہاں آکر لذّتِ کام و دہن حاصل کرتے رہے ہیں۔ کھانا بس ایسا ہی تھا۔ ایک آدھ بار کھایا۔ ورنہ بالعموم انناس کے ساتھ توس کھاتے رہے۔ کبھی کبھی صاف شفاف شوربہ بھی پی لیتے۔ بیرے ہمیشہ کُچھ نہ کُچھ بتاتے رہتے تھے کہ یہ فلاں چیز کا شوربہ ہے، یہ فلاں کا ہے۔ لیکن پکانے والے ایسے باکمال تھے کہ شکل اور لذّت میں ذرّہ بھر فرق نہ آنے دیتے تھے۔ ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب ہمیں تو لگتا ہے کہ خالص پانی میں نمک ڈال کر جوش دے دیتے ہیں اور پلیٹ میں لا حاضر کرتے ہیں۔ بولے پی جاؤ۔ گرم پانی اور نمک پیٹ کے لئے مفید مانا جاتا ہے۔ پورا تو ہم نے کراچی بھی نہیں دیکھا۔ کولمبو کے متعلّق کیا دعویٰ کریں کہ سارا دیکھ لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ٹیکسی والے مانع آئے ورنہ ارادہ چپّے چپّے کی سیر کا تھا۔ تہران میں تو شہر کے اندر جہاں بھی جاؤ، خواہ وہ آدھا میل ہو یا پانچ دس میل ریٹ وہی پندرہ ریال یعنی پندرہ آنے۔ اصفہان میں جہاں بھی جایئے دس آنے دیجیے۔ شیراز میں اندرون شہر ہر جگہ آپ پانچ آنے میں جاسکتے ہیں۔ اس سے کسی چھوٹے شہر میں ہم نہیں گئے۔ شاید آنے دو آنے میں یا مُفت بھی قصبے کی سیر کراتے ہوں گے۔

لیکن یہاں بات کولمبو کے ٹیکسی والوں کی تھی۔ کراچی کے رکشا ناحق بدنام ہیں۔ کہنے کو تو کولمبو کا ریٹ آٹھ آنے یا دس آنے میل ہے، لیکن وہاں کے میل کی لمبائی ٹیکسی والوں کے مزاج پر منحصر ہے۔ انگریزوں کی اندھی تقلید میں ۱۷۶۰ گز کی پابندی نہیں۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ آپ نے ٹیکسی والے کو آواز دی تو ایک میل وہیں ہو گیا۔ اس کے رکنے تک دو میل ہو گئے، اور جب آپ دروازہ کھول کر اندر بیٹھے تو چوتھے میل کا کرایہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ بیشک اکثر لوگ میٹر میں گڑبڑ کرتے ہیں لیکن ایماندار ڈرائیور بھی ہیں جو دوسرے میل سے کرایہ شروع کرتے ہیں۔

چھڑی کی تلاش میں

ڈاکٹر اختر حسین کو چھڑی کی تلاش تھی، وہی جو سیر کرنے کی چھڑی ہوتی ہے۔ ایک بار ہم مری جانے کو تھے تو انہوں نے فرمایا وہاں دیکھنا اور مل جائے تو لے آنا۔ انہوں نے اچھی طرح ہمیں اس کی وضع قطع سمجھا دی اور ہم بھی خوب اچھی طرح سمجھ گئے۔ لیکن مری سے جو چھڑی آئی تو ڈاکٹر صاحب کُچھ خوش نہ ہوئے بولے۔ ”یہ شئے مطلوبہ نہیں ہے، مُجھے جو چھڑی چاہیے وہ اور طرح کی ہوتی ہے۔ اس کا دستہ ذرا ٹیڑھا ہونا چاہیے، لیکن زیادہ بھی نہ ہو۔“ ہم نے عرض کیا ”سمجھ گئے اب آئندہ

غلطی نہ ہو گی؟" انہی دِنوں ملتان جانا ہوا، اور شئے مطلوبہ پا کر ہمیں خوشی ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی رد کر دیا، اور کہا یہ بھی بالکل ویسی نہیں جیسی میں نے آپ کو بتائی تھی۔ آخر ڈھاکہ کے ایک بازار میں گھومتے گھومتے ہمیں عین میں اسی ناک نقشے کی چھڑی مل گئی اور ہم نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا "عمدہ ہے لیکن میرے بھائی! جیسی چھڑی میں کہتا ہوں ویسی آپ کیوں نہیں لاتے؟" ہمیں حاتم کا قصّہ یاد آگیا جس سے سات فرمائشیں کی گئی تھیں۔ جن میں حمام باد گرد کا پتہ چلانا اور انڈے کے برابر موتی لانا بھی شامل تھیں۔ حاتم نے جنوں، دیوؤں اور اژدھوں سے لڑ بھڑ کر یہ سب چیزیں فراہم کر دی تھیں۔ ان سے ڈاکٹر اختر حسین کی مطلوبہ چھڑی کے لئے کہا جاتا تو ممکن ہے کہیں سے پیدا کر دیتے، لیکن ہمیں ذاتی طور پر اس میں شک ہے۔

اب جو کولمبو میں دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے جماہی لی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیا ارادے ہیں؟"

"سرِ بستر خوابِ راحت جانا چاہتا ہوں۔ یعنی سونا چاہتا ہوں۔"

فرمایا "جو سوتا ہے سو کھوتا ہے۔ اور پھر سونے کو بہت عمر پڑی ہے۔ اس وقت بازار

چلو۔"

"خیریت؟"

فرمایا"چھڑی لینی ہے۔"

ہمیں بھی اشتیاق تھا کہ دیکھیں وہ کونسی چھڑی ہے جس کا حلیہ وہ ہمیں سمجھا نہیں پاتے۔ دوسرے یہ بازار دیکھنے کا اچھا موقع تھا۔ ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر ہی مل گئی تھی۔ جب ہماری گھڑی میں تین منٹ اور اس کے میٹر میں تین میل ہو گئے تو ہم اس میں سے اتر گئے۔ ابھی ہمارے ہوٹل کا صدر دروازہ پوری طرح نظر سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔۔۔ حیرت کی بات ہے کہ تین میل سے ہوٹل صاف نظر آرہا ہے۔ بولے "ہوا کی تاثیر ہے۔ فوراً پیسے دے دو، ورنہ یہی فاصلہ چار میل کا ہو جائے گا۔ یہ ربڑ کا ملک ہے، یہاں ہر چیز میں لچک ہے۔ اب اِکّا دُکّا دُکانیں شروع ہو گئی تھیں اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، بالکل ڈھاکے کا نقشہ تھا۔ ویسی ہی دُکانیں، ویسے ہی لوگ، ویسے ہی ان کے ملبوسات۔ ڈھاکے میں بنگالی بستے ہیں یہاں سنگھالی۔ وہ بنگالی بولتے ہیں یہ سنگھالی بولتے ہیں۔ نہ وہ ہمیں آتی ہے نہ یہ۔ ہاں ڈھاکے میں اُردُو سے کام چل جاتا ہے، یہاں نہیں چلتا۔ آسانی یہ ہے کہ

یہاں قریب قریب سبھی لوگ انگریزی سمجھ اور بول لیتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سنگھالیوں کے بزرگ بدھ مت پھیلانے کے لئے بنگال ہی سے آئے تھے۔

لیکن بات ڈاکٹر اختر حسین کی چھڑی کی تھی۔ ایک دُکان سے دوسری دُکان، دوسری سے تیسری، فرنیچر والے، بانسوں والے، گھوڑوں کی کاٹھیاں بنانے والے، بساطی، نون تیل بیچنے والے، دوا فروش، بزاز، نائی، ڈرائی کلینر، گھڑی ساز۔ سبھی کی دکانیں دیکھ ڈالیں۔ لوگوں نے طرح طرح کی چھڑیاں، لاٹھیاں، ڈنڈے، ٹکڑے، شہتیر لا لا کے دِکھائے۔ اور چھڑیوں میں ٹیڑھی، سیدھی، گول، چپٹی، شام والی، بغیر شام

کی، کُتّوں کو بھگانے والی، گدھے ہانکنے والی، لکڑی کی، بیت کی، لوہے کی، پیتل کی۔ ہر وضع اور قسم کی تھیں لیکن دُرِّ مقصود یہاں بھی ہاتھ نہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کل فورٹ میں دیکھیں گے، ورنہ پٹے چلیں گے۔

ہم نے عرض کیا۔ "یعنی؟"

فرمایا "فورٹ کو تو صدر یا بندر روڈ سمجھ لو اور پٹہ ہے جوڑیا بازار، کھارادر، میٹھادر۔"

ہم نے عرض کیا "منظور۔ لیکن اس وقت چلتے ہو تو چڑیا گھر کو چلئے۔ سنتے ہیں کہ بہاراں ہے۔" یہ چڑیا گھر نہ گاندھی گارڈن کا سا ہے، نہ لاہور کے لارنس باغ کا سا۔ ہم نے لندن میں ریجنٹ پارک کا چڑیا گھر بھی دیکھا ہے، وہ بھی اپنی الگ وسعت اور شان رکھتا ہے۔ لیکن کولمبو کا چڑیا گھر جسے دہی والا یا دیہی ویلا چڑیا گھر کہتے ہیں، کُچھ اور ہی چیز ہے۔ اسے باغ کہیے یا جنگل، لیکن ہے دونوں کے بین بین۔ کولمبو میں جہاں درجہ حرارت کا اوسط ۸۱ درجے ہے، سبزہ رخوں کی قلّت ہو تو ہو، سبزے کی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے ہاں سبزے کے لئے کھاد ترائی چھڑکاؤ وغیرہ کے تکلّف کرنے پڑتے ہیں، وہاں سبزے کو روکنے کے لئے طرح طرح کے جتن کیجیے۔

اعداد و شمار ہمارے پاس نہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ دہی والا چڑیا گھر کتنے

مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن حدِّ نظر تک جنگل ہی جنگل چھایا ہوا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اسی جنگل میں سے تھوڑی سی جگہ صاف کر کے کولمبو شہر بنالیا گیا ہو۔

خیر یہاں وہ سب جانور تھے جو سب چڑیا گھروں میں ہوتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ رنگین پرندوں کی کئی نئی قسمیں دیکھنے میں آئیں۔ دیہی ویلا کی خصوصیت ہاتھیوں کا ناچ ہے۔ ہفتے میں ایک روز شام کو باجا بجتا ہے اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ناچ ہوتا ہے۔ ہاتھی ایسے سدھے ہوئے ہیں کہ ڈھول پر چوب پڑتے ہی تھرکنے لگتے ہیں۔ باجوں میں ڈھول ڈھمکے کے ساتھ طرح طرح کی نفیریاں بھی تھیں۔ ان کی گونج سے آج بھی کان سنسناتے ہیں۔ خیر اس کا ذکر اس کے موقع پر۔ اب چھوٹے بڑے ہاتھیوں کا حلقۂ رقص قائم ہو گیا۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ دیکھنے والوں میں آدھے یوروپئین ہوں گے، کیونکہ سیلون کے سیاحتی کتابچوں میں ہاتھی کے ناچ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ بعضے ہاتھی بچّے تو نقّاروں پر اپنے پاؤں کی تھاپ بھی دیتے ہیں۔ اب یہ جلوس لہراتا ہوا اور فیل غمزے کرتا ہوا ایک روش سے دوسری روش پر اور دوسری سے تیسری پر آتا ہے۔ پھر ایک جگہ رُک جاتا ہے۔ اب کوئی صاحب، بالعموم صاحبہ آگے بڑھتی ہیں اور ہاتھی میاں اسے اپنی سونڈ میں لے کر گھماتے ہیں اور لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ اب جو ہم کسی پاکستانی فلم میں کسی

پہلوان ہیرو یا ہیروئن کو ناچتے یا غمزہ کرتے دیکھتے ہیں تو دیہی ویلا زو کا ہاتھی ناچ یاد آ جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہاتھیوں کے ناچ میں ایک طرح کا ربط اور آہنگ ہوتا ہے۔

ابھی سیر سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی اور بارش بھی ایسی کہ محسن کاکوروی یاد آئے۔

سوئے کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

ابر کے کاندھے پہ لاتی ہے ہوا گنگا جل

اور اس کے بعد وہ تریڑے کہ میاں نظیر کے "برسات کا تماشا" کا منظر کھنچ گیا اور پھر تھوڑی دیر میں ابر کھُل بھی گیا۔ یہ منظر بے نظیر وارثی نے باندھا ہے۔ چنانچہ راستے میں تینوں شاعروں کی باتیں ہوا کیں۔ انگریز کے ہاں بارش زحمت ہوتی ہے اور ہمارے ہاں رحمت۔ لیکن یہ بھی پرانی بات ہوئی۔ کراچی کی بارانِ رحمت کو دیکھ کے خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی کم از کم اس معاملے میں انگریز ہو گئے۔

کھانے میں دال بھات کا ذکر ہم نے کیا۔ وہ عام آدمیوں کا کھاجا ہے۔ ایک صاحب

کے ہاں دعوت میں ایک تکلّف کی ڈش آئی تو پوچھنے لگے۔ "بوجھو یہ کیا ہے؟" ہم نے کہا "معلوم تو چاول ہوتے ہیں۔" بولے "جی نہیں، چاول کا آٹا پیس کر سوّیاں بٹی جاتی ہیں اور ان کو چھوٹا چھوٹا چاول کے برابر کاٹا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔" ہم نے پوچھا "پھر سیدھے سادھے چاول کیوں نہیں پکا لیتے؟" بولے۔ "وہ تو گنواروں کا طریقہ ہے۔ شرفا کا قاعدہ یہی ہے۔" غور کیا تو معلوم ہوا کہ صرف اس معاملے میں نہیں اور معاملات میں بھی شرفاء کا قاعدہ یہی ہے۔ خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا سیلون کے، کہ اصل چاول کو پیس کے سوّیاں بٹیں گے پھر ان کو کاٹ کے مصنوعی چاول بنائیں گے۔ سیدھے سادھے چاول کھانا مبتذل ہے۔

چاول بنانے کے علاوہ ان سوّیوں کو سیلون میں جلیبی کی صورت بھی دی جاتی ہے، اور پھر اسے کبھی سفید چھوڑ دیا جاتا ہے کبھی رنگا جاتا ہے۔ سبزیوں میں کیلے کی سبزی عام ہے۔ پلاؤ میں کاجو ڈالا جاتا ہے اور ایک انڈا بھی ہوتا ہے، چاول کے پاپڑ پر رکھا ہوا۔ اب رہا گوشت تو بودھ لوگ گائے کا گوشت عام کھاتے ہیں۔ ہم نے تعجّب کیا تو ایک صاحب بولے۔ "یہ مہاتما بدھ کا زمانہ نہیں جناب۔"

اندلس میں مسلمانوں کو مُور کہا جاتا ہے۔ سیلون میں بھی یہی نام دیا جاتا ہے۔ لیکن فقط سیلون کے قدیم مسلمان باشندوں کو۔ باقی مسلم ہی کہلاتے ہیں۔ غالباً پرتگیزوں

نے یہ نام دیا ہو گا۔ سیلون میں غالب آبادی بودھوں کی ہے۔ یعنی ساڑھے ۶۴ فیصدی۔ ہندو بیس فیصدی ہیں جن میں زیادہ تر جنوبی ہند کے آئے ہوئے اور تامل بولنے والے ہیں۔ عیسائی نو فیصدی سے کم۔ اور مسلمان پونے سات فیصدی۔ کپڑے والوں کی دُکانیں زیادہ تر سندھی ہندوؤں کی ہیں۔ ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ ہم کراچی سے آئے ہیں تو بولے "سندھی جانو؟" ہم نے کہا۔ "سندھی نہ جانو، اُردُو جانو۔" میرپور خاص کی طرف کا بنیا تھا۔ جوہری اکثر و بیشتر مسلمان ہیں۔ سیلون کے مسلمانوں کی اکثریت خوش بھی ہے اور خوشحال بھی۔ ابھی تھوڑے دِنوں پہلے تک سیلون کے وزیرِ تعلیم ایک مسلمان تھے۔ غالباً بدیع الزّمان نام تھا۔ تعلیم اُن کی علی گڑھ میں ہوئی تھی بلکہ وہاں ڈاکٹر اختر حسین اور سیّد سبط حسن وغیرہ کے دوست اور ہم زمانہ رہے تھے۔
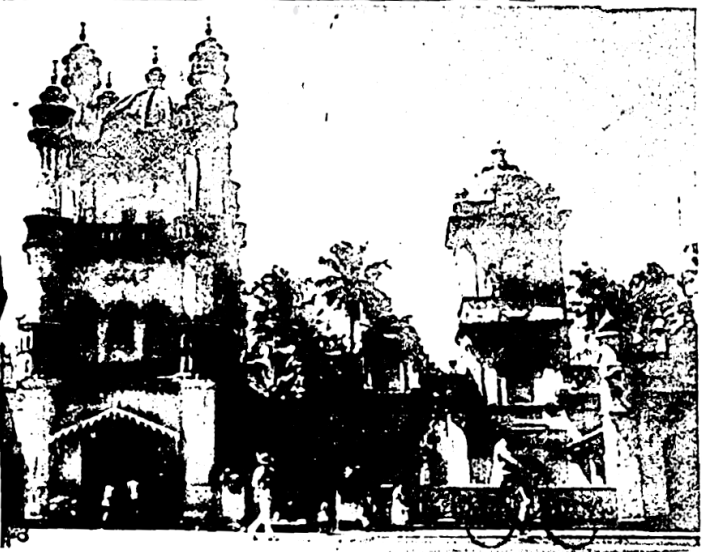
سودیشی ریل سے ایک سفر

جب کولمبو کے گرد و گرما سے جی اُچاٹ ہوا تو ڈاکٹر اختر حسین نے کہا۔۔ "اٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو کینڈی۔"

کینڈی کولمبو سے ۷۲ میل دور پہاڑ پر واقع ہے اور گذشتہ صدی تک سیلون کے سنگھالی بادشاہوں کا پایۂ تخت یہی تھا۔ کینڈی کی گاڑی علی الصُبح چھوٹتی ہے اور چونکہ ہمیں بہت صُبح اُٹھنے کی مشق نہیں رہی، لہٰذا فکر کے مارے رات میں تین بار جاگے۔

شیوررات ہی کو کر کے سوئے تھے کہ پھر سحر ہو نہ ہو کسے معلوم۔

چھ بجے تھے یا سات، صحیح یاد نہیں لیکن اس روز کولمبو اسٹیشن پر بوہنی ہمیں سے ہوئی۔ ٹکٹ کی کھڑکی ابھی بند تھی کیونکہ بُکنگ کلرک غسل خانے گئے ہوئے تھے۔ عجب اُجاڑ اُجاڑ سا اسٹیشن تھا اور اب سے کوئی تیس برس پہلے کا منظر پیش کرتا تھا۔ لُدھیانے کا اسٹیشن یاد آیا۔ لیکن کولمبو کا اسٹیشن اتنا بڑا نہیں۔ بعض پٹڑیاں تو زنگ آلود بھی تھیں۔ ہو سکتا ہے اکثر بارش کی وجہ سے یہ کیفیّت ہو لیکن ہمیں یہی گمان ہوا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد سے ان پٹڑیوں پر کوئی ریل نہیں آئی۔ انجن بھی وہ دھواں دھار پرانی وضع کے چھک چھک کرتے جو ہم نے بچپن میں دیکھے تھے اور جن کی پیٹھ پر اونٹ کی طرح کوہان سے نکلے رہتے ہیں۔ ہمارے پاس فقط دو چھوٹے چھوٹے بریف کیس تھے جن کے لئے قُلی کی ضرورت نہ تھی۔ کراچی اور لاہور کے قلی ایک بار میں جتنا بار اُٹھالیتے ہیں، دو دو بستر، ایک اِس بغل میں، ایک دوسری بغل میں، دو دو تین تین سوٹ کیس، ایک پر ایک لٹکا ہوا، پھل کی ٹوکریاں، صراحیاں، ناشتہ دان وغیرہ۔ اس کو دیکھتے ہوئے تو ہم جیسے دس مسافروں کے لئے ایک قُلی بہت تھا۔ لیکن ہمیں دیکھتے ہی چار چھ ننگ دھڑنگ قُلی بھاگے آئے، ایک نے ہمارا بریف کیس تھاما، جس میں دو قمیص اور دو پاجامے تھے۔ ایک نے ڈاکٹر

صاحب کا۔ ہمارے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ ایک قُلی اسے اُٹھانے پر مُصِر تھا۔ اور ڈاکٹر اختر حسین کے ہاتھ میں تھری کیسل کی سگریٹ کی ڈبّی تھی، ایک اس کے در پے ہوا۔

اس برّاعظم میں جوں جوں مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے جایئے، لوگوں کی بدحالی اور نکبت بڑھتی جاتی ہے۔ دو دو چار چار آنے بھی مل جائیں تو ناشتے کا سامان ہو جاتا ہے۔ خیر ہم نے تھوڑی دیر گھوم پھر کر ٹکٹ گھر سے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لئے۔ دس دس روپے کے تو تھے، اور چونکہ ابھی گاڑی کے پلیٹ فارم پر آنے میں وقت تھا لہٰذا ایک بنچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں یوں لگا جیسے ابر سا چھا گیا ہو۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا تین آدمی بنچ کے پیچھے کھڑے ہمارے اخبار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور تین سامنے اکڑوں بیٹھے دوسرا صفحہ دیکھ رہے ہیں۔ جہاں جہاں کوئی مسافر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا اسی طرح شہد کا چھتّا بنا ہوا تھا۔

آخر گاڑی آئی لیکن اس میں اوّل سے آخر تک فرسٹ کلاس کا کوئی درجہ ہی نہ تھا۔ معلوم ہوا یہ وہ گاڑی ہی نہیں۔ یہ تو فقط بشارت دینے آئی ہے کہ آپ کی گاڑی بھی اب آئی کہ اب آئی۔ آخر درِ مقصود ہاتھ آیا۔ اس میں اوّل درجہ بھی تھا۔ لیکن ملکہ وکٹوریہ کے عہد کا ڈبّہ تھا۔ گدّوں پر غلاف میلے چیکٹ، لہٰذا اخبار بچھا کر بیٹھنا پڑا۔

ایک طرف کاریڈور تھا اور تین سیٹوں کی کولکیاں سی بنی ہوئی تھیں جن میں آسانی سے پاؤں بھی نہ پھیلائے جا سکیں۔ غسل خانہ کھولا تو دھڑ سے کھل گیا۔ اس میں سامنے ایک صاحب اور صاحبہ بیٹھی نظر آئیں۔ غسل خانے کے اندر نہیں بلکہ پرلی طرف۔ غسل خانے کے دروازے دونوں طرف کھلتے تھے اور لطف یہ ہے کہ ہماری طرف کا دروازہ تو فقط اندر سے بند نہ ہوتا تھا لیکن اس جوڑے کی طرف کا دروازہ باہر سے بھی بند نہ ہوتا تھا۔ ایسے میں غسل خانہ استعمال کرنے کا سوال نہ تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔ یہ نوجوان جوڑا بھی پاکستانی تھا۔ ہمارے پاس تو بریف کیس تھے یہ اس سے بھی خالی ہاتھ تھے۔

تھوڑی دیر بعد فضا پر ہلکا ابر چھا گیا۔ اعداد و شمار کے دلدادگان کو معلوم رہے کہ سیلون میں سالانہ بارش کا اوسط ۲۱۔۹۳ انچ ہے۔ اور ٹمپریچر میں سردی اور گرمی کا فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی بہت غیرت والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جون میں اوسط ۴۰۔۸۱ درجے ہے اور جنوری میں شاندار رعایت کر کے ۴۰۔۷۹ پر اتر آتا ہے۔ سیلون کا نقشہ تو آپ نے دیکھا ہو گا جیسے ایک مُنحنی سی نارنگی یا ناشپاتی رکھی ہو۔ اس جزیرے کی چوڑان کہیں بھی ۱۴۰ میل سے زیادہ نہیں اور لمبان کی انتہا اس سے دوگنی سمجھیے یعنی ۲۷۰ میل ہے۔ کراچی چھاؤنی سے حیدرآباد ۱۰۸ میل ہے اور اس

سے اگلا جنکشن ٹنڈو آدم ۱۴۲ یعنی لنکا کی چوڑائی سے دو میل زیادہ۔ لمبان میں کراچی چھاؤنی تا ٹنڈو مستی خاں سمجھ لیجیے جو روہڑی سے تین اسٹیشن پہلے ہے۔ روہڑی جنکشن کراچی چھاؤنی سے ۲۹۳ میل پر ہے۔ خیر ذکر ابر کا تھا۔ ابر آیا اور تھوڑی دیر برسا بھی۔ گاڑی ہر اسٹیشن پر رُکتی گئی اور اسٹیشن زیادہ تر ویسے ہی تھے جیسے کسی پسنجر لائن پر ہوتے ہیں۔ راستے میں ایک آدھ جگہ کے سوا اِکّا دُکّا مسافر چڑھے اور اترے۔ خاصی دیر تو ڈاکٹر اختر حسین اپنی داستانِ حیات سُناتے رہے۔ خصوصاً ان ایّام کی کہانی جب کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا کلکتہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد تجویز ہوئی کہ چائے پی جائے۔ معلوم ہوا کہ ڈائننگ وغیرہ کی کوئی کار تو ہے نہیں کیونکہ فاصلے اتنے چھوٹے ہیں کہ ناشتہ اس شہر میں تو لنچ منزل پر۔ لنچ کر کے چلو تو شام کی چائے گھر پر پیو۔ ناشتہ کھائیں جو دلّی میں تو لندن میں ٹفن۔ البتّہ ایک چائے والے کا اسٹال گاڑی کے کسی ڈبّے میں تھا اور اس سے بار بار فرمائش کرنی پڑی کہ صاف برتن ہوں تو لانا۔ چائے آئی اور اس کے ساتھ کیک بھی آئے، معلوم ہوا کہ جس طرح ہمارے بعض کتب فروش کتاب کے ساتھ خلاصہ ضرور دیتے ہیں، اسی طرح چائے کا شوق ہے تو کیک بھی کھانا ہو گا۔ یاد نہیں کہ کیک کھایا یا نہیں کھایا۔ اتنا یاد ہے کہ پانچ روپے کا بل تھا۔

کینڈی سے کچھ پہلے پیری ڈینیا کا اسٹیشن پڑتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ کراچی سے پہلے لانڈھی یا ملیر۔ کینڈی کی یونیورسٹی پیری ڈینیا ہی میں ہے اور یہیں وہ مشہور و معروف باغات ہیں جنہیں پیری ڈینیا گارڈنز کہتے ہیں۔ اسی گارڈن میں وہ پودا ہے جو صدر ایّوب کے دورے کے دوران میں ان کی صاحبزادی نسیم اورنگ زیب نے لگایا تھا۔ یہ ہمارے جانے سے چند ماہ پہلے کی بات تھی اور یہ پودا جس کا نام بھی نسیم رکھا گیا تھا ہمیں خاص طور پر دِکھایا گیا۔ لیکن باغ دیکھنے کی بات تو شام کی ہے، پیری ڈینیا اسٹیشن پر یونیورسٹی کے لائبریرین مسٹر سوم داس (لنکا کے تلفّظ کے مطابق سوما داسا) پیشوائی کے لئے موجود تھے اور ہمیں اپنی گاڑی میں شہر چھوڑ گئے۔ کولمبو اور کینڈی کی فضا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سبزہ، ہریالی اور پہاڑ تو کولمبو نکلنے کے بعد ہی شروع ہو گئے تھے، جیسے اسلام آباد سے مری کے راستے میں۔ لیکن کینڈی تو بالکل مری تھا، وہ بھی سمجھانے کے خیال سے کہہ رہے ہیں، ورنہ کینڈی سے تشبیہہ دینا مری کی عزّت افزائی ہے۔

شہر شروع ہوا تو کولمبو کی طرح یہاں بھی مسلمانوں کی دُکانوں کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ نُور کمپنی، مزمّل ہاؤس، وہاب اسٹور وغیرہ۔ آگے ایک چوک میں مسلم ہوٹل نظر آیا۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "ہم کیوں کوئنز ہوٹل جائیں جبکہ مسلم ہوٹل

موجود ہے۔" انھوں نے کہا "تمہارا اسلامی جذبہ قابل تعریف ہے لیکن میری مانو تو رہو کوئنز ہوٹل میں، ہاں کھانے کی کہتے ہو تو لنچ یہاں کر لیں گے۔" اس پر سمجھوتہ ہو گیا اور ہم کوئنز ہوٹل میں جا اُترے۔

کوئنز ہوٹل کینڈی کا سب سے پرانا اور مشہور ہوٹل ہے اور کینڈی کی مشہور جھیل کے بالکل سامنے واقع ہے۔ سیلون آنے والے مشاہیر اور سیّاح یہیں ٹھہرتے رہے ہیں اور اس کی فضا ہندوستان کے پرانے انگریزی ہوٹلوں کی سی ہے۔ چوڑے چوڑے کاریڈور، بڑی بڑی گدّے دار کرسیاں، وسیع و عریض اور پُر تکلّف خواب گاہیں، ہر طرف ساگوان اور آبنوس کے پینل۔ مکینوں میں بھی ستّر اسّی فیصد غیر ملکی۔ معلوم ہوا کہ اور شخصیتوں کے علاوہ سومرسٹ ماہم، گراہم گرین وغیرہ بھی یہاں رہے ہیں اور اپنے ناولوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ہوٹل کے کلرک نے یہ معلوم ہونے پر کہ ہمارا تعلّق بھی لکھنے پڑھنے والوں میں سے ہے۔۔۔ رجسٹر میں ان بزرگوں کے دستخط بھی دکھائے۔ سارا عملہ خلیق اور متواضع تھا اور ہمیں جو کمرہ پہلی منزل پر ملا وہ ایک طرح سے انتخاب تھا۔ اس کی کھڑکیاں عین جھیل پر کھلتی تھیں۔ اس کے پیچھے پہاڑی تھی اور اس پر بدھ کا ایک مندر تھا۔ یہ جھیل مصنوعی ہے اور اس کے گرد سیر کے لئے ایک عمدہ سڑک ہے۔ لیکن اب بھوک لگنی شروع ہو رہی

تھی۔ لہٰذا سامان رکھ رجسٹر میں نام لکھوا ہم لوگ عازمِ مسلم ہوٹل ہوئے۔

مسلم ہوٹل ویسا ہی تھا جیسا کراچی کی بولٹن مارکیٹ کے کسی ملباری ہوٹل کو ہونا چاہیے۔ نیچے وہی پونا کڑک چائے کا ریستوران اور اوپر شرفا کے کھانے کا انتظام۔ بیرے نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے جو آدھ درجن الفاظ ہندوستانی کے آتے تھے ان سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ایک کیبن میں لا بٹھایا۔ معلوم ہوا حسن قادر نام ہے اور بمبئی دیکھ چکے ہیں۔ قدم اُن کے پھِرکی کی طرح گردش کرتے تھے اور زبان قینچی کی طرح چلتی تھی اور انگریزی، سنگھالی اور ہندوستانی سب کو ایک سا کُترتی چلی جاتی تھی۔

ہم سے پہلے کوئی صاحب کھانا کھا گئے تھے اور اس کے آثارِ باقیہ ابھی تک میز پر تھے۔ ہم نے حسن قادر صاحب سے کہا کہ میز پوش بدلو۔ اس پر انہوں نے کاندھے سے جھاڑن اُٹھا کر ہڈیاں اِدھر پھینکیں اور چاول دوسری طرف زمین پر گرانے کے بعد ہمیں مطلع کیا کہ میز صاف ہے۔۔۔ حکم دیجیے۔ ہماری بھوک چمک رہی تھی اس لئے جو کچھ مینو میں سمجھ میں آیا، ہم نے آرڈر میں کہہ دیا اور یہ کہا کہ چکن پارچہ ضرور ہو۔ تھوڑی دیر میں میاں حسن قادر چار آدمیوں کا کھانا لے آئے۔ شوربے میں ناریل کا تیل تھا جو ہمارے لئے ہیر آئل تو ہو سکتا ہے لیکن گھی کا نعم البدل

نہیں۔ لہٰذا اسے چوم کر چھوڑ دیا۔ ہاں چاول اور چکن سے شِکم پری کی۔ پانی وہاں بھی بیرے گلاس میں انگلیاں ڈبو کر لاتے تھے۔ لہٰذا اورنج اور سوڈے سے پانی کا کام لیا اور بِل دے کر ہم اس بات پر شُکر کرتے ہوئے ہوٹل واپس آئے کہ اپنی اخوّتِ اسلامی کو بے لگام نہیں ہونے دیا اور مسلم ہوٹل میں طعام کے علاوہ قیام نہیں کیا۔

کینڈی مندر کے ڈانسر روایتی لباس میں

اس کے بعد ایک کھانا چینی کھایا، ایک ولایتی اور ایک پاکستانی۔ اپنے دوست ڈاکٹر اختر امام کے ہاں، جو پہلے پاکستان کی فارن سروس میں تھے اور اب پیری ڈینیا

یونیورسٹی میں عربی پڑھاتے ہیں اور سیلون میں شادی کر کے اسی کو وطن بنالیا ہے۔ مسلم ہوٹل، میاں حسن قادر اور اخوّتِ اسلامی، اُن ارکانِ ثلاثہ سے البتّہ آخر تک گریز ہی مناسب معلوم ہوا۔

کینڈی میں بدھ کے دانت کا مندر اور مقدس ہاتھی کا جلوس

لنکا کے لاہور، کینڈی میں

یہ کینڈی ہے۔ کولمبو سے ستّر میل دور سبزے سے پٹے ہوئے کوہساروں کے درمیان۔ صدیوں تک یہ شہر سنگھالی راجوں کا پایہ تخت رہا۔ حتّٰی کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اس خاندان کے آخری راجے نے جیسا کہ ہر خاندان کا آخری راجہ کیا کرتا ہے، لوگوں پر ستم ڈھانا شروع کیا اور اس کے سرداروں نے ایکا کر کے اُسے تخت سے اُتار دیا اور مملکت کی کلیدِ سُلطانی کولمبو آ کر انگریزوں کے حوالے کر دی کہ بسم اللہ تشریف لائیے اور راج کیجیے۔ انگریزوں کو یہاں لڑ بھڑ کر قبضہ نہیں

کرنا پڑا بلکہ حکومت اُن کو پیش کی گئی۔ ہاں ایک معاہدہ کیا گیا کہ لوگوں کو زبردستی عیسائی نہ بنایا جائے گا۔ انصاف سے کہنا پڑتا ہے کہ جس صلح صفائی سے انگریز آئے اسی صلح صفائی سے چلے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں ان لوگوں نے ہندوستان اور پاکستان سے رختِ سفر باندھا تو سیلون والوں سے بھی اجازت چاہی کہ مکان سے جا رہے ہیں تو غسل خانہ اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے۔ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ کا گھر ہے چندے اور قیام کیجیے لیکن مسافر کا جی اُکھڑ گیا تھا۔ آخر فرمائش کی گئی کہ آپ آزادی دینے پر ایسا ہی اصرار کرتے ہیں تو اپنی یاد دِلانے کو ایک گورنر جنرل ہی چھوڑ جائیے۔ یہ بات البتّہ مان لی گئی اور کچھ دِنوں وہاں کا گورنر جنرل انگریز رہا۔ لنکا میں انگریزوں سے ان مخلصانہ تعلقات کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ساحلی علاقوں کی حکومت جِن میں کولمبو بھی شامل ہے، لنکا والوں سے نہیں ولندیزیوں یعنی ہالینڈ والوں سے چھینی اور انہوں نے پرتگیزوں سے ہتھیائی تھی۔ ہندوستان کے مغربی ساحل کی طرح یہاں بھی پہلے پرتگیز ہی آئے اور حسبِ دستور سنگھالی راجاؤں سے ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت لی۔ ان دِنوں سنگھالی راجاؤں کا بڑا پایۂ تخت کولمبو کے قریب کوٹی میں تھا۔ پرتگیزوں کا تعصّب، اکھڑ پن اور بہیمیت ہمیشہ سے مشہور ہے، لہٰذا لوگوں کو پُرتگیزی پسند نہ آئے، اور کوٹی کے راجا بھی

چونکہ کمزور اور نالائق تھے لہٰذا اٹوڈی ٹھہرے اور کینڈی میں ایک آزاد بادشاہت کی بنیاد رکھی گئی۔ شمال میں تامل راجاؤں کی حکومت کو تو پرتگیزوں نے تاخت و تاراج کیا۔ کینڈی والے خُود مختار رہے۔ ولندیزی بھی جنہوں نے سترھویں صدی کے وسط میں پرتگیزوں کو نکالا، کینڈی کے راجاؤں کا کُچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہ نسبتاً اچھے لوگ ثابت ہوئے۔ انہوں نے پُل، چاہ، گرجا اور تالاب وغیرہ فیض کے اسباب بنائے اور نام پیدا کیا۔ ڈیڑھ صدی بعد ۱۷۹۸ء میں انگریزوں کا اقبال شروع ہوا اور ولندیزی بھاگے۔ باقی کہانی اُوپر بیان کی جاچکی ہے۔ پُرتگیز اور ولندیز جاتے ہوئے اپنی اولاد البتہ چھوڑ گئے، یہ لوگ برگھر کہلاتے ہیں۔ آباء اِن کے پُرتگیز اور ولندیز اور شاذ صورتوں میں انگریز اور مائیں سیلونی تھیں۔

کینڈی کو لنکا کا لاہور یعنی ثقافتی مرکز کہا جاتا ہے۔ کینڈی میں راجاؤں کے محلات کی باقیات موجود ہیں لیکن زیادہ تر لوگ پیری ڈینیا کے باغات اور بُدھ کے دانت کے مندر دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ باغ جن کے درمیان پیری ڈینیا یونیورسٹی ہے کینڈی سے کوئی پانچ دس میل کے فاصلے پر ہیں اور صدیوں پرانے ہیں۔ کہتے ہیں راجہ وکرم باہو دوم نے ان کی بِنا رکھی تھی۔ یہ سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فٹ کی اونچائی پر ہیں۔ سوم داس صاحب یونیورسٹی لائبریرین نے پہلے اپنا گھر دکھایا جو قُلّہ کوہ پر واقع تھا اور

میلوں دُور کے نظر فریب جنگل وہاں سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ اتنی اچھی جگہ رہ کر کسی کا کتابیں پڑھنے کو کیا جی چاہے گا۔ ڈاکٹر اختر حسین سے بھی یہی سوال کیا کہ زاہد تجھے قسم ہے جو تُو ہو تو کیا کرے۔ اس پر دونوں ہنس دیے۔ یونیورسٹی کے بلاک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلے ہوئے ہیں اور اِن کے درمیان بھی باغوں کے سلسلے ہیں۔ یہ لگتا ہے کہ طلبا اور طالبات کے ہجوم یہاں پڑھنے نہیں پکنک منانے آئے ہیں۔ ایک چکّر ہم نے لائبریری اور بُدھسٹ انسائیکلوپیڈیا کے دفتر کا کاٹا جو اسلامی انسائیکلوپیڈیا سے بھی ضخیم ہو گی اور جس پر دِن رات اسکالر محنت کر رہے ہیں۔ پھر ڈاکٹر اختر امام کے کلاس روم میں گئے۔ اُن کی عربی کلاس میں اِس وقت دس کے قریب طالبِ علم تھے اور وہ اُن کو جاحظ پڑھا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر میں اپن سے مُنہ موڑ کر ہمیں پڑھانے لگے اور جاحظ کے اشعار کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی اشعار بھی اُن کے لیکچر میں شامل ہوتے گئے! آخر ہمیں توجّہ دِلانی پڑی کہ یہ سیلون یونیورسٹی ہے۔

ڈاکٹر اختر امام عجیب شخصیت ہیں۔ یہ مشہور نقّاد نوّاب امداد امام اثر کے پوتے ہیں جن کی تصنیف ”کاشف الحقائق“ مشہور ہے۔ تعلیم اِن کی علی گڑھ میں ہوئی اور بعد ازاں جرمنی سے انہوں نے ڈاکٹریٹ کی۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں یہ

کولمبو میں عربی اور اسلامیات وغیرہ پڑھاتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں فارن سروس میں آئے اور مختلف ملکوں میں سفارتی خدمات بجالائے۔ غالباً انڈونیشیا میں تھے کہ استعفیٰ دے کر دوبارہ سیلون چلے گئے اور از راہِ جوہر شناسی ایک سیلونی مسلمان خاتون سے، جو وہاں کے ایک معزّز جوہری خاندان سے تعلّق رکھتی ہیں، شادی کر کے وہیں آباد ہو گئے۔ اب شہریت کے اعتبار سے سیلونی ہیں لیکن معاشرت کے اعتبار سے پاکستانی۔ اُن کی بیگم بھی اُردُو بولتی ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے یہ ہم سبق تھے اور اب یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کو ہم زاد کہہ کر پُکارتے ہیں۔ پچھلے دِنوں کراچی آئے تو ادبی محفلوں اور اسلامی جلسوں کی رونق بنے رہے۔ ایک روز گھر پر ملنے تشریف لائے۔ ہمیں باہر تک آنے میں دیر ہوئی تو یہ سامنے قوّالی کے جلسے میں چلے گئے اور پھر صُبح تک بیٹھے سر دُھنتے رہے۔

ہمارے ہوٹل کے پاس کی گلی میں ایک پُر فضا ذاتی مکان میں ان کا قیام تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ان کے ہاں کھایا اور وہ پاکستانی کھانا تھا۔ سارے کینڈی میں لوگ چاول کھاتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر امام کے گھر سے چپاتیاں پکنے کی آواز آتی ہے۔

پیری ڈینیا کے باغ میں پان کی دُکان اور باورچی خانے کا پورا سامان تھا۔ ہم نے لونگ درختوں میں لگے ہوئے پہلی بار دیکھے۔ درخت پر پک کر بھی ان کی رنگت سبز ہی

ہوتی ہے۔ رکھے رکھے کالے پڑتے جاتے ہیں۔ الائچی کے پودے بھی تھے، دار چینی کے درخت بھی، اور کالی مرچوں کے پیڑ بھی۔ بارہ مسالوں کا باغ تھا اور خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ پھول باغ اسی کا ایک حصّہ تھا جس میں بیگم نسیم اورنگ زیب کا لگایا ہوا پودا لہلہا رہا تھا۔ ہم باغ واغ کی سیر سے فارغ ہوئے تو ہم نے کہا اب مزید سبزے کی ہماری آنکھوں میں گنجائش نہیں۔ فی الفور بُدھ کے دانت کا مندر دِکھاؤ۔ گاڑی چھوٹی جا رہی ہے۔ سوم داس نے کہا: "اچھا شام کو۔" شام کو سوم داس آئے تو اوپر سے نیچے تک بھکشو بنے ہوئے تھے اور ہاتھ میں چڑھاوے کے لئے پھولوں کی ٹوکری لئے ہوئے تھے۔ ایک ایک ٹوکری انہوں نے ہمارے ہاتھ میں تھمائی اور کہا سلیپر پہن لو، وہاں اُتارنے پڑیں گے۔ روایت ہے کہ بُدھ کا یہ دانت اصلی نہیں بناسپتی ہے۔ اصلی دانت تو پرتگیز گوا لے گئے تھے اور سولہویں صدی کے وسط میں انہوں نے ضائع کر دیا۔ لیکن بُودھوں کا کہنا ہے کہ نہیں اصلی دانت چھپا لیا گیا تھا اور وہی اب کینڈی کے مندر میں ہے۔ بہر حال یہ مندر اس دانت کی وجہ سے سیلون کی مقدس ترین زیارت گاہ بن گیا ہے اور ہر سال اگست میں پورے چاند کی رات کو میلے اور جشن کے ساتھ اس کا جلوس نکلتا ہے۔ اس جلوس کی دھج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ سیلون سے ہزاروں لاکھوں یاتری کینڈی میں ہجوم کر آتے ہیں۔

پہلے تو ہاتھیوں کی پریڈ ہوتی ہے جن پر موتیوں اور جواہر سے لیس رنگ برنگے جھول پڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے سب سے شاندار ہاتھی کو سب سے شاندار مرصع جھول سے آراستہ کر کے اس پر بُدھ کے دانت کا صندوقچہ رکھا جاتا ہے۔ لوگوں کے اُودے اُودے نیلے پیرہن اس رونق کو چار چاند لگاتے ہیں۔ ان ہاتھیوں کے آگے آگے گیروے لباسوں میں ملبوس بھکشوؤں اور رنگارنگ ملبوسات میں اونچی بنے امیروں اور سرداروں کے غول ہوتے ہیں۔ سر پر چو گوشیہ ٹوپیاں اور رنگارنگ جھلملاتی ریشمی واسکٹیں۔ بعضے تو سُنا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ سو گز کا ریشمی تھان لپیٹ کر چلتے ہیں۔ کُچھ کاندھے پر ڈالا اور باقی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ ان سے آگے ڈھول تاشے اور نفیریوں والے جن کی آواز سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دے۔ اور سب سے آگے چاؤش، دور باش پکارتے اور کوڑے لہراتے۔ ان کوڑوں سے وہ نادیدہ راکششوں کو بھگاتے ہیں۔

باجے والوں کے لباس سفید اور بیشمار منکوں کی مالائیں زیبِ گلو ہوتی ہیں، اور ان میں سے کُچھ ناچتے بھی جاتے ہیں۔ دانت کا صندوقچہ چاندی کا ہے اور بھاری بھر کم۔ اس کو کھولئے تو ایک اور منقّش جواہر آلود صندوقچہ نکلے گا۔ اس میں سے ایک اور منقّش تر۔ یوں ایک کے بعد ایک سات صندوقچے ہیں اور آخری میں وہ دانت ہے جس

کے لئے اس تجمّل اور شکوہ کا بندوبست کیا جاتا ہے اور جس کے متعلّق ایک روایت یہ ہے کہ بُدھ کا ہے ہی نہیں۔

لیکن یہ تو جلوس کی بات ہوئی جو فقط ساون کی پورے چاند کی رات کو نکلتا ہے۔ ہم وہاں جنوری میں تھے اور ہم نے یہ دانت مندر میں دیکھا۔ اور مندر کا ماجرا جو چشم دید ہے اس سے الگ ہے۔

دانت کے درشن

جس طرح دہلی لال قلعے کی وجہ سے، آگرہ تاج محل کے نام پر، لاہور شالامار باغ کی نسبت سے، خورجہ شلجم کے اچار اور قصور اپنی میتھی کی خوشبو سے مشہور ہے۔ اسی طرح کینڈی کی شہرت کا رشتہ مہاتما بُدھ کے دانت کے مندر سے بندھا ہے۔

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں، دِکھانے کے اور۔ مہاتما بُدھ کا یہ دانت کھانے کا بھی ہے اور دِکھانے کا بھی۔ آیا یہ گوتم بُدھ کے کھانے کے کام آتا رہا ہے یا

کسی اور کے، یہ امر تحقیق نہیں۔ لیکن اس سے ہمیں غرض بھی نہیں۔

تو صاحبو! سوم داس جی ہمیں بُدھ دیو کے مندر میں لے گئے۔ اس شان سے کہ وہ گیرواجامہ زیب تن کئے، کھڑاؤں سے کھٹ پٹ کرتے جارہے تھے اور یہ بندہ اور ڈاکٹر اختر حسین نعلین در بغلین۔ خضر کی صورت بزرگ صرف مسجد میں نہیں، مندر میں بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے جوتوں سے ہوشیار رہنا بھی عبادت کا ایک جُزو سمجھنا چاہیے۔ ہم تو پھر ہم تھے، وہاں کُچھ فرنگی نژاد سیاح بھی اس حلیے میں تھے۔ خیر ایک رکھوالے مِل گئے اور ہم یہ امانتیں اُن کے سپرد کر کے سبکدوش ہو گئے۔ اس مندر کے دو دروازے ہیں۔ ایک بغلی، ایک سامنے کا۔ دونوں سڑک سے خاصے اُونچے۔ متعدّد سیڑھیاں چڑھ کر عمارت کی کرسی آتی ہے۔ اندر ڈیوڑھیاں ہی ڈیوڑھیاں اور ستون ہی ستون ہیں۔ ایک طرف قدِّ آدم سے بھی بڑے بڑے شیشوں میں بودھ دیو کے مجسّمے مختلف شکلوں میں اور مختلف سائزوں میں ٹِکے ہوتے ہیں، اور کپل وستو کے راج کمار کے جمال جہاں آرا کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ ہر ستون کے ساتھ ڈھول پیٹنے والوں کے نیم برہنہ غول چوب پر چوب لگائے جارہے ہیں۔ اُدھر پرلی طرف نفیریوں والے ہیں۔ شور اس بلا کا ہوتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ ڈھول والے کے چوب کی ہر ضرب سیدھی آپ کے دماغ

پر پڑتی ہے اور اگر آپ چاہیں کہ اس احاطے میں زبانِ نطق سے کوئی بات کر لیں تو یہ خیال خام ہے۔ کسی کو کچھ کہنا سُننا ہے تو اشاروں سے کلام کرے۔ یہ ڈھولکیلئے بھی خاندانی ہیں۔ یعنی ان کے باپ دادا، نگڑ دادا تا بہ ہفتاد پُشت کی زندگی اسی مندر میں ہر شام بلا ناغہ ڈھول پیٹتے گزری ہے۔ ان کو ثواب کے علاوہ کچھ روزینہ بھی مندر سے ملتا ہے اور مندر کو عقیدت مند زائرین کے علاوہ سرکار سے بھی کُچھ یافت ہوتی ہے۔ غالباً جاگیر بندھی ہے۔
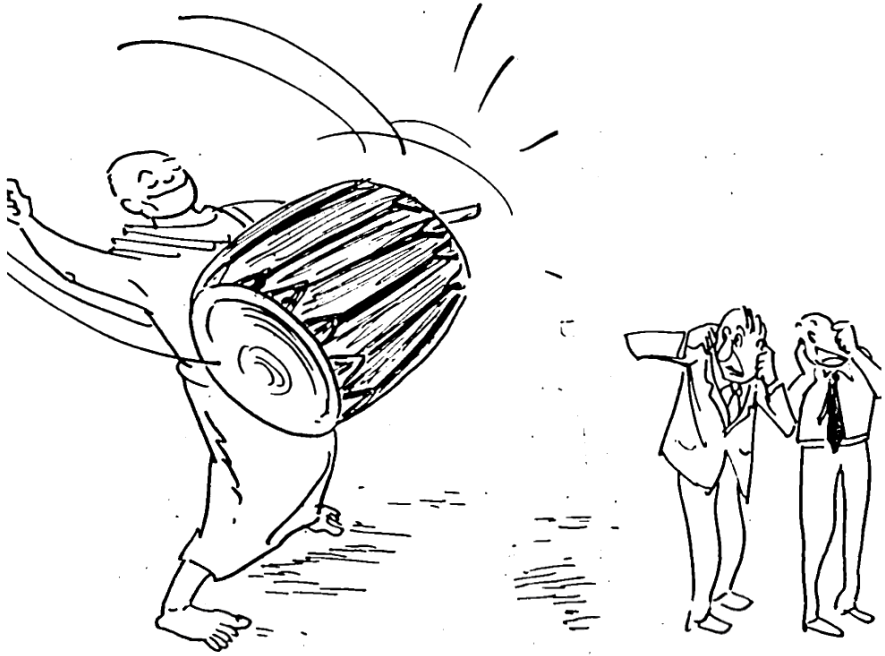
یہ شورِ بے محابا ہر شام کوئی چار بجے شروع ہو جاتا ہے اور سات آٹھ بجے تک رہتا ہے۔ڈیوڑھیوں سے کئی غلام گردشیں اِدھر اُدھر کو جاتی ہیں۔ لیکن دندانِ مقصود جن سنہری اور روپہلی صندوقچوں میں بند ہے وہ وسطی حصّے میں ایک شہ نشین پر ہے اور اس کے لئے سات دروازوں میں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایک دو دروازے تو بخشیش کی غرض سے غیر ملکی اور فرنگی سیّاحوں کو بھی دِکھائے جاتے ہیں۔ اس سے آگے کسی غیر بودھ کا بلکہ ہر ایرے غیرے بودھ کا جانا محال ہے۔

ہمیں سوم داس کی عنایت سے ساتوں دروازے اور وہ صندوقچہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ لیکن دانت ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ فقط فرض کر لیا۔ ان صندوقچوں کو ہر روز غسل دیا جاتا ہے اور ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ پریہار کے تہوار کا ذکر ہم کر چکے ہیں جو ساون کی پورن ماشی کو ہوتا ہے اور جس میں ہاتھیوں پر اس دانت کے صندوقچے کا جلوس نکلتا ہے۔ کوئنز ہوٹل کے سامنے جو جھیل ہے اس کے اطراف میں اُونچی اُونچی پہاڑیاں ہیں۔ انہی سے ایک پہاڑی پر ایک مندر بھی نظر آتا ہے جس کے متعلّق مشہور ہے کہ اس پر پریہار کی رات کو ایک کنواری کی قربانی دی جاتی تھی۔ پروہت کنواری کو نامزد پہلے سے کر لیتے تھے اور اس کی سال بھر دُلہن کی طرح پرورش اور نگہ داری ہوتی تھی۔ قربانی کی رات پہاڑی پر جا بجا الاؤ

سلگائے جاتے تھے اور پھر یہ قربانی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ لنکا میں کینڈی کے اس جانباز دولہا کی داستان مشہور ہے اور عوامی گیتوں کا موضوع ہے جو جان پر کھیل کر اپنی منگیتر کو عین قربانی کے چبوترے سے بچا لایا تھا۔ یہ قربانی غالباً اس صدی کے آغاز تک ہوتی رہی، اس کے بعد موقوف ہوئی۔

بودھ کے دانت کا مندر دیکھنے کے بعد سیاح کے لیے کینڈی میں مزید قیام کا اخلاقی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ سیّاح اگر آگرے جاتا ہے تو یہ دیکھنے کیلئے تاج محل اپنی جگہ پر قائم ہے اور لاہور جاتا ہے تو یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ وہاں شاہی مسجد نام کی واقعی ایک عمارت اور شالامار نام کا ایک سچ مچ کا باغ ہے، تاکہ وہ وطن واپس جا کر لوگوں کو یہ بتا کر رشک سے جلا سکے کہ میں نے یہ چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ یہ فقط انسان کی فطرت ہے ورنہ کوہ پیمائی کرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ پہاڑ پر سوائے برف اور پتھّروں کے کیا رکھا ہے اور لونگ اسٹون نے افریقہ کے جنگلوں میں دوڑ دھوپ کی تو اسے کیا ملا۔ پھر سُنتے ہیں کہ فلاں جوڑا صحرائے اعظم کی تفتیش کو نکلا اور پھر اُس کا سُراغ نہ ملا۔ چارپائی پر لیٹنے اور لیٹے رہنے میں جو آسودگی ہے اسے یہ نادان کیا جانیں۔ تو قصّہ یہ کہ کینڈی ایسا پُر فضا مقام ہے کہ جی چاہتا ہے عمر یہیں بسر کیجیے۔ بودھ کے دانت کے مندر سے قطع نظر ہر طرف سکون ہے۔ لیکن

اے غمِ دوراں۔ یہاں فرصت کسے۔ چل سو چل۔

کوئنز ہوٹل کے برآمدے میں بھی ایک ٹریول سروس والا بیٹھا تھا۔ اس سے نوریلیا آنے جانے کا بھاؤ پوچھا تو معلوم ہوا پچپن روپے لگیں گے۔ سوچا کسی اور سے معاملہ کرنا چاہیے۔ بسوں کے اڈّے پر کئی ٹیکسیوں والے مل گئے۔ ایک شخص عجب حرفوں کا بنا ہوا تھا اور دیدے گھما گھما کر باتیں کرتا تھا۔ اس کا نام پریرا تھا اور اس نے کہا آپ کو ایسی سیر کراؤں گا کہ عمر بھر یاد رہے۔ اب یہ خیال نہیں کہ اس نے کیا مانگا تھا لیکن چالیس روپے میں معاملہ طے ہو گیا۔ یعنی کہ نوریلیا جانا، وہاں دوپہر بھر توقّف کرنا اور شام کو ٹیکسی میں واپس ریلوے اسٹیشن پہنچانا۔ نوریلیا سے ریل بھی آتی ہے جو پیری ڈینیا سے کولمبو کی طرف ایک اسٹیشن پر آ کر ملتی ہے۔ یعنی کینڈی واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ ہوٹل آکر منیجر سے ہم نے کہا ٹریول سروس والا تو لوٹتا ہے۔ ہمیں ایک ایسا مُستعد ڈرائیور مل گیا ہے جو چالیس روپے میں آنا جانا مان گیا ہے۔ منیجر نے کہا۔ اس مستعد ڈرائیور کا نام پریرا تو نہیں؟ ہم نے کہا بے شک۔ اس نے کہا وہ شخص دو بار جیل ہو آیا ہے۔ ہم نے کہا وہ تو کہہ رہا تھا کہ ایسی سیر کراؤں گا کہ عُمر بھر یاد رہے۔ منیجر صاحب بولے۔ سچ ہی تو کہہ رہا ہے۔

اس غریب الوطنی میں پندرہ روپے سے زیادہ اپنی جان قیمتی نظر آئی۔ لہٰذا ہم نے

پچپن روپے پر ٹریول سروس ہی سے معاملہ کر لیا۔ اس دوران میں ہمیں یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ ٹریول سروس والا مسلمان بھائی ہے۔ اسے چھوڑ کر پریرا کافر سے معاملت کرنا حمیّتِ دینی کے خلاف ہو گا۔ ٹریول سروس والے نے یہ بھی ذمّہ لیا کہ پریرا کو مطلع کر دے گا کہ صُبح دَم آنے کی زحمت نہ کرے۔ صُبح ابھی ہم جاگے ہی تھے کہ بیرے نے اطلاع دی ایک شخص سیڑھیوں پر کھڑا آپ کو یاد کر رہا ہے۔ ہم نے کہا۔ اس سے کہو کہ یاد کرنے کی ضرورت نہیں، ہم نے کہیں اور معاملہ کر لیا ہے۔ لیکن وہ آسانی سے ٹلنے والی آسامی نہ تھا، اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وعدہ خلافی کے اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر زور دے رہا تھا۔ قیاس کہتا ہے ٹریول سروس نے اسے بر وقت منع کرنا ضروری نہ سمجھا۔ آخر ہم نے پانچ روپے تاوان کے طور پر بھجوائے۔ اس کے باوجود جب ہم ہوٹل کی ڈیوڑھی میں پہنچے وہ چابک لئے اپنی زبان کو قینچی کی طرح چلائے جا رہا تھا اور اپنے بازو تہدیدی انداز میں اس وقت تک لہراتا رہا جب تک ہماری ٹیکسی حدِّ نظر سے باہر نہ نکل گئی۔

نوریلیا اور کولمبو کے راستے میں وہ مقام نظر آتا ہے جہاں مشہور فلم The Bridge of River Kuwai کے لئے پُل بنایا گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ یہ مقام دیکھنے بھی آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی مشہور فلمیں جن میں منطقۂ حارہ کے سین ہیں، سیلون ہی میں فلمائی گئیں۔ مثلاً پلانٹرز وائف Planter's wife ایلی فنٹ واک Elephant Walk پرپل پلین Purple Plain بیچ کومبر Beach Comber اور Outcast of the Island۔ وجہ اس کی ایک تو سبزے اور کوہساروں کی فراوانی، دوسرے ہاتھیوں، مہاوتوں اور مزدوروں کی ارزانی۔ افسوس کہ سیلون کی اپنی فلمیں وہی سستے رومانوں کا ملغوبہ ہوتی ہیں۔ جس سبزۂ گُل کے پیچھے باہر کے لوگ بھاگتے ہیں، مقامی لوگوں کے لئے گھر کی مُرغی ہوتا ہے۔ اب کس کس سے جا کے کہیں کہ اے غافل افغان اپنی خودی پہچان۔

جنّت میں گُمشدگی

ہمارے ڈرائیور کا نام سعید تھا اور اس کا کام ہی سیاحوں کو نوریلیا کی سیر کرانا تھا۔ مردِ معقول تھا۔ انگریزی اچھی بولتا تھا اور اس طبقے میں جو تملق اور لالچ ہوتا ہے، اس سے بری معلوم ہوتا تھا۔ ایک وجہ اس کی طبیعت کے پسندیدہ ہونے کی یہ تھی کہ مسلمان تھا اور پاکستان سے ارادت رکھتا تھا۔ اس کی ٹیکسی میں ہم صُبح دم آٹھ بجے یا کچھ پہلے روانہ ہوئے تھے اور نوریلیا کوئی تین گھنٹے کا راستہ ہو گا، ممکن ہے کچھ زیادہ۔ راستے کی جاذبیت کا تو کیا کہنا۔ جی کو راستہ بھر یہی تحیّر رہا کہ سبزۂ و گُل کہاں سے

آئے ہیں، اَبر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟ اُونچے اُونچے پہاڑوں کے سلسلے ہی سلسلے چلے گئے تھے جن کی ڈھلوانوں پر چائے کے باغات تھے۔ بعض جگہ چائے چننے والیوں کے غول بھی نظر آئے اور ایک پہاڑ پر کسی پلانٹر کا بورڈ نظر آیا Lebuk Ellu And Co ہم تو اسے بھی کسی انگریز یا پُرتگیز کا نام سمجھے تھے لیکن سعید نے بتایا کہ مسلمان ہے۔ اب رہا نام تو علی تو اس میں صاف ہے۔ جب یہاں کے لوگ صادق کو Sadick لکھ سکتے ہیں تو علی کو ایلی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن لبوق کیا ہے یہ معمّا حل نہ ہو سکا۔ راستے میں کہیں کہیں بستیاں تھیں اور آخر میں نوریلیا کی بستی بھی تھی۔ چھوٹا سا بازار، زیادہ تر کھپریلوں کے مکانات، کچھ دُکانیں چائے کی، اور کُچھ اشیاء ضرورت کی۔۔۔ یہاں ہم نے بھی چائے پی اور سعید نے بھی۔ اور اب نوریلیا کے جنگلات یا باغات کی ڈھلانوں کا آغاز ہو گیا۔ ڈھلانوں پر خوبصورت رَوشیں بنی تھیں جن کے دونوں طرف پھُولوں کے تختے تھے۔ پیچ در پیچ چڑھائیاں چڑھتے ہوئے جس میں ہر پیچ پُر فضا اور خُنک ہو جاتی تھی، ایک نسبتاً سطح حصے پر آ کر ڈرائیور نے کار روک لی اور کہا میں یہاں ٹھہرتا ہوں اب آپ سیر کیجیے۔ لیکن دیکھیے راستہ نہ بھول جایئے گا۔ ایک بجے میں آپ کو یہیں ملوں گا پھر گرینڈ ہوٹل چل کر لنچ کر لیجیے گا۔

اس باغِ خوبی میں ٹیڑھی میڑھی رَوشیں اور راستے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک سر رشتہ پکڑا اور چل دیئے۔ جو تختہ پھُولوں کا سب سے زیادہ دِل آویز نظر آتا اُدھر کو ہو لیتے۔ جگہ جگہ جھرنے آتے تھے جن پر چھوٹی چھوٹی پلیاں بنی ہوئی تھیں۔ بیلوں نے پھیل کر اس رستے میں جا بجا محبّت کرنے والے جوڑوں کے لئے جعفریاں سی بنا دی تھیں۔ ایک جوڑے کو دیکھ کر ہم نے رشک بھی کیا۔ اس وسعت کے باوجود باغبانوں نے تراش خراش کا کمال دِکھایا تھا۔ کوئی کونا خود رَو جنگل کی طرح بے ترتیب نہ تھا۔ یہاں ہم نے اتنی قسم کے پودے اور اتنے رنگوں اور صورتوں کے پھول دیکھے کہ عمر بھر نہ دیکھے ہوں گے۔ اور ہوا میں وہ شراب کی تاثیر تھی کہ جی چاہا یہیں ڈیرے ڈال دیجیے اور غمِ دوراں سے استعفیٰ بھیج دیجیے۔ ڈاکٹر اختر حسین نے کہا اس کو آب و ہوائے جنّت کہتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ اگر جنّت میں ایسی آب و ہوا ہے تو ہمیں وہاں جانا منظور ہے۔ کینڈی نے کولمبو کو بھلا دیا تھا۔ نور ریلیا کو دیکھ کر کینڈی جی سے اُتر گیا۔ آخر وہی ہوا۔ اِن رَوشوں میں کھو کر ہم اتنی دور نکل گئے کہ واپسی کا راستہ یاد نہ رہا۔ ڈاکٹر اختر حسین کہتے تھے ہم ادھر سے آئے تھے۔ ہمارا خیال دوسری طرف کا تھا۔ اور تو اور پورب پچھم اُتر دکھن کا بھی پتہ چلانا محال تھا۔ سر پر سورج نہیں، ابر تھا۔ ایک بار برس بھی چکا تھا۔ ہم نے کہا ڈاکٹر

صاحب اب کیا ہو، اس بھول بھُلیّاں میں میلوں تک آدم نہ آدم زاد، ہمارا سُراغ ملا بھی تو ہفتوں بعد ملے گا جب کوئی اِدھر سے گزرے گا۔ بولے! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے جنّت میں جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے تمہاری سُنی گئی۔ لیکن میں نے ایسی کوئی خواہش نہ کی تھی۔ اسے کہتے ہیں گیہوں کے ساتھ گھن کا پسنا۔ تھوڑی دیر میں سبزۂ و گُل کی خوبصورتی بھی دُھندلانے لگی۔ اس لئے حواسِ خمسہ پر راستے کی فکر کے ساتھ ساتھ بھوک کا غلبہ ہونے لگا تھا۔

نوریلیا کے باغات کی بھول بھلیّوں میں جب پورب پچھم کسی طرف کی ڈور کا سِرا نہ ملا تو ہم نے کہا: "ڈاکٹر صاحب اب تو ہماری بازیابی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ کولمبو کے اخباروں میں تلاشِ گُمشدہ کا اشتہار دیا جائے کہ اس اس حلیے کے دو پاکستانی اس دشتِ ناپید اکنار میں کھو گئے ہیں۔ بولے بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ اشتہار دینے کے لئے ہم میں سے جائے کون اور کیسے؟ ہم نے کہا۔ یہ بات تو ہم نے بھی نہ سوچی تھی۔ ناچار تن بہ تقدیر پھر اٹکل اور عقلِ حیوانی سے کام لیتے ہوئے راستہ تلاش کرنا شروع کیا، اور پھر یہ ہوا کہ ہم ایک مانوس نشان پر نکل آئے اور سعید کی کار اس سے بہت دور نہیں تھی۔ اب فکر صرف دعوتِ کام و دہن کی تھی لہٰذا سعید سے کہا۔ میاں جھٹ پٹ گرینڈ ہوٹل لے چل تا کہ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں

نکلے۔ یہ ہوٹل واقعی گرینڈ یعنی عظیم الشّان ہے اور حکومتِ انگلشیہ کی سطوتِ رفتہ کی یاد دِلاتا ہے۔ جس طرح پیری ڈینیا یونیورسٹی درس گاہ سے زیادہ مری یا نتھیا گلی کا قصبہ معلوم ہوتی ہے اسی طرح گرینڈ ہوٹل بھی کسی انگریز رئیس کے دیہاتی محل کی طرح نوریلیا کی سطح مرتفع پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ایک بلڈنگ ہے جس میں ریسیپشن ہے۔ اس سے کچھ دور دوسری جس میں طعام گاہ ہے۔ تیسری میں استراحت فرمایئے۔ بیٹھنے کا لاؤنج بھی بہت لمبا چوڑا ایوان، جس کے آرام دہ صوفوں میں تا بہ کمر دھنس جایئے۔ بہت کم لوگ تھے۔ سُنا ہے سیاحوں کی یورش اپریل میں ہوتی ہے۔ ایک حصّہ میں ریکارڈ پلیئر لگا ہوا تھا اور وہیں سے لق و دق ڈائننگ ہال کو راستہ جاتا تھا۔ ہم وہاں بیٹھتے تو اس بھری دنیا میں تنہا نظر آتے، لہٰذا باہر کے برآمدے میں ایک گوشہ دریافت کیا اور وہیں نشست کی۔

بچپن میں ہمارے گاؤں میں ایک عامل ہمیں حضرت سلیمانؑ کا دیدار کرایا کرتے تھے۔ دیکھنے کے لئے چودہ سال سے کم عمر کی شرط تھی۔ ناخن پر تیل لگا کر آئینے کی طرح اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کرنے کی ہدایت کی جاتی۔ اور پھر عامل صاحب منظر نامہ بولتے جاتے اور ہمیں فقط اثبات میں جواب دینا ہوتا تھا۔ ان کی رننگ کومنٹری کچھ اس طرح کی ہوتی۔۔۔ اب حضرت سلیمانؑ کا جمعدار آکر جھاڑو لگا رہا

ہو گا۔ ہم کہتے نظر نہیں آتا۔ فرماتے غور سے دیکھو گرد اُڑ رہی ہو گی۔ ہم کہتے، جی ہاں اُڑ رہی ہے۔ اس کے بعد حضرت ممدوح کا سقّہ آ کر چھڑکاؤ کرتا۔ وہ بھی جمعدار کی اُڑائی گرد میں ہمیں نظر نہ آتا۔ لیکن ہاں کیے ہی بنتی۔ یوں بھی چونکہ معمول کے لئے معصوم ہونے کی شرط تھی لہٰذا نفی میں جواب دینا ہمارے حق میں نہ پڑتا۔ آخر میں تخت بچھانے والے آتے۔ کم از کم آنے چاہئیں تھے۔ اور بعد ازاں حضرت سلیمانؑ اپنے جنّوں کے بصد کروفر تشریف لاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ہمیں اپنے دیدار کے لائق نہ سمجھا۔ تاہم اس وقت اس کی تصدیق کرنی پڑتی۔ اس سارے قصّے کا سفرنامے سے کوئی تعلّق نہیں۔ یہاں فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ ہوٹل گرینڈ کے بیرے اس ترتیب سے آئے۔ ایک آیا چھری کانٹے رکھ گیا۔ دوسرا پلیٹیں سیدھی کر گیا۔ دست پوش لانے والا بالکل ہی نیا آدمی تھا اور کھانے کے کورس بھی یکے بعد دیگر تین مختلف آدمی لائے۔ ظاہر ہے سویٹ ڈش اور چائے لانے والے بھی نئے نکور بیرے تھے۔ ان صاحبوں سے یک جا ملاقات کا شرف بِل اور بخشش کے وقت حاصل ہوا۔ جس طرح ڈرامے کے خاتمے پر سبھی اداکار مل کر سلامی لیتے ہیں یا دیتے ہیں، وہی منظر یہاں تھا۔

کولمبو کے اسٹیشن کا احوال ہم لکھ چکے کہ ہر چند ہمارے پاس دو بریف کیسوں اور صُبح

کے اخباروں کے علاوہ کُچھ نہ تھا، تاہم تین قُلی ہماری خدمت پر مُستعار تھے اس موقع پر ہمیں کپلنگ کا مقولہ ”مشرق و مغرب کبھی نہیں مل سکتے“ پھر یاد آیا۔ یہاں کا یہ عالم کہ کسی کام کے لئے ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ وہاں آپ کو یہ منظر نظر آئے گا کہ آدمی جھاڑو دے رہا ہے، پھر وہی ایپرن باندھے کھانا پکاتا اور برتن دھوتا نظر آئے گا، پھر کھانا کھانے کا نفیس لباس پہنے جو شخص آپ کو سیٹ پر بیٹھا چھری کانٹے لہراتا نظر آئے، آپ غور سے دیکھیں گے تو وہی مردِ شریف نکلے گا۔

کھانے کے بعد انصاف سے تو سونا چاہیے تھا، لیکن منزل کی فکر سر پر سوار تھی۔ سعید میاں نے کار کو ”تھاپی“ دی اور وہ ایک دو بار ہنہنا کر چل دی۔ دِن کے تین بجے ہوں گے لیکن وہی غباریں ابر چھایا ہوا تھا۔ راستے میں ایک جگہ توقّف کیا۔ یہاں ایک طرف کو ایک باؤلی سی تھی اور بہت سی عورتیں اس بھیس میں جو راجپوتانے کی عورتوں کا ہوتا ہے، سڑک سے اُتر کر ادھر جا رہی تھیں اور نمسکار کر رہی تھیں۔ کچھ دیہاتی بھی چھکڑے لئے پاس ہی براجمان تھے۔ سعید نے کہا۔ یہاں کی روایت کے مطابق سیتا جی نے، جبکہ راون صاحب ان کو اغوا کر کے لائے، یہاں اشنان کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا ایسے مقامات ایک نہیں بہت سے ہیں جہاں سیتا جی کا اشنان کرنا مشہور ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ

اس میں تعجّب کی بات نہیں۔ آخر راجہ رنجیت سنگھ کی بھی تو کئی کئی کھوپڑیاں قدیم نوادر فروشوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ کوئی بڑھاپے کی، کوئی جوانی کی، کوئی بچپن کی۔ اس کے علاوہ سیتا جی پر صرف ایک بار ایک ہی جگہ نہانے کی پابندی تھوڑا ہی تھی۔

راون کا وجود تاریخی کم ہے اور روایتی زیادہ۔ لنکا والوں نے بھی اس پر ریسرچ کی ہے اور ان کا رویہ یقیناً راون کے متعلّق ہمدردانہ ہے۔ وہ اس کو دس سروں والا خوفناک راکشس یا رامائن کے قصّے کا وِلن نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہاں اس نام کا ایک راجہ تھا جس نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، باقی باتیں زیبِ داستان کے لئے بڑھادی گئیں۔

نانونہ ایک چھوٹا سا جنکشن تھا جہاں سے کولمبو کی گاڑی ہمیں ملی۔ سعید کو ہم نے اس کی مُزد اور انعام دے کر رُخصت کیا اور گاڑی میں فروکش ہو گئے۔ یہ بھی پاکستان کے ایک دیہاتی اسٹیشن کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ ایک ہی بابو جانے والے مسافروں کو ٹکٹ دینے کے بعد گیٹ پر آکھڑا ہوتا اور آنے والوں کے ٹکٹ وصول کرتا۔ اب کے ہم نے ٹکٹ فرسٹ کلاس کا نہیں سیکنڈ کلاس کا لیا۔ یعنی بیس روپے کے مقابلے میں ساڑھے بارہ روپے خرچ کئے۔ لیکن یہ اس فرسٹ کلاس سے کہیں بہتر تھا جس میں ہم نے جاتی بار سفر کیا تھا۔ اب کے ہم نے ایک دو باتیں اور مشاہدہ کیں۔ وہ یہ کہ گاڑی کے دروازوں کے پٹ اندر کی طرف نہیں باہر کی جانب کھلتے ہیں۔ اس کی

حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی مسافر باہر ِگرنا چاہے تو اسے دِقّت نہ ہو۔ دوسرے کئی کمپارٹمنٹ ایسے تھے جن پر لکھا تھا For Clergies Only یعنی یہ درجہ صرف پروہتوں، پادریوں یا مُلّاؤں کے لئے ہے۔ اتّفاق سے ہم جس درجے میں بیٹھے اس پر بھی یہی بورڈ لگا تھا اور جب ایک بھکشو صاحب گیروا بانا پہنے اس میں داخل ہوئے تو ہم نے سوچا۔۔ آب آمد تیمم برخاست۔ پھر سوچا ہم بھی تو خود کو پاکستانی مولوی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان بھلے مانس نے کہا، آپ شوق سے بیٹھئے، بے شک بعض مصالح سے گاڑی کے ڈبّوں میں اس طرح کی تخصیص کی گئی تھی لیکن یہ پرانی بات ہے اور اب اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ یہ بھکشو بھی بڑی عمدہ انگریزی بولتے تھے اور روشن خیال تھے۔

تھوڑی دیر میں اندھیرا چھانے لگا اور دِن بھر کی ماندگی بھی تھی۔ اس لئے ہم سبھی صاحبوں سے معذرت کرکے ٹانگیں پسار کے سوگئے اور ایک جھپکی لے لی۔ لیکن ان دِلکش منظروں نے پھر دامنِ دِل کو کھینچا اور ہم تھوڑی دیر میں اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ آج اس دھواں دھار اسٹیفن سن کے انجن کے بجائے ڈیزل کا اچھا خاصا انجن تھا۔ لیکن چھ گھنٹے گاڑی میں بیٹھنا پھر بھی عذاب ہے۔ ان گاڑیوں میں بلا مقصد زنجیر کھینچنے کی سزا بیس روپے جرمانہ لکھی ہے۔ یعنی ہم جیسا غریب آدمی بھی بے ضرورت

زنجیر کھینچ سکتا ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں طلوعِ آزادی کے بعد بھی ہم پرانی لکیر کو پیٹتے جا رہے ہیں اور یہاں اگر تفریح کا یہ ذریعہ اختیار کیا جائے تو پچاس روپے جرمانہ الگ اور بازپرس الگ۔
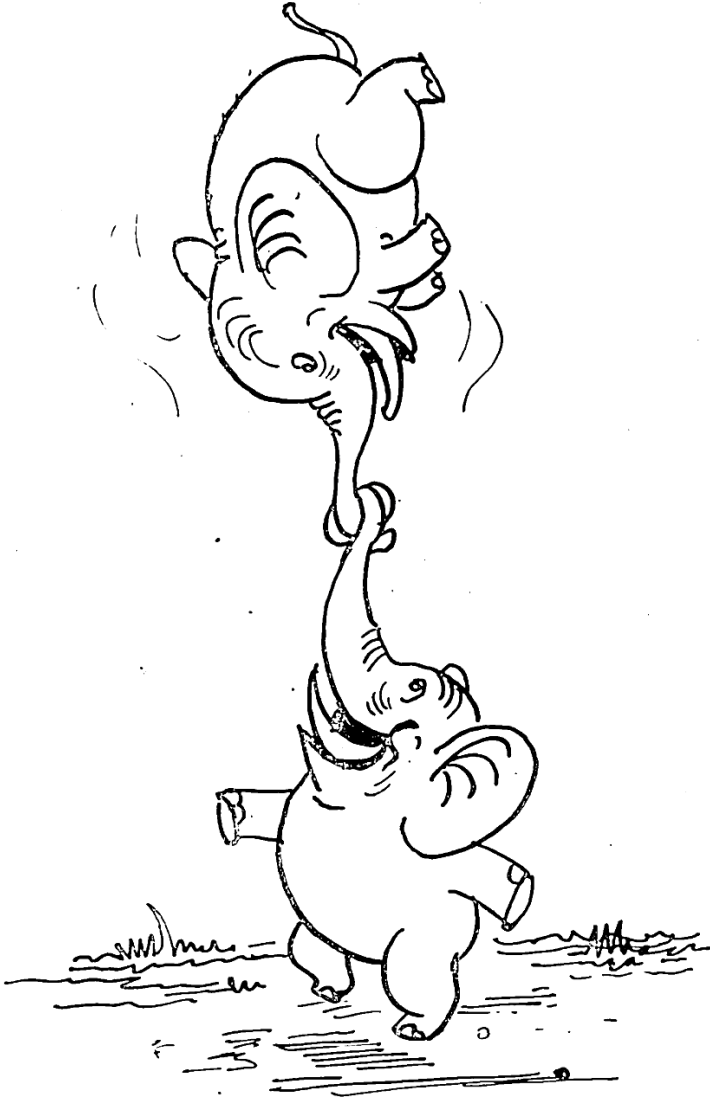
بارے ہاتھی کا کُچھ بیان ہو جائے

کولمبو میں پہلے روز جس چیز کی زیارت ہوئی وہ ہاتھی تھے اور اِس کے بعد جتنے روز ہم سیلون میں رہے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں رہا۔ ایک کپڑا پسند آیا، اس پر بھی ہاتھی کی چھاپ تھی۔ ہاتھی مارکہ سگریٹ بھی، جو ایک صاحب کے کہنے کے مطابق ہاتھی کی لید سے بنتا ہے، جگہ جگہ نظر آیا۔ فورٹ کے علاقہ میں جہاں جہاں سے گُزرے نوادر کی دُکانوں میں، جو فقط سیاحوں کی جیبیں کاٹنے کا شائستہ بہانہ ہیں، ہاتھی ہی نظر آئے۔ چھڑی پر ہاتھی، سگار دان پر ہاتھی، ایش ٹرے پر ہاتھی، کالے

ہاتھی، پیلے ہاتھی، خاکستری ہاتھی، رنگ برنگے ہاتھی۔ معلوم ہوا کہ سفید ہاتھی بھی بہت ہیں لیکن دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ آسٹن جے وردھنا نے ازراہِ محبّت ایک سگریٹ کیس خرید کر دیا لیکن دیکھا تو اس پر بھی ایک ہاتھی براجمان ہے۔ ہم نے نہایت ادب سے کہا کیا آپ اسے بدل نہیں سکتے؟ بولے ہم نے تو خاص طور پر یہ اس لئے چنا تھا کہ اس پر ہمارے قومی جانور کی تصویر ہے۔ ہمارے شہر میں اونٹ ناحق بدنام ہے۔ چوپایہ پرستی دیکھنی ہو تو لنکا والوں کی دیکھیے۔

ہاتھی ہمارے ہاں عام نہیں پایا جاتا (سفید ہاتھی سے قطع نظر)۔ اس کا زیادہ تر وجود تاریخ، شاعری اور محاوروں میں ملتا ہے، یا کہیں کہیں چڑیا گھر میں۔ تاریخ میں پورس کے ہاتھی مشہور ہیں یا پھر محمد شاہ کا ہاتھی جس پر نادر شاہ نے چڑھنے سے انکار کر دیا تھا کہ جس جانور کی باگ اپنے ہاتھ نہ ہو اس پر سواری غَلَط ہے۔ شاعری میں استاد ذوقؔ نے ابرِ سیاہ کو تشبیہ دی۔ ع

کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

معلوم ہوتا ہے پورس کی طرح ہمارے مسلمان رؤسا کے زوال میں بھی کچھ دخل ہاتھیوں کا رہا ہے کیونکہ سوداؔ اپنے شہر آشوب میں لکھتے ہیں:

کہیں جو زعم میں آقا کے فیل خانا ہے

جو ہتھنی اندھی ہے اس میں، تو ہاتھی کانا ہے

نہ ٹھور چارے کا، راتب کا نَے ٹھکانا ہے

ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہے

اب اس کو خواہ وہ پائل سمجھ لیں خواہ منجھول

ہاتھیوں کے علاوہ اہلِ لنکا کا دوسرا قومی نشان ماسک سمجھیے، یعنی چہرے کے نقاب۔ گھروں، دفتروں، دُکانوں، عجائب گھروں میں جابجا دیواروں پر نقاب لٹکے نظر آئیں گے اور ایک سے ایک خوفناک۔ ویسے تو یہ عوامی آرٹ کا جزو ہیں۔ دیہات میں ناٹک وغیرہ کرنے کے لیے تمثیلی چہرے جانوروں، راکششوں وغیرہ کے بنائے جاتے ہیں، لیکن اس موجودہ زمانے میں بھی جبکہ بچّوں کو ڈرانے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں، لنکا میں ماسکوں ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ سُنا ہے یورپ وغیرہ سے لوگ فن کے اِن نادر نمونوں کی تعریف کرنے آتے ہیں، البتّہ جن لوگوں کو آرٹ کی باریکیوں سے بہرہ نہیں، جیسے ہم، وہ ہماری طرح لنکا سے واپس آنے کے بعد

مہینوں آدھی رات کو چونک چونک کر اُٹھتے ہیں۔ حتّٰی کہ گھر والوں کو ہم سے کوئی بات جبری طور پر منوانی ہوتی ہے تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔۔۔ بھیجیں تمھیں لنکا۔ لنکا کے باون گزوں کا شہرہ بھی بہت سُنا تھا۔ آج کل تاریخ کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، چنانچہ روایت میں اگر یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر نو سو سال تھی تو آج کا محقّق یہ ثابت کرتا ہے کہ اس زمانے میں سال تیرہ چودہ دِن کا ہوتا تھا تاکہ حساب میں آکر ان کی عُمر ہمارے برابر ہو جائے اور روایت پر کوئی حرف نہ آئے۔ سو ہماری بھی یہی توجیہہ ہے کہ پرانے زمانے میں سیلون میں ایک یا ڈیڑھ انچ کا گز ہوتا تھا۔

سچ یہ ہے کہ باون گز بھی غَلَط اور باون انچ بھی غَلَط۔ لنکا والوں کا قد کاٹھ اور سراپا ہم سے مختلف نہیں ہوتا اور بعضے تو خاصے کشیدہ قامت ہوتے ہیں۔ اپنے دوست آسٹن جے وردھنا کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ خاصے کشیدہ قامت نوجوان ہیں اور ہم ان کو امیر خسرو کے اشعار کی تضمین سنایا کرتے تھے:

اے آسٹن جے وردھنا

اُشتر صراحی گردنا

دانم چہ خواہی کردنا

گر دن درازی می کنی

پنبہ بخواہی خوردنا

کولمبو جانا اور ریڈیو سیلون دیکھے بغیر واپس آنا ایسے ہی تھا جیسے دہلی جا کر قطب مینار نہ دیکھا جائے (ہم نے نہیں دیکھا) یا آگرے کی سیر میں تاج محل کو چھوڑ دیا جائے (نہیں چھوڑا)۔ پس ایک روز یہی ٹھہری کہ اس عظیم ادارے کی زیارت کی جائے جس کا ہمارے گھروں میں راج ہے۔ بوقت صُبح چو مردم بہ کاروبار روند۔ گھر کی عورتیں چولہا چوکا جھاڑو وغیرہ چھوڑ کر ریڈیو سیلون کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آ جمع ہوتی ہیں۔ دیکھا کہ ایک معمولی عمارت ہے۔ چاروں طرف کمرے، بیچ میں احاطہ، ایک پہلو میں اسٹوڈیوز ہیں۔ ایک ٹرانسمیٹر ہے، پچاس کلو واٹ کا۔ ڈائریکٹر ان دِنوں ایک نوجوان تھے پنڈت نامی، ہمارے اشتیاق پر خوش ہوئے اور خود جا کر اسٹوڈیوز دِکھائے۔ ہم نے کہا ہمیں تو اس کا وہ سیکشن دکھایئے جس کے فردوس گوش نغموں کے ہم اسیر ہیں۔۔۔ فرمایا وہ پروگرام تو زیادہ تر بمبئی میں تیّار ہوتے ہیں، بس ریکارڈ ہو کر یہاں آتے ہیں اور ہمارا آدمی بجا دیتا ہے۔ بہت مایوسی ہوئی۔ انچارج ایک سردار جی ڈھلوں نامی تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ کولمبو سے باہر گئے ہوئے تھے، بلکہ یاد پڑتا ہے اپنے ملک یعنی پنجاب۔ ایک صاحب البتّہ ملے سری

واستو صاحب۔ بے چارے ہندی کے آدمی تھے، یوپی کے کسی قصبے کے ہوں گے۔ بڑی کاوش سے عربی فارسی کے الفاظ یاد کر کے اپنی ہندی میں ملا کر خلوص کا ثبوت دے رہے تھے۔ ریکارڈ بجانے والی خاتون مس ڈولی تھیں، اعلان بھی انہی کی سامعہ نواز آواز سے اکثر سُنے جاتے ہیں۔ ہم نے انہیں دیکھا اور دُعا سلام کر کے جانا کہ محنت وصول ہوئی۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ہمیں تو کراچی واپس آنا تھا، ڈاکٹر اختر حسین کا پروگرام مدراس اور دہلی کا تھا۔ لہٰذا ہم سے دو روز پہلے وہ رُخصت ہو گئے۔ کولمبو میں دو ہوائی اڈّے ہیں۔ ہمارا کراچی کا جہاز جس اڈّے پر آتا ہے وہ بین الاقوامی ائیرپورٹ کہلاتا ہے اور غالباً ہفتے میں دو تین روز کھلتا ہے، جبکہ کراچی یا رنگون وغیرہ آنے جانے والے جہاز اترتے چڑھتے ہیں۔ زیادہ ٹریفک ہندوستان کا رہتا ہے سو اس کے لیے ایک مقامی اڈّہ ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہم پر اداسی کا دورہ پڑنا شروع ہوا۔ دو دِن تو جوں توں گزارے، آخر ایک روز گال فیس سے بی او اے سی کی بس میں بیٹھ کر ہوائی اڈّے اور وطنِ عزیز کی راہ لی۔

ائیر پورٹ پر مسٹر بیسٹن ہمارے منتظر تھے۔ یہ وہاں کے ایک پبلشر ہیں۔ کہنے لگے ڈاکٹر اختر حسین کو یہ پھول دار پودا بہت پسند آیا تھا اور ان کی فرمائش تھی کہ انشا چونکہ سیدھے کراچی جارہا ہے اس لیے اُس کو اِس کی کچھ جڑیں دے دینا۔ اس میں عجیب عجیب پھول آتے ہیں جو پاکستان میں نہیں ہوتے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ٹاٹ میں لپٹی ہوئی کچھ ٹہنیاں حوالے کیں، چند پات باہر تھے۔ ہم نے کہا، سُنا ہے کراچی ائیر پورٹ پر محکمہ زراعت والے چیک کرتے ہیں کہ کوئی شخص باہر سے کوئی ایسا جراثیم آلود پودا نہ لے آئے جو یہاں آکر پھیل جائے اور فصلوں یا درختوں کی غارت گری کا باعث ہو۔ بولے، ایسے موقع پر اسے جراثیم سے پاک کرنے کے لئے دھونی دی جاتی ہے اور بس۔ ہم نے کہا بسر و چشم! کراچی کے ہوائی اڈّے پر کسٹم والوں نے کہا۔ یہ پودے ہیں؟ ہم نے کہا ہاں پودے ہیں۔ بولے، زراعت والوں سے پوچھ لو۔ ہم نے کہا کہاں ہیں؟ معلوم ہوا ان کا کوئی چپراسی یا ایسا ہی کوئی اہل کار ڈیوٹی پر ہے تو لیکن وہ چائے پینے یا چمپی کرانے گیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر اس کا انتظار کرنے کے بعد ہم نے ٹیکسی لی اور راستہ ہی میں ڈاکٹر اختر حسین کے ہاں وہ پودا دے آئے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے ہندوستان سے واپسی پر آکر دیکھا تو بہت ہنسے، بولے یہ آپ کیا

اُٹھالائے؟ ہم نے کہا خیریت؟ ہم تو بیسٹن کی امانت بڑی احتیاط سے لائے اور ائیر پورٹ سے بھی جہاں رُکنے کا خطرہ تھا بڑی سہولت سے نکال لائے۔ بولے، میاں جیسے بیسٹن ویسے تم۔ یہ تو شاخیں تھیں، جڑیں اس میں تھیں ہی نہیں، لگتیں کیا خاک، دوسرے روز مرجھا گئیں۔ ہم نے کہا، الاعمال بالنیّات، یہ آپ بیسٹن سے پوچھئے کہ اس نے کیا دیا۔ سویوں وہ لنکا کا عجیب و غریب پھولوں والا پودا پاکستان میں لگتے لگتے رہ گیا۔

ایران

دسمبر ۱۹۶۳ء

فادر کرسمس کی روانگی

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا ہے، بلکہ رکھنے کے لیے کراچی ایئرپورٹ پر پہنچے ہیں تو ۲۴ نومبر کی تاریخ تھی اور صُبح چھ بجے کا ہنگام۔ کپڑوں سے کُچھ اس طرح لدے پھندے لقہ کبوتر بنے ہوئے تھے کہ اپنے پر کسی اور کا شُبہ ہو رہا تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ گھر والوں نے ہمارے بجائے دھوکے میں کسی اور کو جگا دیا ہے۔ جمیل الدّین عالی نے کہا چلتا پھرتا ٹورسٹ آفس ہیں۔ پہلے تو ہمیں وہ اونی بنیان اور زیر جامہ پہنوایا جو وہ ماسکو اور لینن گراڈ میں پہنتے رہتے تھے۔ اس پر ایک سویٹر پورے

بازوؤں کا پھر ایک قمیص۔ اما بعد ایک واسکٹ۔ وہ روئی کا دَغلہ بھی پہنانے پر مُصِر تھے لیکن ہم نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر انکار کر دیا۔ اس پر انہی کا سائبیریا میں پہننے کا ریچھ کی کھال کا اوور کوٹ زیب تن کئے ہم اچھے خاصے فادر کرسمس تو بن ہی گئے تھے۔ ائیر پورٹ پر وہ پھر ہمارے منتظر تھے۔ کہنے لگے، یہ بدخشاں کے اصلی لومڑ کی کھال کے دستانے ہمارے اجداد کی نشانی ہیں۔ یہ تمھیں دینا بھول گیا تھا۔ پھر امام ضامن باندھتے باندھتے ایک کنٹوپ بھی پہنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندر راہداری والوں نے کئی بار پوچھا، آپ پاکستانی ہیں؟ آپ ہی کا نام ابنِ انشا ہے؟ ایک صاحب نے تو جب تک کنٹوپ اُتروا کر پاسپورٹ کی تصویر سے موازنہ نہ کر لیا آگے نہ جانے دیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اس سارے کھڑاگ میں ہمارا تو فقط جسم تھا، باقی ہر چیز جمیل الدّین عالی کا عطیہ تھی۔ ہمارے لیے ملک سے باہر نکلنے کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ دُور دُور کے دِیار جھانک آئے تھے۔ لیکن جو تھرِل جو سنسنی یا جو ذوق و شوق ایران کے سفر کے وقت محسوس ہو رہا تھا، عازمِ یورپ ہوتے وقت نہ تھا۔ وہ اجنبی دیس تھے، یہ ہماری تہذیبی جنّتِ گُم گشتہ تھی۔ ایران جدید کے متعلّق بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور اب جانے سے پہلے پڑھا، لیکن جب بھی آنکھ بند کی سامنے وہی نقشہ آیا جو حاجی بابا اصفہانی کے مرقعوں میں ہے۔ جس طرح بغداد الف لیلہ کی وجہ سے

عزیز ہے۔ امریکہ اور یورپ سے ہندوستان آنے والوں کی نظریں ہوائی اڈّے سے اُترتے ہی سانپوں، مداریوں، ہاتھیوں اور راجاؤں کی کلغیوں کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔

مارکو پولو اور ابنِ بطوطہ کا زمانہ ذرا پرانا ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں ہماری مولوی محمد حسین آزاد ایران کا سفر کرتے ہیں تو منزل کارواں سراؤں میں ٹھہرتے اپنے لیے خچّر اور نوکر کے لیے ٹٹّو کرایہ کرتے جاتے ہیں۔ سامانِ سفر ایک خورجی ہے اور ایک بستر۔ ٹریولر چیک اس زمانے میں نہیں تھے۔ شہروں میں جاتے تو فارسی کی نادر کتابیں بیچتے جو ہندوستان سے ہمراہ لے گئے تھے اور جہاں کتابوں کا قدردان نہ ہو۔

"اہل آبادی روٹیاں، گھی، دودھ، انڈے، گوشت، مرغیاں، قالین لاتے ہیں۔ قافلے والے قیمت میں کپڑا، سوئیاں، رانگ، پیتل کی انگوٹھیاں، جگنیاں، کانچ اور

شیشے کے دانے دے کر خریدتے ہیں۔"

انہی محمد حسین آزاد کی ایک اور کتاب میں ایک ایرانی آقا سفر کا احوال پوچھتا ہے تو پاکستانی مسافر عرض پرواز ہوتا ہے۔

"لاہور سے کراچی تک ریل میں آیا۔ بارہ روپے دیے۔ وہاں سے بوشہر تک دُخانی جہاز میں تیئیس روپے اور دیے۔ بوشہر سے شیراز پندرہ قران ہیں جو ہمارے چھ روپے کے برابر ہے۔ یہاں مشیر الملک کی سرائے میں ٹھہرا ہوں، لیکن اچھی جگہ نہیں، کوڑا کرکٹ بہت ہے۔"

آقائے ہوشنگ اعلم باہر انتظار کر رہے تھے، انہیں وزارتِ فرہنگ نے ہماری پیشوائی کے لئے بھیجا تھا۔ بہت خلیق اور متواضع آدمی نکلے۔ چند منٹ میں گھُل مل گئے اور اب ہم ٹیکسی (تاکسی) سے باہر تہران کا منظر دیکھنے لگے۔ یہ دانش گاہ ہے، یہ خیابان شاہ رضا ہے، لیجیے یہ میدانِ فردوسی آ گیا، بس آپ کا ہوٹل زیادہ دور نہیں، لیجیے یہ رہا ہوٹل۔ ایران میں ٹیکسی کا کرایہ مسافت کے اعتبار سے نہیں۔ شہر میں کہیں بھی چلے جایئے۔ صدر سے گاندھی گارڈن کے بھی پندرہ ریال ہوں گے اور ناظم آباد سے کیماڑی کے بھی پندرہ ہی ریال (۱) یہ کیفیت ۱۹۶۴ء کی ہے۔ اب

کرائے بڑھ گئے ہیں۔) ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔ البتّہ ہوائی اڈّے سے آتے جاتے وقت ۵۰ ریال لیتے ہیں۔ ریال کو ایک آنہ تصوّر فرمایئے۔ دس ریال کا ایک تومان بنتا ہے۔ جہاں ہم تومان کہیں آپ دس آنے سمجھ لیجیے گا۔ نئے شہر میں ٹیکسی کے علاوہ کوئی سواری نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔ تہران میں تیس ہزار ٹیکسیاں ہیں۔ اتنی تعداد فقط نیویارک میں ہے لیکن وہاں آبادی کم ہے۔

تہران کا موسم قریب قریب کراچی ہی کا تھا۔ انیس بیس کا فرق سمجھ لیجیے۔ یعنی اچھی خاصی گرمی۔ عالم یہ تھا کہ اونی زیر جامہ اور پالان پہننے سے سارے جسم میں سوئیاں چُبھ رہی تھیں۔ ہوٹل پہنچ کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ان چیزوں کو اتار کر رکھا۔ زیر جامہ پھر پہننے کی نوبت نہ آئی۔ اوورکوٹ ایک روز پہنا۔ بدخشانی لومڑ کے دستانے اسی طرح تہہ کئے رکھے رہے۔ اب ہم پھر اپنے معمولی سوٹ میں ملبوس خیالی چھڑی ٹیکتے ٹیکتے ہوشنگ کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے ذرا باغ چل گنگناتے شہر جدید کی سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔

مسائل خورد ونوش کے

یہ خیابانِ ثریّا ہے جس پر ہمارا ہوٹل واقع ہے۔ سڑک تو عمدہ ہے لیکن فٹ پاتھ کی حالت کیوں ابتر ہے۔ جی بات یہ ہے کہ سڑکیں بنانا اور مرمّت کرنا شہر داری یعنی میونسپلٹی والوں کی ذمّہ داری ہے اور فٹ پاتھ گھروں اور دُکان والوں کی۔ خوب۔ نالیاں بھی زیرِ زمین نہیں بلکہ سڑک کے دورویہ اوپر ہی ہیں جیسی ہمارے جالندھر لدھیانے میں ہوتی تھیں۔ نالیوں میں پانی البتّہ کہیں نظر نہ آیا۔ خدا جانے کہاں جاتا ہے، ممکن ہے عید بقر عید پر چھوڑتے ہوں۔ ہوشنگ تو یہ سن کر حیران ہوا کہ ہم

روزانہ نہاتے ہیں۔ بولا۔ میاں جی! تم تو پانی کے کیڑے ہو۔ میں تو جمعے کے جمعے حمام جاتا ہوں۔

لیجیے یہ خیابان شاہ رضا ہے۔ بڑی لمبی سڑک ہے۔ کیا صاف اور مُجلّا دُکانیں ہیں۔ سب کے کواڑ شیشے کے اور مالِ تجارت سے بھرپور۔ دکانیں بھی نور علیٰ نور۔ بھائی صاحب! یہ تو یورپ کا نقشہ ہے۔ جی ہاں! تہران کو ایشیا کا پیرس اسی لئے کہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا ''تم نے پیرس دیکھا؟'' ہوشنگ نے کہا ''نہیں''۔ ہم نے عرض کیا دیکھ لیتے تو یہ بات نہ کہتے۔ وہاں تو ہر عمارت پر دھواں اور کائی چڑھی ہے۔ اور لندن کا وائٹ ہاؤس دیکھو تو یوں لگتا ہے کہ کوئلے کا ڈپو ہے۔ یہ خوبی اور صفائی تو ہالینڈ اور بیلجئیم کے چھوٹے شہروں کی یاد دِلاتی ہے۔ سبزیوں کی دکان ہے لیکن آلو گوبھی تک یوں سجا کے رکھی ہے کہ آرٹسٹ کا نگار خانہ معلوم ہوتا ہے، اور قصائی بھی سفید بُراق ایپرن باندھے کھڑا ہے۔ اور گوشت شیشے کے دروازے کے پیچھے سے جھما جھم جھلک رہا ہے۔ موچی کی دکان تک صاف ستھری دھری ہے۔ میاں جی! تمہارا تہران ہمارے کراچی سے بازی لے گیا۔ خیابانِ فردوسی، خیابانِ سعدی اور لالہ زار کو دیکھنے کے بعد تو ایلفنسٹن اسٹریٹ، وکٹوریہ اور انارکلی بالکل ہی جی سے اُتر گئیں۔ اپنے ہاں کی بلند و بالا عمارات کا رعب بھی اُٹھ گیا۔ لوگ ناحق یورپ تفریح کو جاتے

ہیں۔ یہاں آئیں۔ قریب تر ملک ہے۔ زبان بھی کُچھ نہ کُچھ پلّے پڑتی ہے۔ باقی رہے نائٹ کلب، سو یہاں بھی ہیں اور سُنا ہے ایک سے ایک بڑھ کر مسافر نواز۔ ع

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

تھیٹر بھی ہیں اور سنیما بھی، سنیما تو یہی دیکھیے سامنے کیا عمدہ ہے، کونسی تصویر لگی ہے۔ آوارہ؟ راج کپور؟ نرگس؟ حضرت اِدھر بھی ایک نظر، تاج محل! رینارائے! پردیپ کمار! آوارہ چھ سینماؤں میں چل رہی ہے، اور چودھواں کھڑکی توڑ ہفتہ ہے۔ تاج محل تو شاید ریکارڈ توڑے، مکالمے ڈب کرتے ہیں (دوبلہ کا مطلب ہے ڈب) گانے اصل زبان میں رہتے ہیں۔

لیکن میاں ہوشنگ! اب تو بھوک لگ رہی ہے۔ کہیں چل کے چکھوتیاں ہونی چاہئیں۔ بولے، آیئے آیئے، بفرمائید بفرمائید، کیا کھایئے گا؟ اگلی گلی میں ریستوران ہے۔ ہم نے کہا دور کیوں جاتے ہو، یہ سامنے سالن کی دُکان ہے۔ روٹی بھی ضرور دیتے ہوں گے۔ یہ اچھی نہیں تو ادھر بھی سالن کا بورڈ لگا ہے۔

بولے "یہ کھانے کی دُکانیں تھوڑا ہی ہیں۔"
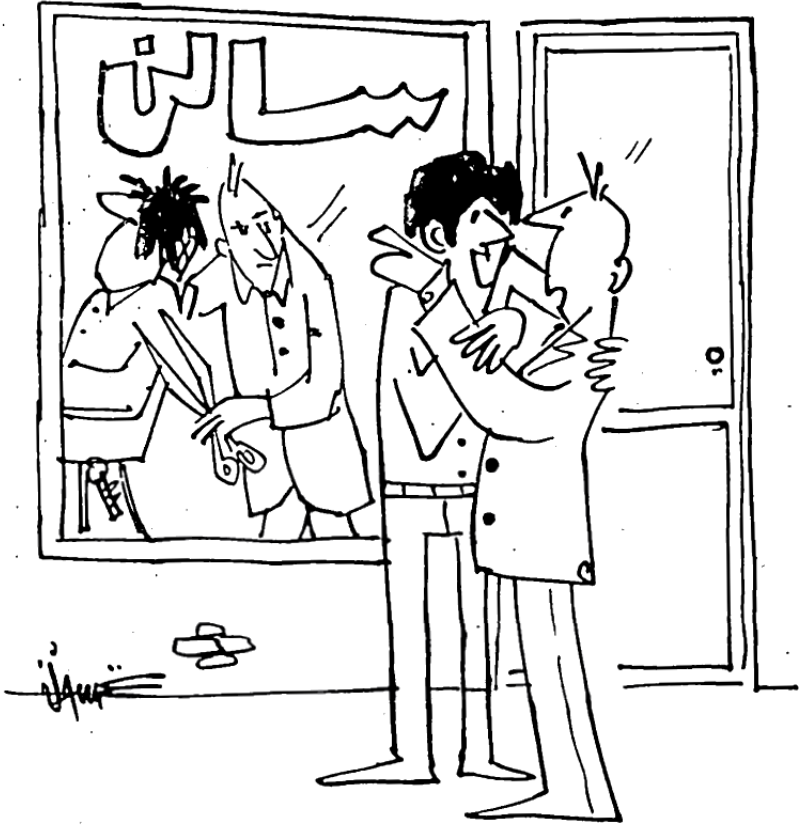
”پھر کیا ہے؟“

”یہاں عورتوں کے بال بناتے ہیں۔ اور ادھر درزی بیٹھتا ہے۔“

”پھر سالن کیوں لکھا ہے؟“

ہنس کے بولے۔ ”یہ اصل میں سیلون ہے، درزی، نائی، دھوبی سبھی کی دُکانیں سالن ہیں۔ ایلو یہ ریستوران بھی آ گیا۔ چیلو کباب کا نام سُنا ہے؟ یہاں کی سب سے مشہور ڈش ہے۔ جی خوش ہو جائے گا۔“

آقائے ابنِ انشا چیلو کباب کے متعلّق پڑھ پڑھ کر اس کے غائبانہ عاشق ہو چکے تھے۔ بیرے نے لا کر ایک پیالی رکھی جس میں چار انڈے کچے پھوڑے ہوئے رکھے تھے۔

"اچھا تو یہ ہے چیلو" ہم نے نعرہ لگایا۔

بولے۔ "نہیں۔ یہ انڈے ہیں۔"

اب بیرا ایک بوتل لایا جس میں کچھ سفید سا عرق تھا۔

"تو پھر یہ ہو گا چیلو"

بولے نہیں یہ دوغ ہے۔ لسّی۔ کس نہ گوید کہ دوغ من ترش است۔ اب کچی پیاز آ گئی۔ چیلو کا چ ہماری زبان تک آیا لیکن ہم چبا گئے۔ پھر ایک ڈش چاول کی آئی۔ اب کے ہم چُپ رہے۔ پھر موٹے مُشٹنڈے کبابوں کا ایک طباق۔

ہم نے ہوشنگ سے کہا: "بھائی صاحب ہم بڑا گوشت نہیں کھاتے، کم از کم اتنا بڑا نہیں کھاتے، اور چاول کھانے سے ہمیں قبض ہوتی ہے۔ سیدھی سیدھی روٹی منگواؤ اور کوئی سالن بھی ہو گا۔ سالن سے ہمارا مطلب نائی کی دُکان نہیں بلکہ پکا ہوا گوشت، سبزی وغیرہ ہے۔

بولے۔ "کیا کھاؤ گے؟"

ہم نے کہا۔ "ماش کی دال ہو گی؟"

بولے۔ "وہ کیا ہوتی ہے؟"

اس وقت اس شے لطیف کا انگریزی ترجمہ ذہن میں آیا نہ فارسی، لہٰذا ہم نے کہا۔ ایک طرح کی سبزی ہوتی ہے۔ خیر آج تمہاری خاطر سے چیلو کباب ہی سہی۔

بولے۔ "ایک انڈا بھی اس میں ملاؤ۔ پھر دیکھو مزا۔"

شام کو جو تنہا ٹہلنے نکلے تو خیابانِ ثریّا سے نکل کر خیابانِ تختِ جمشید پر آئے۔ وہ ختم ہوئی تو ہمارے نقشے کے مطابق شمران جانے والی سڑک تھی۔ وہاں سے داہنے ہاتھ مڑ کر پھر خیابان شاہ رضا پر پہنچے۔ ایک طرف چھوٹی سی کبابی کی دکان تھی۔ جامع مسجد کے جانی کبابی کی نہیں کہ لنگی اور پھنٹیا باندھے بیٹھا ہو، بلکہ یورپ کے کبابی کی۔ کوٹ پتلون ڈانٹے کھڑا تھا اور گیس کے الاؤ پر تکّے بنا رہا تھا۔ کچھ کھانے کی تو حاجت نہ تھی، دوپہر چیلو کباب جو کھائے تھے۔ ہم نے کہا۔۔۔ "آقا کوکا کولا بیارید"

"یکتا۔۔۔؟"

"یک عدد"

پھر بولے ''یک تا؟''

''بلے، بلے'' ہم نے رفع شر کے لئے کہا۔

قصّہ یہ ہے کہ آپ کو چار سیب اور پانچ انار چاہئیں تو چہار سیب یا پنج انار کہنا کافی نہیں، نہ عدد سے کام چلے گا۔ کہیئے چہار تا سیب اور پنج تا انار، جیسے ہمارے بعض علاقوں میں کہتے ہیں۔ دو ٹھو کیلا تو لاؤ۔ لیکن ہم تو وہاں جتنے روز رہے دوغ پیتے رہے۔ پنجاب کے دیہات کی قدرے تُرش اور نمکیں لسّی کا لطف آتا تھا۔ یہ بوتلوں میں بند بھی ملتی ہے۔ کھانے کے بعد ہمیشہ ہم نے خربوزے کی فرمائش کی۔ ہمارا سردا اِن کا خربوزہ ہوتا ہے، لیکن ایران کے خربوزے کی لطافت، خستگی اور شیرینی کے کیا کہنے۔ ہم دیہاتیوں کی زبان میں بالکل گُڑ تھا گُڑ۔

خیر کوکا کولا کی چُسکی لگاتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ کبابی نے ایک گاہک کے آگے کباب لاکر رکھا۔ کوئی ڈیڑھ فٹ کا کباب ہو گا۔ اس کے بعد اس کو لپیٹنے کے لیے ایک تہ بہ تہ کاغذ، چھدرا سا ملگجا سا کاغذ، گاہک نے اسے لپیٹا اور کیا دیکھتے ہیں کہ جیب میں رکھنے کے بجائے منہ سے زور کا ایک مُچّا کاٹ لیا، تو پھر کاغذ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے دوکاندار سے کہا۔ میاں ذرا دکھانا تو کیا چیز ہے، معلوم ہوا میدے کی کاغذ کے برابر

باریک تہوں والی روٹی ہے، بولے لاؤں؟ ہم نے کہا نہیں مہربانی۔ مرحمت شماز یاد سایہ شما مستدام۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ہمیں بھی بعد تلاش بسیار روٹی ملی۔ ہم نے کہا۔ ''ایں نان است''، بولے ''ایں نون است'' ہم نے کہا ''ما ایں رانان می گویم'' فرمایا ''مانون می خوانیم'' آنجا کو اونجا بولیں گے۔ خانہ کو خونہ۔ ہُت تمہارا خونہ خراب، آسمان تک کو اُلٹ کے رکھ دیا ہے، آسمون بولتے ہیں۔ بے چارے کی ساری شان یعنی شون مٹّی میں مل جاتی ہے۔ بابا ہمیں یہ زبون یعنی زبان نہیں آنے کی۔ خیر یہ روٹی کے پارچے تھے، ہم نے کہا پوری روٹی دکھائیے۔ بولے اس کے لیے نان بائی کے ہاں جائیے۔ ہمارے ہاں تو ٹکڑے آتے ہیں۔ ہم نے درخواست کی کہ اچھا ذرا گرم ٹکڑے لائیے۔ بولے گرم چہ معنی دارد، ٹھنڈی ہے لیکن تازہ ہے۔ ابھی کل شام ہی تو آئی ہے۔

موزۂ مردم شناسی سے آتے ہیں۔ ایک کوچے میں دیکھا کہ ایک کیل سے کوئی لمبی سی چیز لٹک رہی ہے۔ بظاہر نان معلوم ہوتا تھا اور تھا بھی نان۔ لیکن کوئی ڈھائی تین گز لمبا۔ یہ محض اشتہار کے طور پر تھا۔ اندر دیکھا کہ ہر وضع قطع کی روٹیاں ہیں۔ کوئی توے کے برابر ہے، کوئی پرات کے برابر۔ دیوار میں جا بجا کھونٹیاں لگی ہیں اور ان سے لٹکی ہوئی ہیں، جیسے ہمارے ہاں ٹوکریاں اور چنگیریں دُکانوں پر۔ ایک صاحب

نے ایک دو فٹ قطر کی روٹی لی اور اسے بغیر کسی چیز میں لپیٹے سائیکل کے کیریر پر رکھ یہ جاوہ جا۔ ہم نے ہوشنگ سے کہا۔ ہم تو تازہ روٹی کھاتے ہیں۔ بولے۔ ہم بھی بالعموم یہ روٹی ہفتہ بھر بلکہ تین چار روز سے زیادہ نہیں رکھتے۔ ہاں بعض لوگ غریب غربا ایک بار خرید لیتے ہیں۔ مہینہ بھر کھاتے ہیں۔ تمہارے ہاں کیا اسی روز کی پکی روٹی کھاتے ہیں؟ معلوم ہوا آب و ہوا خشک ہے اور سرد چیز خراب نہیں ہوتی۔ ہوشنگ چند روز ہوئے پاکستان آئے تو ہوٹل فاروق کے نان سے ہاتھ جلا بیٹھے۔ بولے۔ ہاں! تم واقعی گرم روٹی کھاتے ہو لیکن کیوں؟

ہم ایران سے جلد کیوں لوٹے؟

فارسی میں انڈے کو کیا کہتے ہیں؟ بیضہ؟

جی نہیں تخم۔ تخم مرغ ہاف بوائلڈ کو نیم رو کہتے ہیں، یہ ہمیں معلوم تھا۔ اس لیے ہم نے ٹھسے سے پہلے ہی روز پیش خدمت سے کہہ دیا۔ تخم مرغ نیم رو۔ اس کے بعد فرائی اور آملیٹ کو بھی جی بہت چاہا لیکن طوعاً و کرہاً جتنے دِن رہے، ہاف بوائلڈ ہی کھاتے رہے کیونکہ انڈے کی دوسری صورتیں آرڈر کرنے کیلئے ہماری فارسی کافی نہیں تھی۔

وہاں خشک تُوت میوے والوں کے ہاں ملتے ہیں، بہت میٹھے اور مزے کے ہوتے ہیں۔ بس جا کر یہ کہہ دیتے تھے "بقدر پنج ریال بدہید" بقدر کو وہ نہیں سمجھتا تھا کیونکہ پرانی فارسی ہے، ہاں پنج ریال کا لفظ اور انگلی کا اشارہ کافی ہوتا تھا۔ ایک روز کوئی نمکین چیز چاہیے تھی۔ نمکین بھی کہا، نمک آلود بھی کہا۔ کام نہ بنا۔ پتہ چلا شور کہنا چاہیے تھا۔ تہران میں گاڑیاں سڑک کے داہنے ہاتھ چلتی ہیں اور ہمارے ہوٹل کے کمرے میں بجلی کھٹکا اوپر اٹھانے سے جلتی ہے اور دبانے پر بجھتی ہے۔ سڑکیں خیابان کہلاتی ہیں اور گھر منزل۔ ہمارے ہاں کی منزل(Storey) طبقہ کہلاتی ہے اور میدان کا مطلب ہے چوک، اور رسّے کو سازمان کہتے ہیں اور دفتر (آفس) کو ادارہ۔ آپ ایران میں دفتر کا لفظ بولیں گے تو عموماً اس کا مطلب کاپی ہو گا۔ سو صفحہ کی کاپی، دوسو صفحہ کی کاپی۔ عمارت یہاں کی اصطلاح میں ساختمان ہے اور تعمیر کرنے کا مطلب تعمیر کرنا نہیں مرمّت کرنا ہے۔ آپ جوتا تعمیر کرائیے یا کپڑا۔ رضا شاہ کبیرؔ کے عہد میں فرہنگستانِ ایران کے نام سے ایک خاص ادارہ فارسی کو خالص بنانے (یعنی عربی کے الفاظ نکالنے) کے لیے قائم ہوا۔ اس نے کلچر اور تعلیمات کو فرہنگ بنایا اور مثلث کو سہ گوشہ، طلب پر شکی کہلائی اور دار الشفا بیمارستان بنا۔ پرائمری اسکول دبستان کے نام سے موسوم ہوئے اور سیکنڈری اسکول دبیرستان

کہلائے۔ یونیورسٹی جامعہ کے بجائے دانش گاہ کہلائی اور طالب علم نے دانش جُو کا چوغہ بدلا۔ آثارِ قدیمہ وہاں باستاں شناسی ہے بلکہ ہر علم شناسی ہے۔

یہ تو ہوئی قدرتی بات، لیکن جہاں فارسی الفاظ تھے وہاں عربی الفاظ رکھنے کی عِلّت سمجھ میں نہیں آتی۔ ناشتہ کو ناشتہ نہ سہی، چاشت کہہ لیتے۔ وہ صُبحانہ بن گیا ہے۔ اور دوپہر کا کھانا ناہار۔ ہم نے بیرے سے کہا بِل لاؤ دستخط کر دیں۔ کُچھ نہ سمجھا۔ آخر میں کھلا کہ دستخط متروک ہے۔ امضا کرنا کہنا چاہیے۔ دِلچسپ کو وہاں جالب کہیں گے، بس وہاں اتوبس ہے اور ٹرین ترن، موٹر کار کو ماشین کہتے ہیں اور فرنیچر کو مبل (جو فرانسیسی لفظ ہے)۔ اب تو شکریہ کے لئے بھی خیلے ممنونم و متشکّر ہستم کا رواج اُٹھتا جا رہا ہے۔ مرد متمکّن ہو یا موٹر ڈرائیور، فرانسیسیوں کی طرح مرسی کہہ کے الگ ہو جاتا ہے۔

وصل کی صُبح پہلوئے بُت سے

اُٹھ گئے یار تھینک یُو کہہ کر

.... آقائے گداگر.... قبول بفرمائید....

دو گھنٹے حبسِ بیجا میں

کھانا کھایا تو اب قیلولہ بھی ضرور ہو گا۔ قیلولہ ایران کا قومی شغل ہے۔ امیر غریب کھانے کے بعد سوتے اور آرام کرتے ہیں۔ زیادہ تر دُکانیں ایک بجے سے چار بجے سہ پہر تک بند رہتی ہیں اور بعض دفتروں میں کام ایک بجے دوپہر شروع ہوتا ہے اور پھر چھ بجے شام سے آٹھ نو بجے تک بیٹھتے ہیں۔ ہوشنگ سے ہم نے کہا اچھا میاں اب تم بھی آرام کرو کل صُبح وزارتِ تعلیم میں آقائے اردلان سے ملنا ہے۔ تم اپنے گھر سے ہمارے ہوٹل آجاؤ تو اچھا ہے، ان سے نو بجے ملنے کا وقت مقرّر ہے۔ ایسا نہ

ہو کہ دیر ہو جائے۔

بولے ''تمہارے ہاں کوئی نو بجے کہے تو اس کا مطلب نو بجے ہی ہوتا ہے؟''

ہم نے کہا ''نہیں خیر یہ بات نہیں۔ ہماری پرانی روایت تو پابندی وقت نہیں آزادیٔ وقت ہے، لیکن تمہارے ہاں یورپ کا اثر زیادہ ہے۔''

بولے ''بے شک ہم داڑھی منڈاتے ہیں اور مغربی لباس پہنتے ہیں، اور دِن دونی رات چوگنی ترقّی کر رہے ہیں، لیکن بعض قومی روایات کو ہم نے قائم رکھا ہے۔ ان میں یہ آزادیٔ وقت کی خصوصیّت بھی ہے۔ آقائے اردلان کی تو اور بات ہے، معتدل طبیعت کے آدمی ہیں۔ ورنہ اس کا بھی امکان ہے کہ آپ نو بجے کا کہہ کر واقعی نو بجے پہنچ جائیں اور میزبان کو تکلیف ہو اور وہ اپنے جی میں خفا ہو جائے۔ ویسے اس کی نوبت اس لئے کم آتی ہے کہ نو بجے آپ جائیں گے تو اسے پائیں گے ہی نہیں۔ سو میں کل نو بجے انشاء اللہ تمہارے ہوٹل آ جاؤں گا۔ وہاں سوا نو بجے پہنچنے میں مضائقہ نہیں۔

اسی اصول کے تحت وہ خود ہمارے ہوٹل ساڑھے نو بجے پہنچے اور جب ہم آقائے اردلان کے دفتر پہنچے تو دس بج رہے تھے۔ چپراسی نے اہلاً و سہلاً ہماری بلائیں لے کر

کہا ”اجی بس آیا ہی چاہتے ہیں۔ وہ دیکھیے انہی کی کار معلوم ہوتی ہے۔ بفرمائید بفرمائید۔“

ہوٹل پہنچے تو آقائے پیش خدمت نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یاد رہے کہ ایران میں کسی کو کام یا پیشے کی بنا پر ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ ڈرائیور ہو یا بیرا، گداگر ہو یا جاروب کش، آپ اسے آقا کہہ کر ہی خطاب کریں گے۔ آقائے رانندہ اگلی سڑک پر اتار دیجیے۔ ”خیلے متشکّر ہستم“ آقائے پیش خدمت ایک چائے لا دیجئے۔ مرحمت شما زیاد۔ آقائے جاروب کش۔ قربانت شوم۔ ذرا میں گزر لوں پھر جھاڑو دیجئے گا۔ گداگر کے بارے میں ہمارا ذاتی تجربہ نہیں لیکن یقین ہے اسے بھی پیسے دے کر یہی کہتے ہوں گے۔۔ ”آقائے گداگر، یہ حقیر چونّی قبول فرمایئے۔ خدا آپ کو ترقیٔ درجات عطا فرمائے۔ بندہ آپ کا ادنیٰ خادم ہے۔“

پانچ بجے اُٹھے۔ چائے پی۔ بارے چائے کا کُچھ بیان ہو جائے۔ آپ کسی دفتر میں جائیں یا دُکان میں۔ فوراً ایک آدمی سینی میں چائے کی چھوٹی چھوٹی گلاسیاں اور ایک پیالے میں شکّر، بالعموم شکّر کے کیوب لے کر آپ کے پاس پہنچے گا ”بفرمائید بفرمائید“۔ دُودھ وہاں نہیں ڈالتے۔ ہم نے معلوم کیا عموماً ایسا چھوٹا گلاس، ہمارے کپ کا تین چوتھائی سمجھئے، ایک ریال یعنی ایک آنے میں دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح

سے قومی مشروب بن گیا ہے۔ چائے اچھی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں کی طرح کاڑھا یا جوشاندہ نہیں بناتے۔ لیکن ہوٹل میں ذرا زیادہ قرینہ ہوتا ہے۔ دو چائے دانیاں آتی ہیں۔ اصل میں چائے دانی ایک ہی ہوتی ہے، دوسری پانی وانی کے لئے، کیونکہ اس میں خالی گرم پانی رہتا ہے۔ اگر آپ چائے کا رنگ ہلکا کرنا چاہتے ہیں تو اس میں تھوڑا پانی ملا لیجیے۔ ہم ہلکی چائے پسند کرتے ہیں، ہمیں تو یہ طریقہ پسند آیا۔ ایک آدھ بار دودھ مانگا۔ فوراً مہیّا کیا گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جو مزا بلا دُودھ پینے میں آیا، دُودھ کے ساتھ نہیں آیا۔ لہٰذا پھر ہم نے بھی دُودھ سے کنارا کیا۔

اب کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ خوب بن ٹھن کر ہم نے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لئے چابی لگائی تو وہ پوری گھوم کے نہیں دی۔ دوسری طرف گھمائی وہ بھی بیکار۔ زور لگایا، ناکام بلکہ چابی کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہوا۔ سوچا۔ پھر زور لگایا۔ پھر سوچا۔ وہی نتیجہ۔ ہو نہ ہو بیرا جاتے ہوئے باہر سے بند کر گیا۔ خدا جانے کیسا دروازہ ہے۔ عقبی کھڑکی میں سے باہر کاریڈور میں نکلنا چاہیے۔ لیکن کھڑکی میں جالی تھی، روشن دان کوئی نہ تھا۔ دروازے کے کسی طرف کسی قسم کی جھری نہ تھی جس سے اپنی چابی باہر کسی کو دے کر کہہ سکتے کہ باہر سے کھولو۔ شکر خدا کا کہ ٹیلیفون کمرے میں موجود تھا۔ ہم نے کاؤنٹر پر فون کیا کہ ہم ۱۸ نمبر کمرے میں بند ہو گئے ہیں۔ آپ کا بیرا یعنی

آقائے پیش خدمت غالباً اسے باہر سے بند کر گیا یا پھر اس تالے میں کوئی اونچ نیچ ہے۔ لِلّٰہ مدد کیجیے۔ ہمیں ایک جگہ پہنچنا ہے۔ آپ کے پاس ڈُپلیکیٹ چابی تو ہو گی۔

ایک ترکیب بتا کر بولے۔ ”اس طرح کیجیے۔“

ہم نے کہا۔ ”اس طرح کر لیا۔“

عرض کیا ”یوں بھی گھُما دیکھا۔“

بولے ”پھر تو انتظار کرنا ہو گا کیونکہ جس آدمی کے پاس چابیاں رہتی ہیں وہ کل کے لئے گوشت لینے گیا ہے۔“

”کب آئے گا؟“

”کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں آ جانا چاہیے۔ اور کوئی خدمت ہو تو حاضر ہیں۔“

اتنے میں کہ بیرا گوشت لے کر آئے، آپ ایک قصّہ سنئے کہ لندن میں بھی پہلے روز ہمارے ساتھ ایسی ہی واردات ہو چکی ہے۔

ہم کوئنز گارڈن میں جو ہائیڈ پارک کے سامنے کوئنز وے کے پاس ہے، پچاس نمبر

کے مکان میں فروکش ہوئے۔ ہم کا مطلب ہے یہ گنہگار اور بنگالی شاعر ابوالحسین۔ دِن تو گذرا، رات کو سونے کے لیے لیٹے تو ابوالحسین نے کہا ذرا ٹھیک سے دروازہ بند کر لینا، لندن میں چور اُچکّے بہت ہیں۔ بے شک چور اُچکّوں کا ڈر تھا کیونکہ ہمارے سوٹ کیسوں میں کئی کئی قمیصیں، پاجامے، کتابیں، رسالے، شیو کا سامان، بٹن ٹانکنے کا سوئی دھاگہ، غیر مطبوعہ کلام، غرضیکہ خاصی قیمتی اشیا تھیں۔ ہم نے تالا لگانا چاہا تو دیکھا کہ اندر چابی کا سوراخ ہی نہیں ہے۔ ہم نے کہا ''ابوالحسین چابی کہاں لگائیں۔''

بولے ”چابی کے سوراخ میں۔“

عرض کیا ”وہ کہاں ہے، ذرا دیکھ کے بتاؤ۔“

بولے ”اندھوں کو بھی نظر آتا ہے۔“

ہم نے کہا ”ہم اندھے تھوڑا ہی ہیں۔ تم کوشش کرو۔“

سوراخ اُن کو بھی نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ہم نے کہا اچھا ہم باہر سے جا کر تالا لگاتے ہیں۔

بولے۔ ”پھر اندر کیسے آؤ گے؟“

ہم نے کہا ”یہ پھر سوچیں گے۔ سب کام ایک ساتھ نہیں کرتے۔“ ہم نے باہر جا کر چابی گھمائی اور کھٹ سے تالا لگا دیا۔ پکار کر ابو الحسین سے کہا۔ ”اب ذرا اسے کھول کے دیکھو۔“

اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ پھر کھُل گیا۔

اب ہم چکنم میں پڑ گئے۔ لینڈ لیڈی سے کہیں گے تو پوچھے گی تمہارے پاس کون سے ہیرے جواہر ہیں جو ہم برطانویوں کی نیّتوں پر شک کرتے ہو۔ خیر یوں ہی لیٹ

گئے۔ تھوڑی دیر ہوئی ذرا کھٹکا ہوا۔ ہم نے جان ہتھیلی پر رکھ کر دروازہ کھولا۔ کوئی نہ تھا۔ پھر سرسراہٹ ہوئی۔ اب کے بھی دیکھا تو باہر کاریڈور خالی تھا۔ سونا چاہا تو فکر سے نیند نہ آئی۔ آخر ایک کرسی کو بھڑا کر دروازہ کے ساتھ رکھا، اس پر اپنا سوٹ کیس، اس پر ابوالحسین کا سوٹ کیس، اس پر کمرے میں جو بھی بھاری چیز نظر آئی حتّٰی کہ پانی پینے کا مگ، صابون اور اپنا بلیڈوں کا پیکٹ بھی رکھ دیا۔ تب کچھ اطمینان ہوا۔

یہ ہمارا اس قسم کے تالوں سے پہلا تعارف تھا جو دروازہ بھیڑنے سے خودبخود بند ہو جاتے ہیں اور پھر باہر سے چابی کے بغیر نہیں کھول سکتے۔ ہاں اندر سے آپ انہیں بلا چابی ہینڈل گھُما کر کھول سکتے ہیں۔ خیر آدھ گھنٹہ گزرا۔ پون گھنٹہ ہو گیا۔ کاؤنٹر سے معلوم کیا۔ پتہ چلا گوشت لینے والے صاحب ابھی نہیں آئے، شاید دوسری مارکیٹ چلے گئے جو شہر سے باہر ہے۔ آخر دروازے میں باہر سے کنجی گھومی اور ہم آزاد ہو گئے۔

ہم نے کہا "آقا۔۔۔ کیا خرابی تھی؟"

بولے۔ "یہاں گوشت خراب ملتا ہے۔ اس لئے شمران چلا گیا تھا۔"

ہم نے کہا۔ ”گوشت کی نہیں پوچھتے، تالے کی پوچھ رہے ہیں۔“

بولے: ”تالا تو بالکل ٹھیک ہے یہ لو۔ انہوں نے کھولا، بند کیا، کھولا بند کیا۔“

بولے۔ ”بس چابی گھماتے وقت ایک ہاتھ سے کواڑ کو ذرا دھکیلے رکھو۔“

ہم نے ناراض ہو کر کہا۔ ”یہ بات جناب آقا۔ ہمیں پہلے بتانی چاہیے تھی۔ ہم نو وارد غریب الوطن یہ بھید کیا جانیں۔“

قالین گاہی
CLOSED

آقائے ابنِ انشا خریداری کو نکلے

تہران روانہ ہونے سے پہلے ہم نے سوچا کہ کسی ایرانی سے پوچھنا چاہیے کہ ایران مہنگا ہے یا سستا۔ یہیں نیچے کیفے ساسان کے ایرانی سے پوچھا۔ ”کہیے آقا تہران سستا ہے یا مہنگا۔“

بولے۔ ”مہنگا بھی ہے سستا بھی۔“

”کیا مطلب آقا؟“

مطلب یہ کہ اگر منہ مانگے دام دو تو سخت مہنگا، مول تول بھاؤ تاؤ کرو تو سستا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر کوئی دُکاندار دس روپے کہے تو پانچ سے شروع کرنا اور سات میں لے لینا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آخر ایرانی تھے۔ ایرانیوں کی پچ کر گئے۔ اصل میں تین سے شروع کر کے پانچ پر ختم کرنا چاہیے تھا۔ بلکہ حاجی بابا اصفہانی نے جب تہران کی جونا مارکیٹ سے کپڑے خریدے ہیں تو دُکاندار نے چوبیس تومان کا حساب جوڑا تھا لیکن حاجی صاحب نے پانچ تومان بولی لگائی اور چھ پر تصفیہ ہو گیا تھا۔

ٹیکسی کا ہم عرض کر چکے کہ شہر میں کہیں چلے جایئے، پندرہ ریال سرکاری طور پر مقرّر ہے۔ لیکن ہوشنگ نے ایک روز کہا۔ دیکھو اگر نزدیک جانا ہوا کرے تو دس ریال پانچ ریال میں بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ہم معاملہ کرنے لگے اور ٹیکسی ڈرائیور نے ایک بار بھی تو انکار نہیں کیا۔ کتابیں بھی ہم چھپی ہوئی قیمت پر خریدتے رہے۔ بہت بعد میں پتہ چلا کہ یہ بھی ہماری غَلَطی تھی۔ ایران میں کوئی چیز خریدنی ہو تو کہیں گے "ایں چند است" یعنی کتنے کی ہے۔ اپنی فارسی چلانے کی کوشش نہ کیجیے کہ قیمتش چیست، بہایش چہ قدر ہست۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کُچھ نہیں چلے گا۔ پھر دُکاندار جو بتائے اس کا جذر نکال کر اسے جواب دیجیے۔ وہ کہے گا نمی باشد، نمی باشد۔ یعنی ہرگز ہرگز نہیں۔ اور چیز (بظاہر) سمیٹنی شروع کر دے گا۔ چلتے

چلتے کہیئے کہ "آخر بچند می فروشی" یعنی میاں دینے والی بات کرو۔ ہم سے اینچ پینچ نہیں چلے گا۔ آخر وہ "بجان شما" کہہ کر دے دے گا۔

فروش گاہِ فردوسی یہاں کا مشہور ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ چار منزلیں انواع و اقسام کے مال اسباب سے پُر ہیں۔ باہر کا مال بھی ہے، لیکن زیادہ تر ایران کا۔ اچھے سے اچھا، لندن کے سیلفریج کے انداز پر نیچے کے طبقے یعنی زیرِ زمین منزل میں کھانے ریندھنے کے برتن اور بھاری سامان ہے، اوپر کپڑے، سنگھار کا سامان، روزمرّہ ضرورت کی چیزیں، گھڑیاں، ریڈیو، ریڈی میڈ سوٹ، کھلونے، مٹھائیاں، زیورات وغیرہ۔ سب سے اوپر کی منزل پر فرنیچر ہے، صوفہ سیٹ، چھپر کھٹ وغیرہ اور ایران کی فنکارانہ مصنوعات بھی۔ ساتھ ہی ریستوران ہے۔ آپ اسٹال سے چیز لیجیے، وہیں ایک خاتون کیش میمو دے دے گی۔ جی ہاں زیادہ تر بلکہ تمام تر خواتین ہی ہیں اور یہ کام عورتوں ہی کے کرنے کے ہیں۔ لیکن ایک فرق یورپ کے اور ایران کے ڈپارٹمنٹل اسٹورز میں دیکھا کہ وہاں کوئی کسی چیز کی سفارش نہیں کرتا۔ آپ کو جو لینا ہے خود پسند کیجیے۔ یہاں یہ ہوا کہ ایک چیز خریدنی ہے تو خاتونِ محترم دو چیزیں اور لا کے رکھے گی، صاحب یہ بڑی عمدہ چیز ہے، یہ ضرور لیجیے۔ جی خوش ہوا کہ کچھ تو مشرقیت باقی ہے، ہم نرے کرستان ہو کر نہیں رہ گئے۔ یوں نام کے فروش

گاہیں اور سپر مارکیٹ تہران میں اور بھی ہیں لیکن اصل یہی فروش گاہِ فردوسی ہے جو خیابانِ فردوسی پر بانک ملی ایران کے صدر دفتر کے پاس واقع ہے۔ چیزیں دیکھ کر خوش ہوا لیکن سچ یہ ہے کہ خریداری میں مزہ نہیں آیا۔ کیونکہ یہاں دام کم نہیں کرتے، جو دام لکھا ہے وہی لیتے ہیں۔۔۔ اس شکایت پر ہوشنگ نے کہا "پھر تم یہاں کیوں آئے۔ بازار بزرگ جاؤ۔ وہاں تمہارے گاؤں کے لوگ ملیں گے۔"

یہ بازار بزرگ ہے۔ یہاں کا مشہور روایتی بازار۔ چھتے ہوئے تنگ راستے، ہر دو طرف بھری پُری دُکانیں، سو گز جایئے تو ایک شاخ داہنے ہاتھ پر مُڑ جائے گی ایک بائیں ہاتھ، اس پر مزید کراسنگ آئیں گے۔ اور مزید چوشاخے نکلیں گے۔ یہ چینی کے برتنوں والے ہیں۔ چھتوں تک چینی اور شیشے کے ظروف اٹے ہیں، لیکن مال باہر کا ہے۔ اِدھر منقّش برتن اور کپڑے بِکتے ہیں، اِدھر پنساری، اِدھر چمڑے کے سوٹ کیسوں والے۔ یہ جوتوں کا بازار ہے، یہ قالینوں کی گلی ہے۔ پورا الف لیلہ کا نقشہ ہے اور جوڑیا بازار کی سی ہما ہمی ہے کہ ریڑھے پر سامان لدا آ رہا ہے اور پیدل کے گزرنے کی گنجائش بھی نہیں۔ غور سے دیکھنے پر یہاں کے تاجران کرام دہلی کے پنجابی سوداگر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ایک بات یاد رہے یہاں داڑھی کوئی نہیں رکھتا۔ سب صفاچٹ ہیں اور مغربی لباس کے علاوہ کوئی لباس نہیں۔ سارے تہران

میں داڑھیوں اور لبادوں والے تین چار ہی آدمی نظر آئے، وہ بھی درگاہ شاہ عبد العظیم میں۔

بازار بزرگ کی بھول بھلیّاں ایسی تھیں کہ ہوشنگ کو جو تہران کی پیدائش ہے، کئی بار راستہ پوچھنا پڑا۔ سب گلیاں ایک سی ہیں اور پیچ در پیچ گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ آخر جو ہم ایک گلی سے مُڑے تو ایک صحنۂ مسجد میں نکلے۔ ''یہ کیا ہے؟''

معلوم ہوا یہاں کی مشہور مسجد شاہ ہے لیکن لوگ چھابڑیاں لئے جوتے پھٹکارتے صحن کے اِدھر سے آتے تھے اُدھر سے نکل جاتے تھے۔ صحن کے وسط میں حوض تھا جو یہاں ہر مسجد میں ہوتا ہے۔ چار طرف حجرے جو اب بند ہیں استعمال میں نہیں آتے۔ ایران کی مسجدوں کی وضع ہماری مسجدوں سے مختلف ہوتی ہے۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں ایک طرف کولکی سی میں۔ باقی صحن میں جس کا جی چاہے آئے جائے۔

چند دِن میں ہم بھاؤ تاؤ مول تول میں ایسے مشّاق ہو گئے کہ دُکاندار ہم سے خوف کھانے لگے اور جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دس کہتے ہم ایک کہتے تو دُکاندار ہماری شکل دیکھتے ہی یا تو دُکان بند کرنے لگتے یا عقبی دروازے سے فرار ہوتے کہ بچو پاکستانی آقا خریداری کرنے آیا ہے۔ البتّہ لالہ زار کے ایک دُکاندار سے ہم نے جو

خریداری کی اس کی متعلّق طے نہیں کون نفع میں رہا کس نے گھاٹا کھایا۔

لالہ زار تہران کی الفنسٹن اسٹریٹ ہے۔ سبھی طرح کی دُکانیں ہیں، لیکن کپڑوں کی زیادہ۔ بزاز بھی ہیں درزی بھی۔ سوٹ خریدنے بنوانے کا نہ وقت تھا نہ پیسے، ہم کھڑکیوں میں سیر دیکھتے بورڈ پڑھتے گزر رہے تھے کہ ایک صاحب نے فوراً آداب سلام کرنے اپنی چھوٹی سی دُکنیا میں آنے کی دعوت دی۔ دعوت کیا دی گھسیٹ لیا۔ کچھ ٹائم پیس تھے، کچھ ٹائیاں تھیں، کُچھ موزے بنیان وغیرہ۔ آپ نے الف لیلہ میں بوبک حجام کا حال پڑھا ہو گا جس کی زبان ہی تالو سے نہیں لگتی، اور چلتی رقم ایسا جیسے ہر عضو میں کمانیاں لگی ہوں۔ یہ شخص بھی نان اسٹاپ بولتا تھا۔ ہم نے تھوڑی دیر تو بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن آخر کان لپیٹ لیے۔ نہ بھی لپیٹتے تو اتنی فارسی آدھ گھنٹے میں بول گیا جتنی ہم نے ساری عمر میں نہیں سُنی۔ گفتگو میں کہیں کہیں کوئی لفظ سمجھ میں آتا تھا۔ لہٰذا وہ کُچھ کہتا تھا ہم کُچھ، نہ وہ ہماری سُن رہا تھا نہ ہم اس کی سمجھ سکتے تھے۔ گفتگو کا انداز کچھ یوں تھا(جو لفظ سمجھ میں آئے لکھ دیے ہیں، باقی جگہ لکیر ڈال دی ہے)۔

وہ: ”آقا بفرمائید ایں۔۔۔ بہ ایران۔۔۔ خیلے۔۔۔ شما۔۔۔ قربانت شوم۔۔۔ خواہش می کنم خواہش می کنم۔۔۔ باشد۔“

ہم نے ایک ٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ایں ٹائی چند است"

فرمایا۔ "آن کراویت (ٹائی کے لئے یہ لفظ فرنچ سے آیا ہے)۔۔۔ است۔"

"آقا چند؟" ہم نے کان ان کے نزدیک لے جا کر پوچھا، یعنی کیا فرمایا آپ نے؟

بولے۔ "شونزدہ شونزدہ شونزدہ۔"

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہم نے ان کو قلم دے کر کہا۔ "ایں جانبویسید۔"

تب سمجھ میں آیا کہ سولہ تومان کی بات ہے۔ شانزدہ کو شونزدہ ہمیں خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔

ہم نے کہا۔ "نہ آقا۔ پنج تومان۔"

پھر اس نے کچھ کہا، جس میں سے دوازدہ کا لفظ سمجھ میں آیا۔ گویا بارہ تومان پر اترے۔

"نہ آغا شش۔" اتنے ہمیں ہماری نظر ایک اور ٹائی پر پڑی۔ اس کا انہوں نے پونزدہ یعنی پانزدہ یعنی پندرہ بتایا۔ ہم نے تو فقط پوچھا تھا، اس نے اتار کر دونوں ٹائیاں

کاغذ میں باندھنی شروع کر دیں۔

ہم نے کہا "برائے ہر دوازدہ تومان بیش نمی دہم "یعنی دونوں دس تومان میں دیتے ہو تو دو ورنہ چھٹی۔ بولے۔ "بست تومان۔ "یعنی بیس پر آئے۔

قصّہ مختصر وہ چودہ تومان پر اترے، ہم تیرہ تومان پر آئے۔

اب ہم نے ایک نوٹ دس تومان کا دیا، ایک دو کا اور ایک ایک کا۔ یاد رہے تومان محض لفظی سِکّہ ہے۔ اصل سِکّہ ریال ہے یعنی ایک نوٹ سو کا، دوسرا بیس کا اور تیسرا دس ریال کا تھا۔

اس نے کچھ کہا۔۔۔(یعنی ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں نہ آیا) ہم بخیر و سلامت کہہ کر جانے کو تھے کہ اس نے ہمیں بازو سے پکڑا اور ایک اونی بنیان اور اس کے ساتھ کا گرم گھٹنا ہمارے سامنے پھیلا دیا۔

"خیلے خوب است خیلے خوب است"

ہم نے کہا۔ "ہمارے ملک میں اتنی سردی نہیں ہوتی کہ اسے پہننے کی ضرورت ہو۔"

بولے۔ "ہوتی ہے۔"

ہم نے کہا۔۔۔ "نہیں ہوتی، ہم آئس لینڈ سے نہیں آئے۔"

بولے۔ "پھر بھی اچھی چیز ہے لے جاؤ۔"

ہم نے کہا۔ ”بابا ہم کیا کریں گے۔ ہمیں نہیں چاہیے۔“

کہنے لگے۔ ”بیس تومان میں دیتا ہوں۔ بالکل مُفت ہے۔“

ہم نے نہ نہ کر کے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

اب ہم نے عذر کیا یہ ۴۸ نمبر کی ہے، ہمارا سائز ۳۹ ہے۔ یہ ہمارے لئے بڑی ہے۔

بولے۔ ”نمبر کی پرواہ نہ کرو، تمہارے انشاء اللہ فٹ آئے گی۔“

ہم نے انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نا۔۔۔نا۔۔۔نا۔“

پھر فارسی کا ایک سیلابِ عظیم اُمڈا۔۔۔ اب کے ہم نے ایک جگہ کان لگایا اور اس نے بھی زور دے کے چند الفاظ صاف بولے۔ تو پتہ چلا کہ ہم پیسے زیادہ دے گئے تھے۔ ہم نے حساب لگایا واقعی ٹھیک تھا۔ ہم نے جو نوٹ دو تومان یعنی بیس ریال کا دیا تھا، وہ اصل میں دو سو ریال کا تھا۔ گویا ہم نے تیرہ کے بجائے اکتیس تو ان دے دیے تھے۔

ہم بہت ممنون اور متشکّر ہوئے اور ان کی ایمانداری کو سراہا، جو واقعی سراہنے کے قابل تھی۔ ہم نے کہا۔ ”اچھا اب پیسے دو۔“

لیکن پھر اس نے وہ بنیان اور زیر جامہ پھیلا دیے کہ یہ لیجیے۔

اب ہم نے سوچا کہ اگر یہ خود نہ بتاتا تو ہمارے اکتیس تومان گئے تھے۔۔۔ لہٰذا چودہ تومان پر طے کر کے ٹائیوں کے ساتھ یہ دونوں چیزیں بھی بندھوالیں اور ریز گاری واپس لے کر پھر شکریہ ادا کیا۔

قارئین کرام!

اب یہ چیزیں ہمارے پاس ہیں جن صاحب کا کراچی شہر میں ۴۸ نمبر سائز ہو ہم سے آواز دے کر طلب کر لے۔

حاجی بابا نے پوشاک خریدی

پس اس مصیبت سے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے مول لیا تھا، اپنا گریبان چھڑا کر اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوا پھر پرانے کپڑے پہننے والوں کے بازار میں گیا۔ پہلی دُکان پر میں نے ایک جُبّہ دیکھا۔ اس خیال سے کہ اس جُبّہ سے میں بھی صاحبِ جُبّہ کی طرح خیال کیا جاؤں گا، میں نے پوچھا کہ اس کی کیا قیمت ہے؟ دُکاندار نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا یہ سُرخ جُبّہ؟ میں نے کہا ہاں۔ بولا کس کے واسطے؟

میں نے کہا خود میرے لئے۔ بولا تو کتنے میں لے گا۔ تجھے اس گوڈر شاہی شکل میں اس جُبّہ سے کیا غرض؟ یہ جُبّہ مخصوص بڑے لوگوں اور میر منشیوں کا ہے۔ میں قریب قریب جھلّا کر دُکاندار کے سر ہونے کو تھا کہ اتنے میں ایک دلال پرانے کپڑوں کی گٹھڑی لئے گذرا۔ میں نے دُکاندار کو چھوڑ کر اسے آواز دی۔ وہ آیا۔ دُکاندار اپنی بیہودگی سے پشیمان ہو کر مُجھے بُلانے لگا۔ اس نے کئی آوازیں دی مگر میں نہ بولا۔ دلال مجھے ایک مسجد کے دالان میں لے گیا۔ گٹھڑی کھولی تو میں نے ایک کوٹ دیکھا۔ بہت اچھا معلوم ہوا۔ اس کی قیمت پوچھی، دلال نے پہلے میرے سلیقے کی، پھر عمدگی لباس کی تعریف کی اور قسم کھا کر کہا یہ بادشاہ کے ایک خاص فراش کا ہے، ایک دو مرتبہ سے زائد نہیں پہنا گیا۔ جب میں نے پہنا تو مُجھ پر نثار ہونے لگا کہ ماشاءاللہ لباس کی آراستگی اور عمدگی کا کیا کہنا۔

تجھے اے گل قبا کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے

میں نے چاہا کہ اس کی تعریفات کو رد کروں۔ پھر میں نے ایک کشمیری شال طلب کی۔ اس نے شال نکالی۔ باوجود ہزاروں سوراخ میں رفو ہونے کے خدا کے ایک ہزار ناموں کی قسمیں کھائیں کہ حرم شاہی کی ایک بیگم کا ہے۔ بد نصیبی سے اسے بہت سستا فروخت کر رہی ہے۔ بیگم شاہ کی شال ہونے کے غرور میں مَیں نے اسے

اتنی قیمت میں خریدا جتنی قیمت میں ایک شال کرمانی خرید سکتا تھا۔ خنجر رہ گیا تھا وہ بھی دلال نے لا دیا۔ جب میں اس طرح آراستہ ہو گیا تو دلال نے خوشنودی کا اظہار کیا اور قسم کھا کر کہا کہ آج تہران میں تیری طرح کوئی آراستہ نہیں۔

جب حساب کرنے کا وقت آیا تو معاملہ کی صورت بدل گئی۔ دلال نے قسم کھا کر کہا میں ٹھکانے کا آدمی ہوں، وہ نہیں جو سو مانگیں اور پچاس لیں۔ خدا ایک ہے، بات بھی ایک ہے۔ کوٹ کے پانچ تومان، شال کے پندرہ تومان، خنجر کے چار تومان۔۔۔ کُل چوبیس تومان ہوئے۔ چوبیس تومان کا نام سن کر تو میری ساری خوشی کا جوش جاتا رہا۔ اپنے آپ کو ملامت کر کے میں نے چاہا کہ تبدیلی لباس کے خیال ہی کو چھوڑ دوں۔ لباس اتارنا شروع کر دیا۔ دلال نے میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیا کرتا ہے، تجھے گراں معلوم ہوتا ہے، مُجھے اس میں ایک کوڑی کا بھی نفع نہیں۔ میں نے جو قیمت کہی وہی اصل ہے، اچھا تو کیا دینا چاہتا ہے؟ میں نے کہا تیری قسموں کے مقابلے میں کیا کہوں جو خدا کو بھی بھلا معلوم ہو۔ اچھا پانچ تومان دیتا ہوں۔ دلال نے بے پروائی سے قبول نہ کئے۔ میں نے بھی انتہائی بے پروائی سے لباس اتار دیا۔ جب اس نے گٹھڑی باندھ لی تو بظاہر معاملہ ختم ہو گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا دوست تُو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تیری خدمت کروں اور ایسی

خدمت جو ایک بھائی دوسرے بھائی سے نہ کرتا ہو۔ اب جو کچھ بھی ہو دس تومان دے دے۔ میں نے یہ قبول نہ کیا۔ آخر کار بڑی گفتگو کے بعد چھ تومان ادا کئے اور ایک تومان کا اپنے لئے قبا خرید لیا۔ بات ختم ہوئی، اس نے مُجھے چھوڑا، میں نے خرید کر وہ لباس ایک رومال میں لپیٹ کر حمام کا راستہ لیا۔

(حاجی بابا اصفہانی)

تاریخ کی گلیوں میں

ایک روز کان پر رکھ کر قلم نکلے تو موزہ مردم شناسی کی راہ لی کہ سب سے قریب پڑتا تھا۔ خیابان بُو علی سینا کے پاس ایک چھوٹا سا کوچہ ہے۔ اس کے اندر جائیں تو ایک چھوٹا سا میوزیم۔ اسے بہت کم لوگ دیکھنے جاتے ہیں لیکن ہے یہ دیکھنے کی چیز۔ اس میں گذشتہ صدی یعنی قاچاروں کے عہد کے رہن سہن کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ یہاں ایک بڑھیا امّاں کا چرخہ رکھا ہے۔ گوڈر اور موم کے قدِّ آدم مجسّمے زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اس دور کا گرجستانی دہقان ہے، یہ ارمنی تاجر، یہ کُردی دلہن، یہ ملّا

درس دے رہا ہے، لڑکے سہمے بیٹھے ہیں اور چھڑی اب اُٹھی کہ اُٹھی۔ اِدھر قاضی بیٹھا ہے اور اس کے سامنے ایک طرف وہ خدا یعنی زمیندار ہے اور ایک طرف دہقان خراب حال جو ایک ٹوکری میں نذر کے لئے انڈے اور پھل بھی لایا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ جانے کیا مقدمہ ہے اور کیا فیصلہ ہونے کو ہے۔ ایک طرف طبیب اپنی جڑی بوٹیاں اور دواؤں کی شیشیاں سنبھالے بیٹھا ہے۔ اُدھر ایک زَرگر امیر کو دِکھانے کے لئے زیورات کا پٹارا کھولے ہے۔ یہ اِصفہان کے تاجر کا گھر ہے۔ بیچ میں ایک چوکی ہے، اس پر ایک بہت بڑی رضائی جس کے چار اطراف گھر کے چار افراد بیٹھے ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچّے، سب نے ایک ایک پلّو دبا رکھا ہے ایک نیم تاریک کمرے میں قافلے کا سامان ہے۔ ایک گھوڑا ہے جس پر سوداگر میاں بیٹھے ہیں اور حُقّے کی منہال منہ میں ہے۔ ابھی ٹٹخارہ اور سمند چلا۔ دوسرا ٹٹّو ہے جس پر نوکر بیٹھا ہے جس نے مشکیزہ، کوئلے کی انگیٹھی اور ناج دال کے پُشتارے سنبھال رکھے ہیں۔ ایک خچر کے دونوں طرف کجاوے ہیں۔ ہر ایک میں ایک شخص آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہے۔ یہ کوئی پابندی نہیں کہ سیٹ کے بند باندھیے اور سگریٹ بجھا دیجیے۔ مزے مزے میں کہانیاں کہتے سیر دیکھتے حُقّہ پیتے چلے جا رہے ہیں۔ البتّہ قزّاقوں کا ڈر راستے میں ضرور ہے اور حاجی بابا اصفہانی کے عثمان آغا کا سفر یاد آتا

ہے۔ ہمارے مولوی محمد حسین آزاد بھی اسی عالم میں منزلیں طے کرتے ہوں گے۔ اِدھر اس کمرے میں پچھلی صدی کے قاچار بادشاہوں کی کُچھ یادگاریں اور مرقعے ہیں۔ گائیڈ نے ایک شیشے کے کیس کی طرف اشارہ کیا، اس میں سب سے نامور قاچار بادشاہ ناصر الدّین شاہ کی واسکٹ لٹکی تھی جس میں گولی کا چھید تھا، اور نیچے ایک رومال بھی رکھا تھا جس سے خون بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے اور خون کا رنگ بدل کر سُرخ سے مٹیالا ہو گیا ہے۔ اچھا تو یہ لوگ تھے، جبروت اور قہرمانی کے اوتار، محمد شاہ، فتح علی شاہ، ناصر علی شاہ۔ آخر فنا آخر فنا۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ افشار کے قتل کے بعد کُچھ دِنوں طوائف الملوکی رہی۔ پھر زند خاندان نے بیس برس حکمرانی کی۔ یہ اچھے لوگ تھے اور اِن کا دور امن و آسودگی کا دَور تھا۔ لطف علی خان زند کے زمانے میں ترکی قبیلے قاچار کے سردار آقا محمد نے شورش کی اور ایک لشکرِ جرّار سے شہر کرمان کا محاصرہ کیا۔ لطف علی خاں کے پاس اتنی فوج نہ تھی۔ وہ اپنے اسپ باوفا کو مہمیز کر کے فقط تین منچلے ہمراہیوں کے ساتھ دُشمن کے لشکر کو چیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ آقا محمد نے غضب ناک ہو کر قتلِ عام کا حکم دیا۔ دو ہزار عورتیں بچے لونڈی غلام بنا کر فروخت کر دیے۔ پھر حکم دیا کہ باشندگانِ کرمان کی ستّر ہزار آنکھیں نکال کر طشت میں پیش کی جائیں۔ اس نے

اپنے خنجر کی نوک سے خود اِن آنکھوں کو گِنا اور مُڑ کر وزیر سے کہا "اگر ایک بھی کم ہوتی تو تمہاری آنکھ نکال کر گنتی پوری کرتا۔"

لطف علی خاں زند بھی غریب آخر گرفتار ہوا، آقا محمد نے اپنی فتح کی یادگار میں لطف علی خاں کے سرفروش ساتھیوں کی کھوپڑیوں کا ایک مینار بنوایا۔

فتح علی شاہ، آقا محمد کا بھتیجا تھا۔ ایک روز اس نے سفارش کی کہ رعایا سے ذرا نرمی برتنی چاہیے۔ آقا محمد نے کہا "بے وقوف! رعایا کے ساتھ سختی سے پیش آنا ہی میری حکومت کی کامیابی کا راز ہے۔ میرے خیال میں تو پورے دس گھروں میں ایک چولہا چاہیے تاکہ بآسانی اپنا کھانا بھی نہ پکا سکیں، ورنہ کھا کھا کر موٹے ہو جائیں گے اور تیرے خلاف فساد پھیلائیں گے۔" آقا محمد نے احتیاطاً سب اعزہ مروا دیے۔ اس شخص نے نادر شاہ کی ہڈّیاں نکلوائیں اور اپنے محل کی دہلیز کے نیچے دفن کرائیں۔ ایسوں کی موت بھی ایسی ہوتی ہے۔ ۱۷۹۷ء میں اس کے باڈی گارڈ کے دو افسروں میں جھگڑا ہوا۔ آقا محمد نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ علی الصباح دونوں قتل کر دیے جائیں، لیکن رات کو اپنی ڈیوٹی دیتے رہیں۔ ان دونوں نے اپنی جان سے نااُمّید ہو کر رات کو خواب گاہ میں گھُس کر آقا محمد کا کام کر دیا۔

آقا محمد گئے اور فتح علی شاہ آئے۔ یہ بھی کُچھ کم نہیں تھے۔ ان کے ایک بچے کھُچے چچا صادق خاں نے بغاوت کی تو یہ مجبوراً میدان میں آئے لیکن ڈرپوک تھے۔ بندوقوں کی آواز سے غش کھا کر گر گئے۔ وزیرِ خوش تدبیر حاجی ابراہیم نے بات بنائی کہ "بادشاہ سلامت فرطِ غضب سے آپے میں نہیں رہے۔ قہرِ سُلطانی کا سیلاب اُمڈنے کو ہے۔ ہتھیار ڈال دو تو چین ہی چین ہے۔" بے چارے صادق خاں نے حاجی ابراہیم کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ فتح علی شاہ نے اسے ایک حُجرے میں بند کر دیا۔ چند روز بعد دروازہ کھلوایا۔ دیکھا کہ غریب بھوک سے عاجز ہو کر انگلیوں سے مٹّی کھود کھود کر کھاتا رہا اور ہمیشہ کے لیے سیر ہو گیا۔

پھر طویلے کی طرف

فتح علی شاہ قاچار نے ایک بار کچھ اشعار نظم کئے اور ملک الشعرا سے ان پر رائے مانگی۔ اشعار نہایت ہیچ پوچ تھے اور ملک الشعرا نے اگرچہ اپنی رائے نہایت گول مول لچھّے دار الفاظ میں پیش کی۔ لیکن مطلب یہی نکلتا تھا کہ بس ایسے ہی ہیں۔ بادشاہ نے برافروختہ ہو کر کہا۔۔۔"یہ گدھا ہے اسے طویلے میں لے جاؤ۔"

ملک الشعرا کچھ دِن گھاس کھاتے رہے۔ ایک روز پھر بادشاہ نے فکرِ سخن کی اور ملک

الشعرا کو بُلا کر داد طلب کی۔ شاعر صاحب بغیر کچھ کہے جانے کے ارادے سے اُٹھے۔ شاہ نے پوچھا۔ کہاں؟ بولے۔ پھر طویلے جاتا ہوں۔

بادشاہوں کا کیا ہے۔ گاہے بدشنامے خلعت می دہند۔ خوش ہو کر اس کا منہ مصری سے بھروا دیا۔ چار آنے کی مِصری سے کام چل گیا۔ پرانے لوگ موتیوں سے مُنہ بھروایا کرتے تھے، بہت فضول خرچ تھے۔ اس وزیرِ باخوش تدبیر کا حشر بھی سنئے۔ ایک روز فتح علی شاہ نے اس کے تمول اور اقتدار سے حسد کھا کر اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور زبان گدی سے کھنچوا دی۔

فتح علی شاہ کی چار بیویاں تھیں جن کی خدمت کے لئے پانچ سو خواجہ سرا تھے۔ ان بیگموں سے دو سو ساٹھ اولادیں ہوئیں۔ ڈیڑھ سو لڑکے، ایک سو دس لڑکیاں۔

فتح علی شاہ کے بعد ناصر الدّین شاہ کا دور آتا ہے، جس نے نصف صدی تک حکمرانی کی۔ پدر اگر نہ تواند پسر تمام کند۔ اس کے عہد میں لوگوں کو مغرب کی ترقّیوں کی ہوا لگنی شروع ہوئی اور خود ایران میں مغربی طاقتوں میں اقتدار کی جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ خود سیاحت پر یورپ کو گئے تھے اور آکر ایران میں یورپ کے تمدن کی قلم لگانی چاہی، لیکن آخر ایسے متاسف ہوئے کہ اپنے امراء کو سفرِ یورپ سے حکماً روک دیا۔

ان کے نزدیک ٹھیٹ ایرانی کہلانے کا مستحق وہی شخص تھا جو یہ نہ جانتا ہو بر سلز کوئی شہر ہے یا ترکاری۔

ناصر الدّین شاہ نے بابیوں پر بہت ستم ڈھائے۔ تیل میں ڈبوئی ہوئی رسّیوں سے ان کو جکڑ کر آگ لگا دی اور تہران کے گلی کوچوں میں ان کی تشہیر کی۔ بے سر لاشیں سڑکوں پر عام پڑی رہتیں۔

ایک بار سپاہوں کے ایک دستے نے تنخواہ نہ ملنے پر شورش کی اور اس وقت واپس آئے جبکہ ان سے عفو و تقصیر کا وعدہ کیا گیا۔ اس وعدہ کے باوجود ان میں سے پچاس سر بر آوردہ اشخاص کو نہایت سفّاکانہ طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہر ایک کے دانت اکھیڑ کر اس کے سر میں ہتھوڑے سے پیوست کئے گئے۔ پھر ایک بار یوں ہوا کہ تہران کے مالداروں نے گراں قیمت پر بیچنے کے لئے تمام غلّہ خرید کر جمع کر لیا تھا۔ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ ایک روز شاہ گھوڑے پر سوار آرہا تھا۔ راستے میں عورتوں نے گھیر کر فریاد کی۔ شاہ کو بہت غُصّہ آیا اور حاکمِ شہر کو بُلا کر اس ہنگامے کے متعلّق جواب طلب کیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ جواب دے شاہ نے حکم دیا کہ اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ حکم شاہی کی تعمیل ہوئی اور تمام شہر میں لاش کی تشہیر کے بعد تین دِن تک وہ اس ستون سے لٹکی رہی جہاں لوگوں کی گردنیں ماری جاتی تھیں۔

اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی گئی۔

آخر وزیرِ داخلہ نے ایسی ترکیب کی کہ سڑکیں شکایت کرنے والوں سے صاف ہو گئیں۔ اس نے فراشوں کو حکم دیا کہ آدھ درجن کان کاٹ کر لاؤ۔ یہ سُنتے ہی فراش لوگوں پر جھپٹے کہ یا اپنے کان کٹواؤ یا فوراً معقول معاوضہ دو۔ تھوڑی دیر میں سڑکیں خالی ہو گئیں۔ فراشوں نے اپنی جیبیں بھریں اور چند فقیروں کے کان کاٹ کر پیش کر دیے۔ شاہ بہت خوش ہوا اور کہا ”فرخ میرزا! تم ایرانیوں پر حکومت کرنا جانتے ہو۔“

یہ بڑے کلّے ٹھلّے کے تاجدار تھے، لیکن ہر فرعون را موسےٰ۔ جب انہوں نے تمباکو کی پوری خرید و فروخت کے حقوق ایک انگریزی کمپنی کے ہاتھ بیچنے چاہے تو سیّد جمال الدّین افغانی کی تحریک پر علمائے اسلام نے تمباکو کی ممانعت پر فتویٰ جاری کر دیا۔ تمباکو فروشوں کی دُکانیں بند ہو گئیں۔ ایران کے زن و مرد جن میں سے نوّے فیصدی رات دِن حقّہ پینے کے عادی تھے، یک لخت اُسے چھوڑ بیٹھے۔ لوگوں نے حقّے توڑ تاڑ کے پھینک دیئے۔ آخر شاہ کو معاہدہ منسوخ کرنا پڑا اور پانچ لاکھ پاؤنڈ ہرجانہ دینا پڑا۔ اب شاہ، سیّد جمال الدّین کی جان کے لاگو ہو گئے۔ آخر انہوں نے درگاہ شاہ عبدالعظیم میں پناہ لی اور سات ماہ تک وہاں رہے۔ ناصر الدّین شاہ نے ایران کی

قومی روایت کو توڑ کر ان کو ایسے میں پکڑ منگوایا کہ بیمار تھے اور اُٹھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ اس پر اشتعال پھیلا اور آخرِ کار شاہ کو ایک جواں سال محبِّ وطن مرزا محمد رضا کرمانی کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

اب مظفّر الدّین قاچار تخت پر بیٹھے۔ لیکن اس عہد سے ایرانِ جدید اور آئینی اصلاحات کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔

سردار جی، ست سِری اکال

ہم ابنِ سینا بُک سیلر کی دُکان پر کتابیں دیکھ رہے تھے کہ مالکِ دُکان رمضان صاحب نے بتایا دیکھیے ایک ہندوستانی آقا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم گئے تو ایک صاحب خالد میاں دہلی کے کُتب فروش تھے۔ معلوم ہوا جرمنی جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا ''کیسے آنا ہوا؟'' بولے ''زاہدان کے راستے مشہد ہوتا ہوا بس سے آیا ہوں۔''

''کہاں ٹھہرے ہیں؟''

بولے۔ ''گردوارے میں۔''

''گردوارے میں؟ کیسا گردوارہ؟ ہم پوچھ رہے ہیں تہران میں کہاں ٹھہرے ہیں۔

"بولے۔ "تہران ہی میں تو کہہ رہا ہوں گردوارے میں۔"

تب انہوں نے بتایا کہ یہاں خالصہ جی خاصی تعداد میں ہیں اور زیادہ تر موٹر کے پرزوں کا بزنس کرتے ہیں۔ یہاں ان کا گردوارہ بھی ہے، بلکہ میں جو زاہدان سے آیا ہوں انہی صاحبوں کے ساتھ آیا ہوں۔ اچھے آدمی ہیں بس خرابی یہ ہے کہ پنجابی بولتے ہیں اور میں پنجابی سمجھتا نہیں۔

ہم نے کہا۔ ''ہم سے ملوائیے۔''

بولے۔ ''آپ پنجابی سمجھ لیتے ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''کُچھ کُچھ۔''

ان کے ساتھ دروازہ سے نکلے ہی تھے کہ تین سردار جی نظر پڑے۔ ایک دُکان سے فارسی بول بول کر پھل خرید رہے تھے۔ خالد میاں بولے اس بازار کے سِرے تک چلنا ہو گا۔ وہاں سے وہ ایک گلی میں مڑے۔ اندر ایک پورے کا پورا احاطہ موٹروں کے پرزوں کی دُکانوں کا تھا۔

یہیں زاہدان کی وجہ تسمیہ معلوم ہوئی۔ اس شہر کو پہلے دزواب کہتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب وہاں ریل بننی شروع ہوئی تو انگریزوں کا انتظام تھا اور وہ اُدھر ہی سے لیبر بھرتی کر کے لے گئے تھے۔ ان میں ایک بڑی تعداد سکھوں کی تھی۔ ریل تیّار ہو گئی تو کُچھ لوگ واپس آ گئے، کچھ نے وہیں روزی کے ذریعے تلاش کر لئے اور آباد ہو گئے۔ ایرانیوں نے جو ان کی وضع قطع دیکھی تو مرعوب ہو گئے کہ ہو نہ ہو مولوی لوگ ہیں اور زاہد ایسے کہ سن کی سی داڑھیاں بڑھا رکھی ہیں۔ پس اس شہر کو زاہدان کا نام دیا۔ زاہدان کے بازار سے گذریئے تو اب بھی دھوکا ہوتا ہے کہ پٹیالہ

کی کوئی تحصیل ہے۔ زندہ دِل اور وضع دار لوگ ہیں۔ بولی ٹھولی اور چال ڈھال وہی ہے جو کہ تھی۔ رتّی برابر فرق نہیں آیا۔

ایک پبلشر صاحب ترجمہ چھاپتے ہیں۔ انہوں نے ایک مسوّدہ دراز سے نکال کر دکھایا۔ مصنّف کا نام تھا خوشونت سینگ۔ سنگھ کی خرابی تھی۔ گویا ایرانیوں نے سکھوں کو مہمان تو رکھا لیکن ان کے سروں پر سینگ لگادیئے۔ اچھی قدر پہچانی۔

شیر از اور کنار آب رُکناباد وغیرہ

ان لوگوں پر ہمیں رشک تو خیر کبھی نہیں آیا، تعجّب ہمیشہ ہوا ہے جو صُبح اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ چرند پرند کی اور بات ہے، انسانوں کا اتنے سویرے اُٹھنا کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ صُبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لحاف کے اندر جو مزے کی غنودگی ہوتی ہے، اس کا لطف صُبح اٹھنے والے بے نصیب کیا جانیں۔ وہ تو اس وقت جنگل میں داتنیں کاٹ رہے ہوتے ہیں یا ٹھر ٹھر کرتے لارنس باغ کے چکّر۔ صُبح اُٹھنے کے فضائل ہم نے بھی پڑھے ہیں لیکن صُبح خیزوں میں سے کُچھ کو تو نمونیے یا بگڑے

زکام سے مرتے دیکھا۔ باقی کی عمریں بھی ہماری چال کے سست الوجودوں سے زیادہ لمبی ہوتی نہیں دیکھیں۔

پس ہم نے رات ہی کو ہوٹل کے نوکروں کو وصیّت کر دی کہ بھائی صُبح پانچ بجے جگا دینا، ہم شیراز جائیں گے۔ سبھی نے چشم کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھے اور واقعی سب کے سب علیٰ الصُبح ہمارے دروازے کے سامنے صف بستہ کھڑے تھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو ابھی کالی رات تھی۔ حتّٰی کہ مُرغ بھی جن کو بانگ دینے کے لئے اُٹھنا چاہیے تھا، خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ لمبی سی آہ بھر کر اُٹھے۔ شیراز کا ہوائی اڈّہ بس ننھّا مُنّا سا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیراز کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی اس کی قدامت و عظمت کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ موسم خزاں کا تھا، نہ پھول نہ پات۔ یہ یقین ہی نہ آتا کہ وہ شہر ہے جس کے گل و گلزار کی تعریف سبھی کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کُچھ امریکن ٹورسٹ بھی تھے۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو یہاں کیا ملتا ہے۔ نہ زبان سے علاقہ، نہ ادب و تہذیب سے نسبت۔ ایک کیمرہ لٹکایا، میم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سُنی اُدھر سدھار لئے۔ ہمارے ساتھ سامان کا کھڑاگ نہ تھا، بس سواری کی تلاش تھی۔ یہ بھی نہ معلوم تھا کہ شہر کتنی دور ہے۔ اتنے میں ایک صاحب نے کہا، "کہاں جانا ہے؟" لہجہ ایرانی لیکن زبان اُردو نما۔

"شہر جائیے گا؟" وہ پھر بولے۔

"ہاں۔"

بولے۔ "چلو، ہم اپنے دوست کو ڈھونڈ تا ہے، یہ لے جائے گا۔ کہاں جائے گا؟"

ہم نے کہا۔ "ٹرمینس پر پہنچ کے ہوٹل کی سوچیں گے کہ کہاں ٹھہریں۔"

ان صاحب کا نام ایرج تھا جو ایران میں خاصا عام نام ہے۔ زاہدان کے تھے۔ عمر تیس سال سے کم ہو گی۔ باپ پاکستانی یا ہندوستانی، ماں ایرانی تھیں۔ اُردُو ٹوٹی پھوٹی اس لیے بولتے تھے کہ دو تین سال کراچی میں ایران ائیر کے دفتر میں کسی معمولی خدمت پر رہ چکے تھے۔

یہاں رہ کے یہ تجربہ ہوا کہ اگر کوئی تُو کون مَیں خواہ مخواہ قسم کا آدمی بیچ میں ٹپک پڑے اور کسی کی سفارش کرے تو بالعموم وہ آنے والی رقم میں حصّہ دار ہوتا ہے۔ شہر بہت نزدیک تھا۔ ہم نے کہا۔ "ایرج میاں کتنے پیسے اس کو دیں؟"

بولے۔ "پانچ تومان دے دو۔"

بعد ازاں معلوم ہوا کہ شیر از میں شہر کے اِس سرے سے اُس سِرے تک کہیں چلے

جاؤ فقط پانچ ریال دینے ہوتے ہیں جو پانچ تومان کا دسواں حصّہ ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ دو تومان دینے چاہیے تھے۔ بہر حال اسے ہم نے ایرج کی محنت کا جائز معاوضہ سمجھا۔

ٹرمینس پر ایک منحنی سا کلرک بیٹھا تھا جو کُچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ پاس ہی میکڈویل ایجنسی تھی۔ شیر از اور اِصفہان میں (اور جگہ بھی ہو گا) یہی ایجنسی ٹورسٹ بیورو کا کام بھی کرتی ہے اور ہواپیمائی ایران کے ٹکٹ دینے کا بھی۔ ان سے ہوٹل کی بات کرتے کرتے معلوم ہوا کہ اگر شب بھر قیام کرنے کے بجائے ابھی سے ٹیکسی لے کر آغاز کر دیں تو تمام مُقام دیکھے جاسکتے ہیں۔ مسجد وکیل، حافظ و سعدی کے مزار، دروازہ قرآن وغیرہ تو شہر ہی میں ہیں۔ میوزیم بند ہے۔ سوال فقط تختِ جمشید کا رہ جاتا ہے جو ساٹھ ستّر میل کی مسافت ہے۔ میکڈویل ایجنسی والوں نے کرایے کا لمبا چوڑا حساب بتایا جو امریکنوں کے حساب سے ٹھیک ہی ہو گا۔ پھر وہ اصرار کر رہے تھے کہ پہلے تختِ جمشید جاؤ، شہر میں کیا دھرا ہے۔ اِدھر اپنا دِل تھا کہ حافظ اور سعدی میں لٹکا تھا۔ لہٰذا ہم نے ٹیکسی لی اور سیدھے مزارِ حافظ کا راستہ لیا کہ وہی پہلے پڑتا تھا۔

حافظ کے احاطے میں دیکھا کہ جابجا لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہیں، اور ایک کونے میں

کوئی شخص ٹیپ ریکارڈر لئے کوئی پروگرام ریکارڈ کر رہا ہے۔ اُونچی کرسی پر مزار ہے لیکن مزار کے گرد کوئی جالی یا پردہ نہیں کہ اندر اطمینان سے بیٹھ کے کوئی فاتحہ پڑھ سکے۔ کہتے ہیں یہاں فال کے لئے۔۔۔ دیوان کا ایک نسخہ رکھا رہتا ہے۔ ہمیں نظر نہ آیا۔ لڑکے لڑکیاں تفریح کے موڈ میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے دُور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ٹیکسی والے سے کہا "چلو اب سعدی کے مقبرے۔"

مزارِ شیخ کے احاطے کے پھاٹک پر ہی یہ شعر رقم تھا۔ ؏

زخاک سعدی شیر از بوئے عشق آید

ہزار سال پس از مرگ اُو اگر بویم

احاطے کے اندر داخل ہوتے ہی طبیعت ایک عجیب سرور سے آشنا ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ ذرّہ ذرّہ امن کشاں ہے۔ مقبرہ نہایت سادہ ہے اور ایک کاریڈور کے سِرے پر بہت مختصر سا گُنبد ہے جس کے چار طرف جالیاں اندر مزار ہے۔ بہت سی عورتیں مزار کو بوسہ دے رہی تھیں۔ معلوم ہوا منّتیں بھی مانی جاتی ہیں۔ ایک طرف خدمت گار کھڑا تھا، اور کسی عقیدت مند خوش نویس کی لکھی ہوئی گلستان کی ایک حکایت اور بوستان کی ایک نظم دیوار پر آویزاں تھی۔

جب مزار سے عورتیں رُخصت ہو گئیں، ہم فاتحہ کے لئے بڑھے لیکن جانے کیا ہوا معاً جی بھر آیا اور ہم نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ جتنا ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے سیلاب اور اُمڈ تا تھا۔ فاتحہ بہت طویل ہو گئی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ محافظ ہماری یہ کیفیّت دیکھے۔ جانے کتنے عالم آنکھوں کے آگے آئے۔ وہ دِن جب ہم نے اپنے گاؤں میں گلستان کے درس کا آغاز کیا۔ ہمیں یاد ہے کہ درباب شاہاں سے ہمارا درس شروع ہوا تھا اور ”زندست نام فرخ نوشیر واں“ والی حکایت پہلی تھی۔ پھر ”قافلہ دزدان بر سر کوہے نشستہ بودند“ یاد آئی۔ ہم نے سعدی کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دوست سمجھا اور شاید یہ داخلی رفاقت اور دوستی تھی جس سے یہ حال ہوا۔۔ بار بار خیال آتا تھا یہی نواح ہوں گے جن میں ہمارا شیخ سیر کرتا تھا، گھومتا پھرتا تھا، اور پھر لوگ یہاں اس کا جنازہ لائے ہوں گے۔ یہ وہی سعدی ہے، یہ وہی شیر از ہے۔ یعنی وہی پنہائی ہے جس سے بچپن سے غائبانہ آشنائی ہے۔ یقین نہ آتا تھا۔

مقبرہ سعدی شیخ کے مزار سے رُخصت ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُٹھتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ حافظ کے مزار پر قطعاً یہ کیفیّت نہ تھی۔ وہاں ہم خالی گئے خالی آئے۔
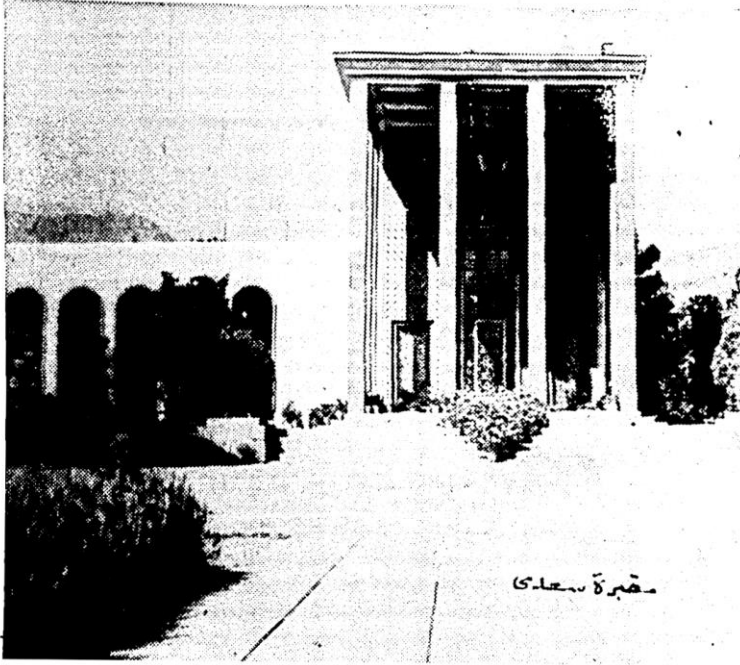
یادگار کے لئے ہم نے کیاریوں پر نظر ڈالی۔ صاحبِ گلستان کے چمن میں گلاب کا کوئی پھول اس وقت نظر نہ آیا۔ ناچار گلِ صد برگ کا ایک غنچۂ نَو شگفتہ لیا اور جیب میں رکھ لیا۔ شیخ کی یہ یادگار ایک متاعِ عزیز کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

اگلی منزل تھی۔۔۔ مسجد وکیل

نادر شاہ کے قتل کے بعد شیراز میں کریم خان زند کی حکومت رہی جو اپنی نیک نفسی اور رعایا دوستی کے لئے مشہور تھا۔ اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے سے انکار کیا

تھااور خود کو وکیل الرعایاہی کہا۔ اس کے عہد میں شیراز کے بھاگ کھُلے اور یہ مسجد بھی اسی کی یادگار ہے جس کی ٹائلیں بہت خوبصورت ہیں۔ ساتھ ہی مشہور بازار وکیل ہے۔

وہاں سے ٹیکسی لی اور دروازہ قرآن دیکھا۔ ایک زمانے میں شیراز کے گرد فصیل اور دروازے تھے، جن میں فقط یہی باقی ہے۔ اس کا نام قرآن دروازہ اس لئے ہے کہ اس کے اوپر برکت کے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھا رہتا تھا جو اب تہران کے عجائب گھر میں ہے۔ اصفہان اور تختِ جمشید سے آنے والی شاہراہ اِسی دروازے کے نیچے سے گزرتی ہے۔

دروازہ قرآن شیراز
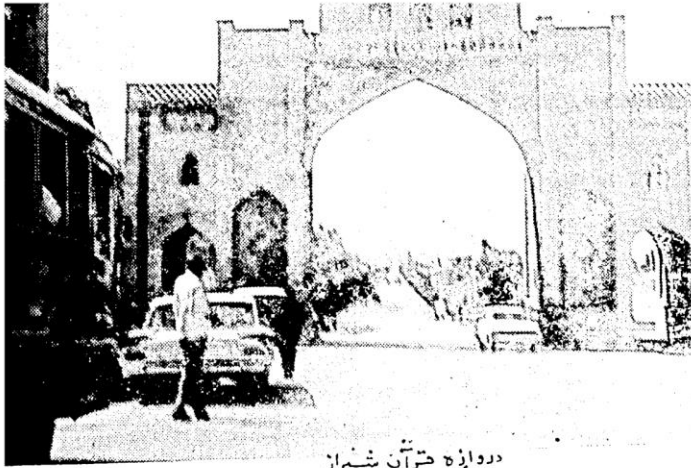
ابھی شاید بارہ کا عمل تھا اور تخت جمشید باقی تھا۔ اصفہان کا جہاز چار بجے اُڑ جاتا تھا اور ساڑھے تین بجے تک واپس ہوائی اڈّے پر پہنچنا ضروری تھا۔ ہم نے ایک سالم ٹیکسی روکی۔ اس نے پندرہ تومان کہے، ہم نے دس۔ آخر بارہ طے ہو گئے۔

ڈرائیور کا نام منصور تھا، اور اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ اس کے ہم نام منصور کے دعویٰ انا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا، کیونکہ اصل میں اسے صرف ایک لفظ آتا تھا Yes۔ اور اسے وہ مسلسل اور متواتر استعمال کرنے پر مُصِر تھا۔ ہم فارسی میں لمبی چوڑی گفتگو کرتے تھے اور وہ Yes کہہ کر فارغ ہو جاتا تھا۔ گفتگو کم و بیش یوں ہو رہی تھی۔

سوال: (فارسی میں) میاں منصور تم شیراز کے رہنے والے ہو یا باہر کے؟

جواب: Yes

سوال: یہاں سے اصفہان کے کوس پرہے؟

جواب: Yes

سوال: ہمارا جہاز ساڑھے تین بجے روانہ ہوتا ہے یا چار بجے؟

جواب:Yes

آخر ہم نے نہایت عاجزی سے کہا کہ ہم انگریزی نہیں سمجھتے۔ فارسی میں گفتگو کرو۔

بہرحال انگریزی کیسی بھی ہو۔ ٹیکسی منصور کی اچھّی تھی اور خوب چلتی تھی۔ شیراز کے نواحات میں پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں اور چڑھائیاں اور اُترائیاں بہت ہیں۔ ٹریفک بہت کم۔ رستے میں ہم نے پوچھا افسوس رُکناباد نہیں دیکھا نہ مصلّے کی زیارت ہوئی۔ اس وقت ہم ایک نالے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ منصور نے کہا آقا۔ یہی رُکناباد ہے۔ یہ ایک سوکھا نالہ تھا، حافظ صاحب یہیں سیر کر کے خوش ہو جاتے ہوں گے۔ ''مصلیٰ تو خوب جگہ ہو گی'' ہم نے کہا۔ بولے۔ یہ جگہ مصلیٰ ہی تو ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ گلگشت کا کیا سوال تھا، خاک اُڑتی تھی۔ لیکن منصور نے کہا بہار کے موسم میں آیئے اور سبزے کی بہار دیکھیے۔ یہ موسم شیراز دیکھنے کا نہیں ہے۔

گھاٹیاں آتی تھیں گزر جاتی تھیں۔ ہر بار یہ خیال ہوتا تھا اب تختِ جمشید آیا کہ آیا۔ لیکن وہ دور تَر ہوتا جاتا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا گاؤں آیا، پھر وہی ویران پُر پیچ نشیب و فراز۔ آخر پچپن ساٹھ میل جانے کے بعد اُفق پر دارا کے محل کے میناروں

کی تحریر نظر آئی۔۔۔

آخر آ گیا نہ تخت جمشید۔

ابنِ بطوطہ لکھتا ہے

شیر از کی آبادی بہت پُرانی ہے۔ باغات آب و تاب کے اور نہریں بڑی موج زن ہیں۔ بازار نہایت اعلیٰ۔ جس پیشہ والے ایک بازار میں ہیں دوسرے میں نہیں۔ باشندے نہایت خوبصورت اور خوش پوشاک۔

شہر کے اندر پانچ نہریں ہو کر نکلی ہیں۔ ایک نہر کا نام رُکنا باد ہے جس کا پانی نہایت شیریں، گرمیوں میں نہایت ٹھنڈا سردیوں میں گرم۔

سب سے بڑی مسجد، مسجد عتیق ہے۔ اس کے شمال کے دروازے باب حسن سے پھل پھلاری بازار کو رستہ جاتا ہے۔ یہ نہایت عجیب ہے۔

عورتیں سب موزے پہنتی ہیں اور اس طرح اوڑھ لپیٹ کر اور برقع پہن کر نکلتی ہیں کہ ان کے جسم کا کوئی حصّہ کھُلا نہیں رہتا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں گرمی سے بچاؤ کے لئے پنکھا ہوتا ہے۔ میں نے عورتوں کا کسی شہر میں ایسا مجمع نہیں دیکھا۔

شیخ سعدی کی خانقاہ نہر رکناباد کے کنارے ہے اور اس میں نہایت اعلیٰ باغ ہے۔ شیخ نے سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے حوض کپڑے دھونے والوں کے لئے بنوادیئے تھے۔ لوگ زیارت کو آتے ہیں۔ خانقاہ کے دستر خوان پر کھانا کھاتے ہیں اور اس نہر میں کپڑے دھوتے ہیں۔

(ابنِ بطوطہ شیخ سعدی کی وفات کے تیس پینتیس برس کے اندر شیر از جاتا ہے حافظ کازمانہ اس کے نصف صدی بعد کازمانہ ہے۔)
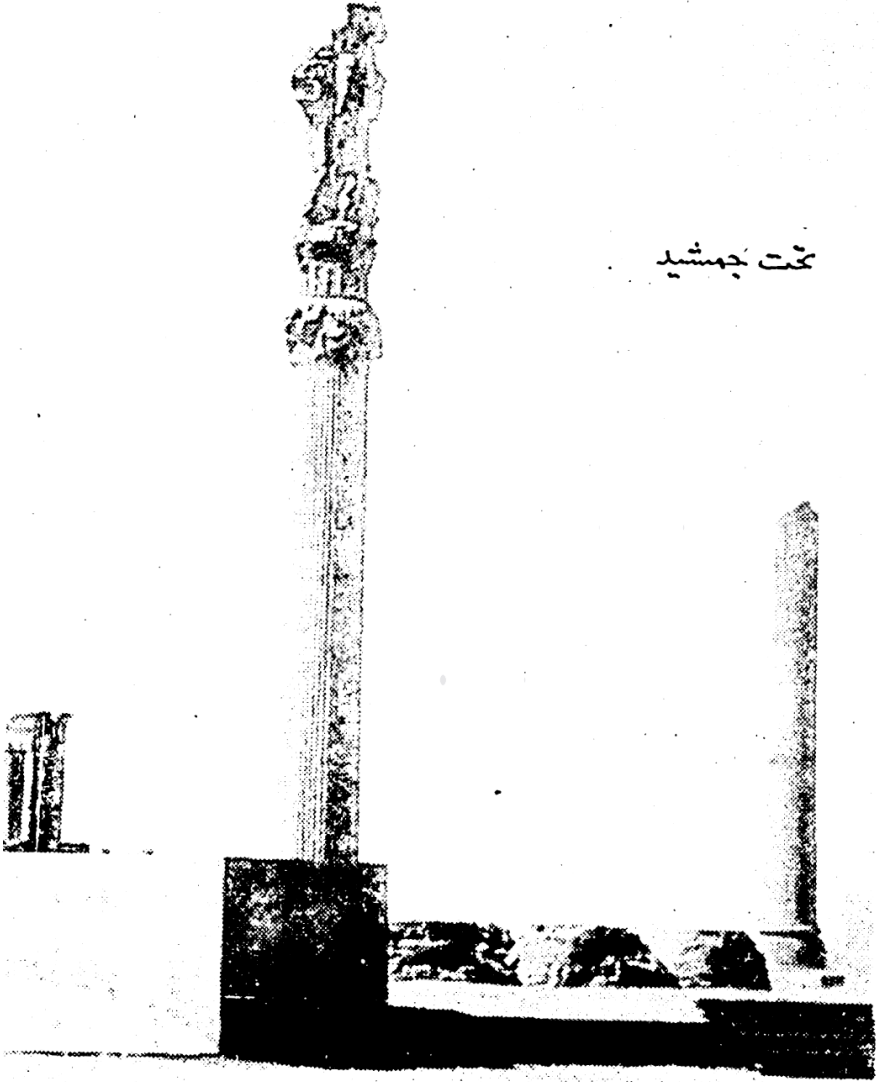
تخت جمشید

تختِ جمشید کے خرابوں میں

ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور دھوپ خاصی تیز ہو گئی ہے۔ دارائے اعظم کا شہر غدار سامنے ہے۔ حدِّ نظر تک محلوں کے خرابے اور ستونوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے یہیں تیسرے دارا اور اسکندرِ اعظم کی فوجوں کا یُدھ ہوا تھا اور دارا زخمی ہو کر اسی جگہ کھیت رہا تھا جہاں اب پیپسی کولا کا اسٹال ہے۔ پیپسی تو ایک طرف اس وقت اس غریب کے منہ میں کوئی پانی چوانے والا بھی نہ تھا۔ یہ جو امریکی ایمبولینس یہاں کھڑی ہے بہت بعد میں پہنچی اور شیراز کا مشہور نمازی ہسپتال بھی

کوئی ڈھائی ہزار سال دیر سے بنا۔

دارا سے بھی ہماری ملاقات پرانی ہے۔ اس زمانہ میں ہم اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ اسکندر اعظم کے ہاتھوں دارا کی شکست اور تباہی کا حال پڑھ کر چنداں افسوس نہ ہوا تھا، کیونکہ اسکندر اعظم کو ہم مسلمان سمجھتے تھے... اسکندر اعظم پر ہی کیا موقوف ہے، جتنے ناموں میں ف، ق، غ، ظ وغیرہ آئیں وہ ہندو تو بہرحال نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً فیلقوس، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث، سقراط، بقراط۔ اور ان دنوں ہمارے نزدیک قومیں فقط دو تھیں، ہندو اور مسلمان۔ سر سکندر حیات خاں ان دونوں ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم تھے اور اسکندر اعظم اور سکندر وزیر اعظم میں کوئی ایسا لمبا چوڑا فرق نہیں بلکہ ہمیں افسوس ہوتا تھا کہ اسکندر دریائے بیاس کے مغربی کنارے سے کیوں لوٹ گیا۔ ہمارا گاؤں بیاس کے مشرق میں کوئی زیادہ دور تھوڑی تھا۔ ''اے آمدنت باعث آبادی ما۔''

تختِ جمشید سو یہ ہے تختِ جمشید جسے یورپ والے پرسی پولس کہتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ عرصہ پہلے فارس والوں نے یونان پر حملہ کر کے ایتھنز کے قلعہ نما شہر اکری پولس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ جواباً اسکندر اعظم نے پرسی پولسی کا تیاپانچا کر دیا تھا۔ لیکن اس کو بھی یونان زندہ واپس پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ خیر دارا اور اسکندر

دونوں کا انجام بخیر ہوا اور تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ اکری پولس اور پرسی پولس دونوں کے دیوان خانوں اور زنان خانوں میں ٹورسٹ لوگ جوتوں سمیت، کیمروں اور ٹریولر چیکوں سے مسلح دندناتے پھرتے ہیں۔

یہ جو چٹانوں کا سلسلہ تخت جمشید کے پس منظر میں نظر آتا ہے، کوہِ رحمت کہلاتا ہے۔ تخت جمشید کو تخت جمشید کیوں کہتے ہیں؟ کوہ رحمت میں رحمت کی کیا بات ہے؟ اور وہ جو ہم نقش رستم دیکھنے جائیں گے اس سے رستم کا کیا تعلق ہے؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہیں کہیں تخت جمشید سے سو سال پہلے سیر دس اعظم کا بنا کردہ شہر پازر گاد تھا اور انہی نواحات میں اصطخر کی آبادی تھی۔ اصطخر تو عہد اسلام میں کئی صدیوں تک مشہور رہا۔ اب یہ تینوں شہر محض خرابے ہیں۔ ع

یہ شہر کھا گئی کس کی نظر، کسے معلوم

اچھا تو میاں منصور تم اپنی ٹیکسی یہیں پارک کرو، اور آقائے دوکاندار ذرا ایک پیپسی کھولنا۔ میاں منصور تم بھی پیو یہاں کوئی گھنٹہ بھر ٹھہرنا ہو گا۔ بلیطہ؟ اچھا صاحب آپ بھی دس ریال لیجیے اور ٹکٹ عنایت فرمایئے۔ خیلے ممنونم، خیلے ممنونم۔

کھنڈرات کی کرسی زمین سے کوئی تیس چالیس فٹ اونچی ہے اور اس پر چڑھنے کے

لئے چوڑی سیڑھیوں کا سلسلہ ہے۔ ان سیڑھیوں پر گھوڑے مع سواروں کے ٹاپیں مارتے چڑھتے تھے۔ لیجیے اب مسطح میدان ہے۔ بہت سے محلوں میں تو میناروں کے فقط ٹھنٹھ باقی ہیں، لیکن بعض منارے اب بھی آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ دیواریں کئی کئی فٹ تک قائم ہیں اور دروازے تو اکثر جگہ ڈھائی ہزار سال سے یونہی کھڑے ہیں اور انکی نقّاشیوں کا جلال قائم ہے۔ کہیں شیروں کے مجسمے ہیں، کہیں بیلوں کے بت۔ یہاں حمام تھا، یہاں دیوان خاص تھا۔ اب آپ دھوپ کی پروانہ کرتے ہوئے چلتے چلیے، محلوں کی وسعت سے نہ گھبرایئے، آخر بنانے والے اپنے زمانے کے جہاں پناہ تھے۔ اس زمانے میں آپ کو کون یہاں گھسنے دیتا؟ وہ تو وہ ان سیاحوں کی ہڈیاں بھی گل گئیں جنہوں نے اپنے ناموں کو دوام عطا کرنے کیلیئے انہیں مختلف دروازوں اور محرابوں پر ٹھیکریوں سے کندہ کر دیا ہے۔ کوئی کتبہ جرمن میں ہے کوئی فرنچ میں۔ ایک ۱۸۹۶ء کا ہے ''نیویارک ٹائمز'' کے نامہ نگار کا۔ ایک کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے۔ ایک ۱۸۳۶ء کا بھی۔ صحنوں، صنچیوں، ایوانوں میں سے گزرتے ہوئے ایک میوزیم میں پہنچتے ہیں۔ چھوٹا سا میوزیم ہے کیونکہ یہاں کے آثار کچھ طہران کے موزہ ایران پاستان میں چلے گئے، کچھ اپنے آبا کی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔ تختِ جمشید کے میوزیم میں زیادہ تر چھوٹے بڑے مٹکے

مٹکیاں ہیں، جلی ہوئی لکڑی کے کچھ ٹکڑے بھی کیونکہ آخر سارا محل آگ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

تختِ جمشید میں سب سے رفیع الشان محل تو دارا کا ہے۔ دوسرے نمبر پر اس کے جانشین خرخشاس اوّل کا صد ستوں محل۔ اس کا نام اپادانا ہے جس کو داریوش (دارا) اوّل نے شروع کیا اور اس کے بیٹے نے مکمل کیا۔ یاد رہے کہ اسکندر سے لڑتے ہوئے جو شہنشاہ مارا گیا وہ دارا نام کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اسی طرح کئی بہرام ہوئے ہیں اور کئی خرخشاس۔ اپادانا کے تیرہ ستون ابھی باقی ہیں اور محل کے مشرقی زینے پر شاہ معظم کی خدمت میں ۲۸ قوموں کے لوگوں کو نذریں لاتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے پہلو میں دارا کا پرائیویٹ محل ہے جو تکارا کہلاتا ہے اور اس کے دروازے پر شاہ کے ایک عفریت سے لڑنے اور اس کے سر میں تلوار بھونکنے کی تصویر مرتسم ہے۔ بادشاہ کی داڑھی اور کپڑوں میں جواہر ٹکے تھے، اب فقط سوراخ باقی ہیں۔ اس طرح ایک نجی محل خرخشاس اوّل کا بھی، پھر ایک ملکہ کا محل جس میں خدام اور لونڈیوں کے لئے حجرے ہیں، جو عمارت میوزیم کی ہے وہ پہلے استقبال گاہ تھی۔

نقشِ رستم تختِ جمشید سے چار چھ میل آگے ہے۔ ہم نے جی میں سوچ لیا تھا کہ وہاں جانے کے دو چار تومان ڈرائیور کو اور دے دیں گے۔ ہم نے کہا۔ "میاں منصور چلو،

نقش تو سڑک پر ہی سے نظر آ جاتے ہیں۔ باقی رہے دیوار میں بنے ہوئے حجروں میں تابوت، ان کے دیکھنے میں پانچ دس منٹ لگیں گے۔“ ان حجروں کے دہانے سڑک سے کوئی سو منٹ سے زیادہ اونچائی پر ہوں گے۔ پرانی تحریروں کے مطابق وہاں تک رسوں سے چڑھتے تھے۔ تابوت بھی یونہی کھینچے گئے تھے۔ اب ایک تنگ گول زینہ لوہے کا لگا دیا گیا ہے۔ نیچے اوپر بہت سے بچے جمع تھے۔ ان کی طبیعت خوش طبعی پر مائل ہوئی تو انہوں نے چھیڑ کرنی شروع کر دی۔ بعض کے قمیض شلوار سے ہمیں شبہ ہوا اور ہم نے پوچھا کیا تم لوگ پاکستانی یا ہندوستانی ہو؟ معلوم ہوا نہیں خراسان اور مازندران کے ہیں۔ ان مقبروں اور تابوتوں کا حصّہ بہت تنگ و تاریک ہے۔ پہاڑ کو اندر سے کھود کر بنایا گیا ہے۔ باہر سڑک کے رخ کی تصویریں اور کتبے ساسانی بادشاہ اردشیر کے ہیں، یعنی تیسری صدی عیسوی کے۔ ایک جگہ بہرام دربار لگائے ہوئے ہے۔ ان تابوتوں میں ایک تو داریوش اوّل کا بیان کیا جاتا ہے، دوسروں کے متعلق قیاسات اور اختلافات ہیں۔ لیجیے صاحب جو شہر صدیوں میں بسے اور اسکندر کو آکر ڈھانے پڑے، ہم نے ڈھائی گھنٹے میں دیکھ لئے۔ اب پھر ہم تھے اور شیراز کی سڑک جس پر منصور کی ٹیکسی ساٹھ میل کی رفتار سے فراٹے بھرتی جارہی تھی۔ ہم نے اپنے جی ہی جی میں حساب جوڑا۔ بارہ تومان تختِ جمشید تک

اور جیسا کہ رستے میں طے ہو گیا تھا، دس تومان واپسی کے کل ۲۲۔ نقش رستم تک جانے کے دو تین چار پانچ سمجھ لیجیے۔ شہر سے ہوائی اڈہ دور نہیں۔ دو تین اس کے بھی۔ گویا تیس تومان۔ چلئے منصور بھی خوش ہو جائیگا لیکن۔

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

تخت جمشید سے واپسی پر شیراز کی سڑک پر فراٹے بھرتے ہوئے حافظ و سعدی کے ذکرِ لطیف میں بات سے بات نکالتے ہوئے منصور نے کہا۔ ”آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے؟“

ہم نے کہا۔ ”برادر ربجان برابر، کوئی بے اعتباری ہے کیا؟ تمہیں خوش کر دیں گے؟“

بولے۔ ”نہیں۔ یہ بات نہیں۔ یہ ٹیکسی ہی آپ کی ہے۔ آئندہ جب کبھی جناب عالی شیراز تشریف لائیں تو اس خانہ زاد منصور کو یاد رکھیں۔ اس ناچیز کے ہوتے کسی اور سے آپ خدمت لیں گے تو میرا دل توڑیں گے۔“

ہم نے کہا۔ ”واہ یہ کبھی ہو سکتا ہے؟“

دروازہ قرآن سے گزر کر ہم نے کہا۔ ”ابھی خاصا وقت ہے، ذرا شہر کے اندر لے لو، کسی سرسبز خیابان سے ہو کر چلیں۔ اب تک تو اُجاڑ راہوں میں سے گزرے ہیں۔“
بولے۔ ”آپ نے خیابان کریم خاں زند تو دیکھی؟“

ہم نے کہا۔ ”وہ تو صدر بازار ہے۔ وہ تو دیکھا۔“

بولے۔ ”بس ویسی ہی اور سڑکیں سمجھیے۔“

معلوم ہوتا تھا کہ ان کو ہوائی اڈے پر پہنچنے کی جلدی ہم سے زیادہ ہے۔ ائیرپورٹ پر پہنچ کر ہم نے بائیس یا پچیس کے بجائے جو ان کا حق ہوتا تھا۔ تیس تومان منصور صاحب کی مٹھی میں دے دیئے۔

بولے۔ ”یہ کیا۔ یہ تیس ہیں۔ اتنے تو میں نہیں لوں گا۔“

ہم نے کہا۔ ”لے لو، لے لو۔ ہم کوئی بطور بخشش یا انعام تھوڑا ہی زیادہ دے رہے ہیں۔ ان پانچ تومان کو ہمارا دوستانہ نذرانہ سمجھ کر قبول کرو، تکلّف نہیں کیا کرتے۔“

لیکن منصور صاحب ناک بھوں چڑھا کر بولے۔ ”جناب پینتیس سے ایک تومان کم نہ لوں گا۔“

''پینتیس؟ وہ کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔ ۱۰ + ۱۲ تو ۲۲ بنے۔ تھوڑا اوپر لگا لو ۲۵ ہو گئے۔ چلو ۲۷ سہی۔ لیکن ۳۵ کیسے؟

بہت سی فارسی بول کر فرمایا۔ ''حساب کو چھوڑیئے۔ پینتیس ہی ہوتے ہیں۔''

ہم ٹیکسی سے نکل چکے تھے لیکن وہ بھلا مانس جو تھوڑی دیر پہلے خانہ زاد بنتا تھا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ''جناب پینتیس دیجیے پینتیس۔''

اب ہوائی اڈے کے حمال اور دوسرے بے فکرے تماشائی آن جمع ہوئے۔ ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے۔ منصور ہم سے اچھی اور تیز فارسی بولتا تھا۔ ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔ پس ہم نے کہا۔ ''لو میاں ۳۵ تومان۔ قربانت شوم۔ تم تو کہتے تھے ٹیکسی آپ کی ہے۔''

منصور نے نہ ہمارے سلام کا جواب دیا نہ کوئی اور بات کی۔ ٹیکسی لے یہ جا وہ جا۔
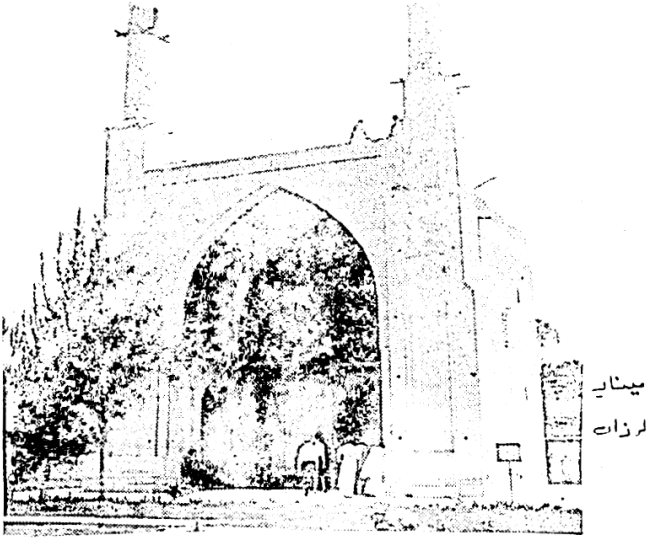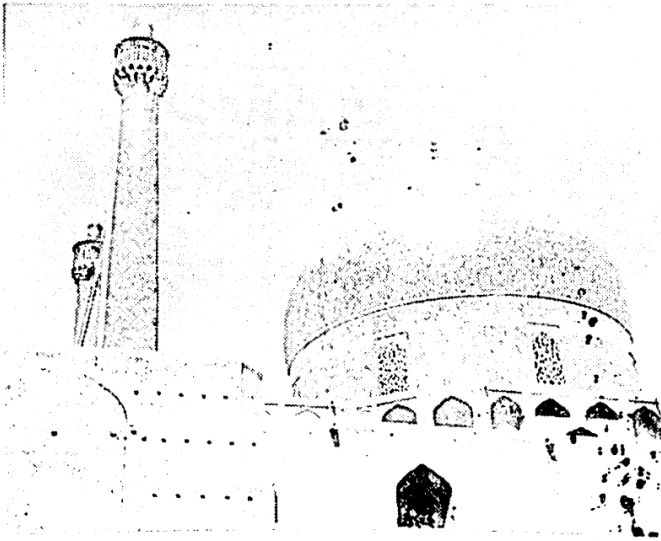
مسجد شاہ کا گنبد

اصفہان و اصفہانیات

جہاز پیچھے سے ہی ایک گھنٹہ لیٹ آیا تھا، لہٰذا اصفہان پہنچتے پہنچتے خاصا جھٹ پٹا ہو گیا تھا اور سردی بھی یہاں شیراز سے بہت زیادہ تھی۔ زیادہ بھی ایسی کہ ہڈّیوں میں گھر کرنے لگی۔ ہوائی اڈّے پر ہی میکڈویل ایجنسی والوں سے پوچھا کہ آپ کسی ہوٹل میں جگہ دِلا سکتے ہیں؟

بولے۔ ''شہر میں بے شمار ہوٹل ہیں دیکھ لیجیے گا۔''

ٹیکسی والے سے کہا۔ "میاں چلو شہر کسی ہوٹل میں پہنچاؤ۔"

یہ شہر کی بڑی سڑک خیابان چہار باغ کے دورویہ ہوٹل تھے لیکن زیادہ تر ایسے جیسے صدر کے علاقے میں درمیانے اور دوسرے درجے کے ہوٹل ہیں۔ ایک جگہ ٹیکسی روک کر پوچھا۔ بولے، ہمارے ہاں جگہ نہیں۔ دوسری جگہ پہنچتے ہی ایک بیرے نے منہ کو عجب بدتمیزی سے گرما کر کہا۔ "نو۔"

ہم نے پھر کُچھ کہا۔

جواب ملا۔ "نو۔"

گویا یہ شخص منصور کا جواب تھا۔ اسے یس کے علاوہ کچھ نہ آتا تھا، یہ نو سے آگے نہیں جانتے۔ ہم نے کہا، بھلے مانس اگر جگہ نہیں تو زبردستی تھوڑی ہے۔ جواب تو ذرا تمیز سے دو۔

بہت ہی نیک نہاد آدمی نکلا۔ ایک لفظ اور بولا۔ "سوری۔" تین چار جگہ بھٹکنے کے بعد ہم نے ڈرائیور سے کہا، میاں اب تم پھر میکڈویل ایجنسی کے شہر والے دفتر میں چلو۔

ایجنسی کے منیجر نے فون کر کے پوچھا اور بتایا۔ ”ایران تور میں ایک کمرہ ہے تو لیکن صرف ایک رات کے لئے۔“

ایک تو تختِ جمشید کے کھنڈروں میں دِن بھر گھومنے کی خستگی، پھر سردی۔ سوائے آرام کے کسی شے کو جی نہ چاہا۔ یہ ہوٹل اعلیٰ درجے کا ہوٹل تھا اور زیادہ تر یہاں بھی یورپین بھرے تھے۔ ہوٹل کیا ہے بھول بھُلیّاں۔ کاریڈور میں سے کاریڈور نکلتی گئی ہے اور آخری سِرے پر اوپر ہمارا کمرہ تھا جس کا راستہ ہم کئی بار بھولے۔ اور کمرہ بھی کیا کوٹھی سی، اندر کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں کی مثال۔ بمشکل جسم سیدھا کرنے کی گنجائش تھی۔ لحاف وغیرہ بھی واجبی سا تھا۔ تہران میں کبھی ہیٹر استعمال کرنے کو جی نہ چاہا تھا۔ یہاں ہیٹر بھی لگایا بلکہ ایک سے کام نہ چلا تو دو۔

علی الصُبح اُٹھ ہاتھ منہ دھو، ہم نے ناشتہ کیا اور شہر اصفہان کا نقشہ ہاتھ میں لئے ٹہلتے ٹہلتے چل نکلے۔ اصفہان بنانے والوں نے ٹورسٹوں کی آسانی کے لئے تمام قابلِ دید مقامات کو ایک جگہ پر جمع کر دیا ہے۔ چار مشہور مقامات تو میدان شاہ کے (جسے میدان نقش جہان بھی کہتے ہیں) چاروں بازوؤں پر ہیں۔ اِدھر سے جائیے اور داہنے ہاتھ مڑیے تو وسط میں عالی قاپو۔ دوسرے بازو میں مسجد شاہ، تیسرے میں مسجد شیخ لطف اللہ اور چوتھی سمت میں مشہور پرانا بازار عالی قاپو کی پشت پر محل چھل ستون

ہے۔ جامع مسجد البتّہ ذرا دور پڑے گی اور مینارِ لرزاں اور زلفہ بھی شہر سے باہر ہیں۔ اب رہے اصفہان کے مشہور پُل تو ایک پر سے آپ ابھی آئے ہیں، ہوائی اڈّے کی سڑک اُسی پر سے گزرتی ہے اور دوسرا اس کے پہلو میں جاتے ہوئے دیکھ لیجیے گا۔ سو یہ ہے اصفہان نصف جہان، شاہ عباس صفوی کے زمانے میں جو اکبر کا ہم عصر تھا، اس شہر کی عظمت کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ سارے یورپ اور مشرق وسطیٰ میں اس کی ٹکّر کا کوئی شہر نہ تھا۔ اِس وقت آبادی پانچ لاکھ ہے۔ اُس وقت دس لاکھ تھی۔

لیکن یہاں دِلّی لاہور کا سا بھیڑ بھڑکا کہیں نہیں ہے۔ آبادی بہت چھدری ہے۔ حتّیٰ کہ بازار میں بھی جہاں کھوئے سے کھوا چھلنا چاہیے تھا، ٹانواں ٹانواں آدمی نظر آتا ہے۔ حاجی بابا کے زمانے کے ان اُونچے نیچے چھتے ہوئے کوچوں کو چھوڑ کر جِن میں ہم ابھی جائیں گے، باقی سڑکیں کھلی کھلی ہیں۔ مرکزی سڑک خیاباں چہار باغ اتنی کھلی ہے کہ بیچ میں درخت ہیں۔ دورویہ گاڑیوں کی گزرگاہ اور پھر فٹ پاتھ۔ کھلی کے علاوہ تکلے کی طرح سیدھی بھی۔ تھوڑی دور جا کر ایک عظیم محراب اور قلعہ نما عمارت نظر آئی۔ یہ مدرسہ چہار باغ تھا۔ ہمارے بہاولپور کی طرح جس کے ریلوے اسٹیشن پر بھی قبّے ہیں، اصفہان کی ہر پرانی عمارت پر سب سے پہلے مسجد ہی کا دھوکا

ہوتا ہے۔ خیر پرانے زمانے میں مسجد و مکتب الگ تھوڑا ہی ہوتے تھے۔ یہاں بھی بلیطہ لینا پڑا اور ایک گائیڈ بھی کہیں سے نمودار ہو گیا۔ بیچوں بیچ نہر سی ہے، چہار طرف حُجرے اور ان کے محاذی چار گنبد و محراب۔ بڑی لق و دق عمارت ہے۔ بڑی محراب کے طغرے بہت شاندار ہیں اور تاریخ ایک جگہ ۱۱۱۲ھ اور دوسری جگہ ۱۱۱۹ھ لکھی ہے۔ اس کے ایک حُجرے میں ایک بادشاہ قتل ہوا تھا، غالباً صفوی خاندان کا کوئی تاجدار۔۔ وہاں سے نکل پو قدمے چلتے شہر داری کی عمارت کے پاس سے مُڑتے اور چہل ستون کی عمارت کو بوجہ ناواقفیت راستے میں چھوڑتے میدان نقشِ جہاں میں آ نکلے۔ یہاں پہلے پولو کھیلا جاتا تھا لیکن اب پارک ہے۔ داہنے ہاتھ پر پہلی عمارت عالی قاپو نظر آئی۔ یہ ایک محل ہے، سات منزل۔ ۱۱۷ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ شاہ عباس اس میں راگ رنگ کا جلسہ بھی کرتے تھے لیکن اس کی بالکونی خاص اس انداز سے بنائی گئی تھی کہ میدان میں پولو کا تماشا دیکھا جا سکے۔ اندر سے عمارت خاصی سادہ ہے، وسعت بھی کچھ ایسی نہیں، زینے بھی تنگ، حجرے بھی تنگ، چھتیں بھی نیچی ہیں۔ کہتے ہیں یہیں سے چہل ستون کو راستہ نکل جاتا تھا لیکن بعد میں درمیانی راہ بند کر دی گئی۔ ایک حجرے میں بڑے نازک طاقچے بنے ہوئے ہیں۔ راگ رنگ کی محفل میں ارتعاش سے فائدہ اٹھانے کے

لئے۔ اب یہ کئی جگہ سے خستہ بھی ہو رہے ہیں۔ عالی قاپو کے دونوں طرف دُکانوں کے سلسلے ہیں لیکن گاہک اِکّا دُکّا ہی دیکھا۔ چند قدم پر مسجد شاہ ہے۔ واہ کیا عظیم الشّان محرابی دروازہ ہے۔ یہاں بھی اندر جانے کے لئے ٹکٹ لیجیے۔ اول تو جتنی بڑی مسجدیں دیکھیں اب ان میں نماز شاید ہی کوئی پڑھتا ہو گا۔ پڑھتا ہو گا تو شاید اسے بھی ٹکٹ لینا ہوتا ہو گا۔

اصفہان کی مسجد شاہ کے ایک طرف حُجروں کے بجائے لمبے تالار ہیں۔ ایک طرف چند خواتین کھڑی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اصفہان کی مسجد شاہ کا نقشہ عام مسجدوں سے مختلف ہے۔ یہاں قبلے کی محراب صدر دروازے کے محاذ میں واقع نہیں ہے۔ خیر ہم نے بھی ہاتھ پیچھے باندھ کبھی اس محراب کے طغروں کو دیکھا، کبھی اس محراب پر بہ اندازِ شائستہ نظر ڈالی۔ بغلی حُجروں اور تالاروں میں بھی جھانک لیے۔ ان کے اندر بھی باریک کام ہو رہا تھا۔ ایک جگہ ایک گائیڈ کچھ امریکنوں کو کوئی چیز دکھا رہا تھا ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ہم فارغ ہو کر نکلنے کو تھے کہ مرتضیٰ نکوئی مل گیا۔

مرتضیٰ نکوئی ایک سیدھا سادا لڑکا تھا، مُنحنی بیمار سا۔ کوئی سولہ سترہ برس کا سِن ہو گا۔ سلام کر کے بولا۔ ”آپ انگریزی جانتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ "ہاں تھوڑی تھوڑی۔"

بولا۔ "مجھے انگریزی بولنے کا شوق ہے۔ میں یہاں کے امریکن مدرسے میں پڑھتا ہوں۔ چھُٹّی کے روز یہاں آ جاتا ہوں۔ چونکہ امریکی اور دوسرے انگریزی داں یہاں ہوتے ہیں، ان سے باتیں کر کے بولنے کی مشق کرتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "بڑی اچھی بات ہے۔"

"انگریزی بولتے بولتے آپ کو شہر بھی دِکھادوں گا۔"

ہم نے کہا۔ "ازیں چہ بہتر۔"

بولا۔ "مسجدیں تو سب جگہ ایک سی ہوتی ہیں۔ بازار چلیں۔"

ہم نے کہا۔ "ترتیب وار چلیں گے، بازار کوئی بھاگا نہیں جاتا۔"

بولے۔ "بارہ بجے بند ہو جائے گا۔"

ہم نے کہا۔ "بارہ بجنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے اور اس مسجد میں ہمیں پانچ منٹ لگیں گے۔" مرتضیٰ نکوئی ہمیں اِدھر کھینچ رہا تھا، ہم اُدھر جا رہے تھے۔ آخر ہم نے کہا۔

"ہمیں کوئی خریداری نہیں کرنی، بازار سے ہمیں دِلچسپی نہیں، ہم تو مسجد لطف اللہ دیکھیں گے۔"

بولے۔ "خیر جلدی سے دیکھ لیجیے۔ بازار میں اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ اور بعض دُکاندار میرے واقف ہیں۔ مال عمدہ اور باکفایت دیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "دیدہ خواہد شد۔" مسجد شیخ لطف اللہ میں داخل ہو کر ہم نے کہا۔ "دو ٹکٹ دیجیے۔"

مرتضیٰ نکوئی نے کہا۔ "صرف ایک لیجیے۔ مُجھ سے یہ لوگ ٹکٹ نہیں مانگتے۔ روز کا آنے والا ہوں۔"

ٹکٹ والا بھی مُسکرایا۔ ہمارا بھی ماتھا ٹھنکا۔ یہ زنانہ مسجد تھی اور شیخ لطف اللہ جن کے نام پر بنی ہے، غالباً بیگمات شاہی کے اتالیق تھے۔ یہ ۱۶۰۲ء میں بننی شروع ہوئی اور ۱۶۱۸ء میں ختم ہوئی۔ (مسجد شاہ ۱۶۱۲ء میں بننی شروع ہوئی تھی اور اٹھّارہ سال میں مکمل ہوئی)۔ عباس صفوی کے اصفہان کو اکبر کا آگرہ یا شاہجہاں کی دِلّی سمجھیے کہ قدم قدم پر جلال و جمال نمایاں ہے۔

مسجد لطف اللہ میں واقعی پانچ دس منٹ سے زیادہ نہ لگے حالانکہ اندر کام اتنا باریک اور نفیس تھا کہ شاید کسی اور مسجد میں نہ ہو گا۔ اب پھر مرتضیٰ نکوئی نے بازار کی طرف کھینچنا شروع کیا، لیکن ہمیں ایک چھتا ہوا خستہ سا بازار نظر آیا۔ اس کے داہنی طرف تنگ اور پُرپیچ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مرتضیٰ نکوئی بولے، "آپ نے قالین بافی کا کارخانہ دیکھا؟"

ہم نے کہا۔ "کارخانوں سے ہمیں دلچسپی نہیں۔"

بولے۔ "ویسا مشینوں والا کارخانہ نہیں۔ بلکہ وہ جو چھوٹی لڑکیاں بنتی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "وہ دیکھیں گے۔" گلیوں اور گلیاروں میں گزرتے مرتضیٰ نے ایک دروازے پر جو کسی طرف سے کارخانہ معلوم نہ ہوتا تھا، دستک دی۔ ایک ادھیڑ خاتون نے دروازہ کھولا۔ عورتیں اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ اندر تنگ سا صحن تھا اور اس کے پہلو میں ذرا سا برآمدہ۔ اس میں ایک چوبی تخت تھا اور برآمدے کی محراب کے ساتھ قالین کا تانا تنا ہوا تھا۔ تین چار چھوٹی چھوٹی بچیاں اس میں بانا بُن رہی تھیں۔ گویا سارا کام ہاتھ کا کام تھا۔ ہم نے کہا۔ "یوں تو بہت دیر لگتی ہو گی؟"

اُن محترمہ نے فرمایا۔ "تین تین چار چار سال لگ جاتے ہیں۔ ایک قالین تو اٹھارہ

سال میں بنا گیا تھا۔"

ہم ایک مسقف گلی میں سے ہوتے ہوئے سیدھے بازار میں آ نکلے۔ بازار کا مطلب تہران یا اصفہان میں عام بازار نہیں بلکہ پرانا چھتا ہوا بازار ہے جس میں محرابی دروازوں کی دُکانیں ہوتی ہیں۔ تہران میں اسے بازارِ بزرگ کہتے ہیں، اصفہان میں فقط بازار۔

مرتضیٰ نکوئی ہمیں پکڑ کر بازار کی پہلی ہی دُکان پر لے گئے اور بولے۔ "یہ بڑی اچھی دُکان ہے۔ جو چیز آپ کو یہاں ملے گی سارے اصفہان میں نہیں ملے گی۔" اِدھر دکاندار بھی اہلاً و سہلاً کہتا اخلاق سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ ہمارا ماتھا پھر ٹھنکا۔

رہبر بھی ملا تو مرتضیٰ نکوئی

اب عالم یہ تھا کہ ہماراجی بازار کی سیر کو مچل رہا تھا اور آقائے مرتضیٰ نکوئی کو اصرار تھا کہ ہم خریداری کریں۔ ہم نے کہا۔ ”خیر پہلے ہم ذرا بازار کے اُس سِرے تک ہو آئیں، پھر جہاں سے اچھی چیز ملے گی لے لیں گے بشرطیکہ دام بھی مناسب ہوئے۔“

نکوئی صاحب بولے۔ ”بازار میں آگے کُچھ نہیں ہے، چند حلوائیوں اور ٹھٹھیروں کی

دُکانیں ہیں۔ سو آپ کو منقّش ظروف اور مٹھائی درکار ہوئی تو اس کی بھی اچھی دُکانیں مجھے معلوم ہیں۔ لیکن جہاں تک کپڑے اور قالینوں اور کشیدہ کاری کے نمونوں اور دوسری نازک چیزوں کا تعلّق ہے، اِس دُکان سے بہتر کہیں نہ ملیں گی۔ ورنہ مُجھے کیا پڑی تھی کہ آپ کو یہاں لاتا۔"

ہم نے کہا۔ "بھائی ہم بہ دِل و جان آپ کے ممنون ہیں لیکن وہ اس بازار کے سِرے پر جو شکستہ محراب دار عمارت ہے اسے ہم ضرور دیکھیں گے۔"

بولے۔ "اجی وہ تو ایک مسجد ہے۔ مسجد بھی کیا پرانے زمانے کا کھنڈر ہے۔ جس پر کچھ کتبے وتبے لکھے ہیں۔ اسے دیکھ کے کیا کیجیے گا۔"

ہم نے کہا۔ "بھائی، یہاں ہم آئے ہی ان کھنڈروں اور کتبوں کے لئے ہیں، ورنہ شیخ رحمت اللہ کی مسجد اور علی قاپو کے بجائے بانک ملی یا شہر داری (میونسپلٹی) کی شاندار عمارتیں کیوں نہ دیکھتے، اور یہاں بازار کا رُخ کیوں کرتے جبکہ تہران کی فروش گاہ فردوسی میں بھانت بھانت کی چیزوں کے انبار لگے ہیں۔ ہم تو پرانی چیزوں کی سوندھی خوشبو سُونگھنے آئے ہیں، کنکریٹ کے محل تہران اور کراچی میں بہت ہیں۔"

یہ سارا فلسفہ مرتضیٰ نکوئی کی سمجھ میں نہ آیا جس سے واقعی گمان ہوتا تھا کہ امریکن اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس نے بمشکل بیس تیس قدم آگے جانے کی اجازت دی اور ہم مرکزی چورستے کا موڑ مُڑنے کو تھے کہ اس نے آستین پکڑ کر کھینچ لیا۔ ”بس بس

آگے مت جائیے گا۔"

ہم نے کہا۔ "اچھا، اِس دُکان پر یہ بٹوہ خوب ہے۔ اِسے دیکھیں۔"

بولے۔ "یہ اُس دُکان پر بھی ہے اور یہاں سے کُچھ قدر سستا بھی ملے گا۔ مال بھی وہاں کا پائیدار ہے۔"

ہم نے کہا۔ "اچھا پھر وہیں چلیں۔"

دُکاندار نے فوراً لمبے چوڑے پلنگ پوش سامنے لا کر پھیلا دیے۔ ہم نے کہا۔ "ان کا ہدیہ؟"

بولے۔ "لاجواب چیز ہے۔ آپ سے پچاس تومان لے لیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "میں پندرہ تومان حاضر کر سکتا ہوں۔"

بولے۔ "واہ آغا۔ خوب داد دی۔ ذرا اس کی بوٹی تو دیکھیے کتنی عمدہ ہے۔ چالیس تومان میں قریب قریب مُفت ہے۔ ارے میرے منہ سے چالیس نکل گیا؟ خیر نکل گیا تو چالیس ہی سہی۔ باندھ دوں؟"

ہم نے کہا۔ ”نہیں جناب، ہمارے پاس اتنا زر نہیں ہے۔ پندرہ تومان بھی ہمارے منہ سے جلدی میں نکل گئے۔ یہ دیکھیے اِدھر دھاگے نکل رہے ہیں۔ بارہ تومان سے زیادہ نہیں دوں گا۔“

بولے۔ ”اچھا ہم آپ سے پینتیس لے لے گا۔“

ہم نے کہا۔ ”نمی باشد۔ یعنی گھر بیٹھو۔“

بولے۔ ”تیس“

ہم نے کہا۔ ”بارہ۔ وہ بھی تمہارا دل رکھنے کے لئے۔ ورنہ انصاف سے یہ چادر دس تومان کی ہوتی ہے۔“

بولے۔ ”تم نے پندرہ تومان قیمت تو لگائی تھی نا؟ اب دس پر آ گئے۔“

ہم نے کہا۔ ”ایک کی نہیں، دو کی لگائی تھی۔ خیر اسے ہٹایئے، ہمیں یہ درکار ہی نہیں۔ یہ میز پوش کتنے کا ہے؟“

اب دُکاندار بڑی سے بڑی چیز نکال کر دِکھاتا تھا۔ ہم چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اس نے ایک بڑا خوان پوش نکالا۔ ہم نے نظریں ادھر سے گھما کر ایک

چھ انچ مربع کا رومال پسند کیا جس پر شیخ سعدی بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ وہ تانبے کا ایک بڑا طشت اُٹھا کے لایا۔ ہم نے ایش ٹرے پسند کی۔ اس نے ایک قالین پھیلایا، ہم نے ایک چھوٹا سا بٹوا اُٹھایا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم نے دس دس آنے والے آٹھ رومال خرید ہی لئے۔ یہی نہیں بلکہ ایک جُزدان نما کپڑے کا بیگ بھی لے لیا۔ پانچ چھ روپے کا ایک لیڈیز ہینڈ بیگ بھی چھپے ہوئے حنائی کپڑے کا اتنے میں مل گیا جس پر فردوسی کی تصویر تھی۔ مرحوم کی شکل بالکل مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملتی تھی۔

مرتضیٰ نے کہا۔ "اب کُچھ مٹھائی ضرور لے لو، اصفہان کا تحفہ ہے، اے لو یہ حلوائی ہماری پہچان کا ہے، میاں ان صاحب کو ذرا دو تین کیلو گز تو دے دینا۔"

ہم نے کہا۔ "گز کیا؟"

ایک قند کی بھیلی اُٹھا کر دکھائی۔ "یہ گز کہلاتی ہے۔ مزے کی چیز ہے۔"

ہم نے کہا۔ "ہم مٹھائی نہیں کھاتے۔ دانت خراب ہوتے ہیں۔"

بولے۔ "نہیں ہوتے۔"

ہم نے کہا۔ ”ہوتے ہیں۔“

بولے۔ ”ہماری یادگار کے طور پر لے جایئے۔“

ہم نے کہا۔ ”نا صاحب۔ یہ گز ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے ہاں تو جاڑے کی میوہ گزک ہوتی ہے، جسے ہم گجک کہتے ہیں۔“

بولے۔ ”تو پھر یہ لے لو۔“ اشارہ کچھ لڈّو نما مٹھائی کی طرف تھا۔

ہم نے کہا۔ ”نہ آغا۔ ہمیں اس مٹھائی سے معاف رکھو۔“

اتنے میں ہمیں ایک دُکان پر سلیپر نظر آئے۔ یوں تو ہم کراچی میں لوگوں سے کیا کیا نہ لانے کے وعدے کرکے آئے تھے۔ ریڈیو، سنگر مشین، ریفریجریٹر، زعفران، زیرہ وغیرہ۔ لیکن جس نے بہت کسرِ نفسی سے کام لیا اس نے بھی سلیپر لانے کی فرمائش ضرور کی تھی۔

سامنے ایک دُکان پر بیسیوں سلیپر رکھے نظر آئے۔ یہ ایک خاص طرح کے زنانہ جوتے ہوتے ہیں جن پر رنگ برنگی مخمل سی منڈھی ہوتی ہے۔ دکاندار نے کہا۔ ”جناب پندرہ پندرہ تومان کا مال آپ کی آمد کی خوشی میں دس دس تومان کا لگا دیا ہے۔

بالکل مُفت ہے کیونکہ دُکان کا دیوالہ نکالنا مقصود ہے۔ کتنے جوڑے دے دوں؟ پندرہ یا بیس؟" ہم نے کہا۔ "ایک جوڑا کافی ہو گا۔ اگر سات تومان پسند ہوں تو زہے عزوشرف۔"

بولے۔ "ہاں پسند ہیں۔ جلدی نکالیے۔"

بازار کو سلام کر کے باہر نکلے۔ ہم نے مرتضیٰ نکوئی سے پوچھا۔ "اب؟ ابھی ہمیں چہل ستون بھی دیکھنا ہے اور جامع مسجد بھی۔"

بولے۔ "اس وقت تو وہ بند ہو گئیں، سہ پہر میں دیکھیے گا۔ اب چلئے کھانا کھائیں۔"

ہم نے کہا۔ "ہم تو کھانا نہیں کھاتے۔"

بولے۔ "کیوں! کیا آپ بیمار ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "نہیں خدانخواستہ۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے کا رواج نہیں۔"

ہمارا ارادہ اب یہ تھا کہ ان کو پانچ تومان ان کی محنت کا معاوضہ کسی بہانے دے کر رخصت کر دیا جائے، ورنہ ان کی تسمہ پائی سے نقصان بھی ہو گا اور لُطف بھی غارت

ہو گا۔

بولے۔ ”آپ ڈکشنری پڑھتے ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”نہیں پڑھتے تو نہیں، ہاں ڈکشنریاں دیکھی ضرور ہیں۔ کبھی کوئی مُشکل لفظ آیا دیکھ لیا۔“

بولے۔ ”میں اسے باقاعدہ پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ میری انگریزی مضبوط ہو اور مُجھے انگریزی کے سارے الفاظ آجائیں۔“

ہم نے کہا۔ ”وہ تو سوائے خدا کی ذات کے کسی کو نہ آتے ہوں گے۔“

بولے۔ ”ایک شخص حیّم ہے۔ اس کو آتے ہیں۔ اس نے کئی ڈکشنریاں بنائی ہیں۔ انگریزی سے فارسی کی بھی۔ فارسی سے انگریزی کی بھی۔ میں سوچتا ہوں کتنا بڑا عالم ہو گا۔“

ہم نے کہا۔ ”ڈکشنری بنانے کا طریقہ ہمیں معلوم ہے۔ اس کے لئے سارے الفاظ جاننے ضروری نہیں ہوتے۔“

بولے۔ ”میں بڑی بڑی مُشکل کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہاں میں نے ایک دُکان

پر بڑی اچھی ڈکشنریاں دیکھی ہیں۔ لیکن افسوس خرید نہیں سکتا۔"

گویا حسن طلب شروع ہوا۔ ہم نے کہا۔ "ایک دُکان کی کیا تخصیص۔ ڈکشنریاں تو ہر دُکان پر ملا کرتی ہیں۔ آج بازار میں ایک بُک اسٹال پر ہم نے دیکھی تھیں۔"

بولے۔ "اس دُکان پر بہت عمدہ ہیں اور کافی ذخیرہ ہے۔ آپ کو دکھاؤں؟"

ہم نے کہا۔ "اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

بولے۔ "مُجھے ایک لے دیجیے۔ راستے ہی میں دُکان ہے۔"

دُکان رستے ہی میں تھی اور دُکاندار نے باقی گاہکوں کو نظر انداز کر کے اور مرتضیٰ نکوئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہمیں اندر بُلا لیا اور کہا۔ "یہ دیکھیے ساری ڈکشنریاں موجود ہیں۔"

مرتضیٰ نکوئی کے حوصلے بہت بُلند تھے۔ اس نے ایک نور اللّغات کے حجم کی لُغّت اُٹھا کر کہا۔ "یہ اچھی ہے۔ اس میں سارے لفظ شامل ہیں۔"

"کتنے کی ہے؟"

بولے۔ "دو سو تومان کی ہے۔"

ہم نے اُن کے ہاتھ سے لے کر واپس شیلف میں رکھ دی۔

انہوں نے اب اس سے چھوٹی لُغّت اُٹھائی۔

"یہ پچاس کی ہے۔"

وہ بھی ہم نے ان کے ہاتھ سے لے کر شیلف میں ٹکادی۔

ایک اس سے چھوٹی تھی بولے۔

"یہ اتنی اچھی تو نہیں لیکن گزارہ ہے۔"

ہم نے کہا۔ "کتنے کی؟"

بولے۔ "فقط بیس تومان کی ہے۔ لے لوں؟"

ہم نے کہا۔ "دیکھو میاں مرتضیٰ نکوئی! ہمیں سیٹھ ساہوکار مت سمجھو۔ ہم میں بیس تومان بھی خرچ کرنے کی تاب نہیں۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ یہ ڈکشنری لے کے دے سکتا ہوں، یا پھر یہ۔" ان میں سے ایک پانچ تومان کی تھی، دوسری سات کی۔

اب انہوں نے ایک اور اُٹھائی بولے۔ "یہ بارہ تومان والی بھی چل جائے گی۔"

ہم نے کہا۔ "انگریزی کا کوئی ایسا لفظ بولو جو اس پانچ تومان والی میں نہ ہو۔"

منہ لٹکا کے بولے۔ "خیر یہ سات تومان والی لے لیتا ہوں۔"

اب ہم دُکاندار سے مخاطب ہوئے۔ ”میاں یہ کتنے کی ہو گی صحیح بتاؤ۔ سات تو ہم دینے سے رہے۔“

بولے۔ ”جی سات تومان ہی ہوں گے۔ کمپنی کی قیمت لکھی ہوئی ہے۔ اور ہمارے ہاں ایک دام ہیں۔“ خیر کچھ وہ گھٹا کچھ ہم بڑھے۔ چھ تومان میں سودا ہو گیا۔

باہر نکل کر کہا۔ ”اچھا میاں مرتضیٰ نکوئی خدا حافظ، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔“

بولے۔ ”تو آپ چہل ستون، مینارِ لرزاں، جامع مسجد خود دیکھ لیں گے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہاں۔ اور پھر ہم تمہارا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ تم پھر مسجد شاہ واپس جاؤ، کوئی اور گانٹھ کا پورا تلاش کرو۔“

بولے۔ ”یہ میرا کارڈ لیجیے، اور مجھے بھولیے نہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”بھولنا کیا معنی۔ واپس جا کر ہو سکا تو تمہارے بارے میں لکھیں گے بھی۔ تمہیں کوئی بھول سکتا ہے؟“

ہم نے ہاتھ ملا کر اور مرحمت شما زیاد کہہ کر خیابان چہار باغ کی طرف قدم اٹھایا۔ مرتضیٰ وہیں کھڑا رہا۔ چالیس قدم ادھر ایک غُبارے والے کی دُکان تھی۔ وہاں

ٹھٹک کر ہم نے سوچا، دیکھیں تو! مرتضیٰ نکوئی صاحب اب کیا کرتے ہیں؟

مرتضیٰ نکوئی دوبارہ کتاب فروش کی دُکان میں گھُسا اور چند لمحے کے بعد باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ڈکشنری نہ تھی۔

خدا جانے اس دُکان پر حییّم کی ڈکشنریوں کے ایسے کتنے سودے ہوتے ہوں گے۔ ہم تو خیر پاکستانی ہیں اور طبیعت کے جُزرس کہ چھ تومان میں یہ آزار ٹالا۔ دو سو تومان نہ سہی، بیس تومان کی ڈکشنری خرید کر دینے والے بہت ہیں۔ اسے واپس لے کر دُکاندار ایک دو تومان اپنا حصّہ لیتا ہو گا۔ باقی نقد مرتضیٰ نکوئی کی جیب میں جاتے ہوں گے۔

سو یہ تھے مرتضیٰ نکوئی۔ اب دوپہر تھی اور کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ہوٹل میں جانے کا کُچھ فائدہ نہ تھا۔ رہنے کی تو مجبوری ہے، کھانا آپ کہیں بھی کھائیے۔ وقت ایسا تھا کہ آدھ گھنٹے کے بعد دیکھنے کے مقامات چہل ستون وغیرہ پھر دیکھنے والوں کے لیے کھلنے والے تھے۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر ہم پھر داہنے ہاتھ ہو لیے۔ تھوڑی دور پر قیمے کی سوندھی خوشبو آئی جو بھوک کو چمکا گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا بھٹیار خانہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ باورچی زیتون کے تیل کا چمچ (چمچہ نہیں) ایک بہت بڑے

فرائی پین میں ڈال قیمہ بھونتا ہے اور پھر نان کو اُسی روغن میں تل اوپر سے قیمہ ڈال گاہکوں کو پروس رہا ہے۔ ایک طرف لسّی کا لال ماٹ رکھا تھا۔ یوں کوکا کولا اور کناڈا ڈرائی کا انتظام بھی تھا۔ بھٹیار خانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں کرسی میز نہ تھی۔ سب کُچھ تھا۔ بوائے نے فوراً پیاز اور چٹنی سامنے لا فرمایا۔۔۔ ”بفرمائید آقا۔“

ہم نے کہا۔ ”روٹی قیمہ اور لسّی۔“

قیمہ تو خیر۔ روٹی کا سائز اچھی خاصی ٹوکری کے برابر تھا۔ ہم نے کہا۔ ”اس سے آدھا۔“

اس نے تعمیل ارشاد کی۔

ہم نے کہا۔ ”اس سے بھی آدھا۔“

یہ پارۂ نان بھی ہمارے ظرف سے کُچھ زیادہ ہی تھا لیکن سوچا کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک پولیس والا پاس کی میز پر بیٹھا مونچھیں مٹکا رہا تھا۔ بولا۔ ”آپ دوغ پسند کرتے ہیں؟“

ہم نے کہا ”جی ہاں۔ ہمارے ہاں ہر کھانے کے ساتھ لسّی پی جاتی ہے۔“

بولے۔ ”ہاں ہاں۔ بڑی فائدہ مند چیز ہے۔ لیکن آج کل کے لونڈے تو کوکا کولا اور کناڈاڈرائی پر جان دیتے ہیں۔“

معلوم ہوا کہ اگر اسی فٹ پاتھ پر دو سو قدم آگے جائیں تو داہنے ہاتھ ایک رستہ مُڑے گا۔ وہ ایک چوک پر پہنچائے گا۔ وہاں سے بائیں ہاتھ مڑیں تو جامع مسجد کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ کسی سے پوچھ لیجیے بلکہ خود ہی ڈھونڈ لیجیے۔

ابنِ بطوطہ لکھتا ہے

شہر اصفہان بہت بڑے شہروں میں سے ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔ لیکن اب سنیوں اور روافض کے درمیان فتنہ کی وجہ سے ویران ہو گیا ہے۔

پھل پھلاری بکثرت ہیں۔ مشمش جسے تمر الدّین کہتے ہیں۔ بہی انگور اور خربوزہ تو ایسا عجیب ہوتا ہے کہ ماسوا بخاری اور خوارزمی خربوزے کے ویسا کہیں نہیں ہوتا۔ بے انتہا شیریں۔ جسے کھانے کی عادت نہ ہو پہلی بار کھانے سے اُسے دست آنے لگتے ہیں۔ میری بھی یہی حالت ہوئی۔

باشندگانِ اصفہان بہت خوش خوراک ہیں۔ بایں الفاظ دعوت کرتے ہیں۔ ”آیئے

نان ماس نوش فرمایئے۔" ہر پیشے والے کا ایک چودھری ہوتا ہے جسے کلّو کہتے ہیں۔ کھانے پینے میں بہت تکلّفات روا رکھتے ہیں۔ ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی دعوت کی تو شمع کی آنچ پر کھانا پکایا۔ دوسرے نے دعوت کی تو نہلے پر دہلا مارا۔ ریشم کی آگ سے چولہا روشن کیا۔
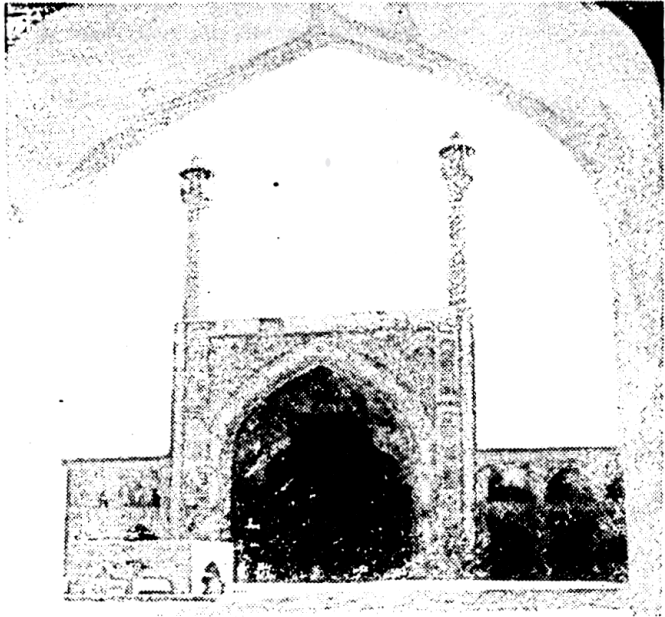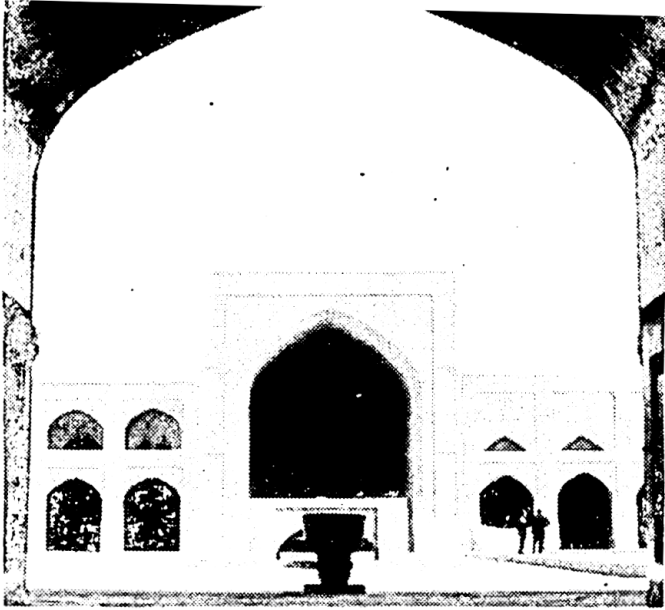
نیچے ، جامع مسجد صدر دروازہ — اوپر، سلجوقی عہد کا ایوان

جامع مسجد اور رحمت اللہ

اصفہان کی جامع مسجد وہاں کی قدیم ترین عمارتوں میں سے ہے۔ مسجد شاہ، عالی قاپو، چہل ستون وغیرہ صفویوں کے عہد یعنی سترھویں صدی کی یادگار ہیں۔ لیکن جامع مسجد کا زمانہ پرانا ہے۔ بلکہ کہتے ہیں یہاں ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی مَعبَد رہا ہے۔ جہاں اب یہ واقع ہے، وہاں قبل از اسلام پارسیوں کا ایک بڑا آتش کدہ ہوا کرتا تھا۔ مسجد کی بِنا تیسری صدی ہجری کے شروع میں ایک عباسی خلیفہ کے ہاتھوں پڑی۔

خیر۔ آگے ایک چوک تھا۔ غالباً وہی چوک جس کا پتہ بتایا گیا تھا۔ لیکن کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے، کیوں نہ پوچھ لیا جائے۔ چند ننگ دھڑنگ لڑکے کنکریوں سے کھیل رہے تھے۔ ہم نے انہیں بُلا کے جامع مسجد کا راستہ دریافت کیا۔ سب ایک ساتھ بول اُٹھے۔ ان کی چیں چیں چیں چیں تو سمجھ میں نہ آئی، ہاں انگلی کا اشارہ واضح تھا۔ ہم نے مرحمت شما زیاد کہہ کر اُدھر قدم بڑھایا۔ لیکن اُن لوگوں کو کنکروں سے زیادہ دلچسپ مصروفیت ہاتھ آ گئی تھی، لہٰذا سارا غولِ بیابانی ساتھ ہو لیا۔ عجب سڑک تھی۔ حدِّ نظر تک کوئی سواری گاڑی تو کیا کوئی متنفّس نظر نہ آتا تھا۔ دو رویہ کچّی مٹّی اور لال اینٹوں کے بڑے بڑے آثاروں والے مکانات تھے۔ لیکن بیشتر گرائے جا رہے تھے، اور اِن کے اندر کے طاقچے اور دریچے ان کی کہنگی کا پتہ دے رہے تھے۔ عمارتی مسالہ بھی پڑا تھا، اور گرد بھی اُڑ رہی تھی۔ اور لونڈے دُلکی چلتے ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے مارتے پیچھے چھوڑ جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ بقول شاعر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اور آخر میں تین چار ہی رہ گئے۔ ہم نے کہا۔ "کیا نام ہیں تم لوگوں کے۔"

ایک کا نام علی تھا، دوسرے کا مصطفیٰ۔ تیسرے کا کچھ نام تو تھا لیکن ہماری سمجھ میں نہ آیا۔

"پڑھتے ہو۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"چیں چیں چیں چیں" کُچھ پلّے نہ پڑا۔

"اچھا اب آرام کرو۔۔۔بہت شکریہ۔"

"پول بدہید" یعنی پیسہ ڈھیلا کرو۔

ہم نے بھی اپنی فارسی چمکانے میں مضائقہ نہ سمجھا اور کہا۔ "اچھا جو شخص یہ بتائے کہ میں کہاں کا ہوں اسے پانچ ریال ملیں گے۔"

ایک بولا۔ "امریکی۔"

ہم نے کہا۔ "ہت تیرے کی۔"

دوسرا بولا۔ "فرانسہ۔یعنی فرانسیسی۔"

ہم نے کہا۔ ”اور سوچو۔ اور سوچو۔“

آخر ایک نے کہا۔ ”جناب آپ مشہدی ہیں اور کیا ہیں۔“

مزید بحث فضول تھی۔ اس لئے کہ ان کا تاریخ جغرافیہ کا عِلم ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے پاکستان کا نام لیا تو آرے بلے کہہ کر رہ گئے۔ بولے ”اچھا اب پیسے دو۔“

ہم نے کہا۔ ”تم لوگ امتحان میں فیل ہو گئے۔ پیسے کیسے؟“

اب انہوں نے ہمارے گرد رقص کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے کہا۔ ”اچھا ایک ایک ریال۔“

بولے۔ ”جی نہیں۔ پانچ پانچ ریال۔“

ہم نے کہا۔ ”نمی باشد۔“

وہ بھی بولے۔ ”نمی باشد۔“ آخر تین تین ریال پر سودا ہو گیا۔

بولے۔ ”آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہم آپ کو ایک نزدیک کے رستے سے لے چلیں گے۔“

واقعی وہ نزدیک کا رستہ تھا لیکن نہایت ٹیڑھا۔۔۔ کُچھ پیتل کانسی کے برتنوں والے، کُچھ خیّاط، کُچھ عطّار۔ ہر چیز سیکنڈ ہینڈ سی لگتی تھی، حتّیٰ کہ لوگ بھی۔

طویل راستہ عین جامع مسجد کے سامنے جا کر نکلا۔

اس جامع مسجد نے بہت انقلابات دیکھے ہیں، لیکن اس وقت بھی وہ لنڈے بازار کا مال معلوم ہو رہی تھی۔ ایک دروازے سے ہم اندر گھُس گئے اور کسی نے بلیطہ تک نہ پوچھا۔ مسجد کے صحن میں پہنچے تو بے اختیار اختر الایمان کی مسجد یاد آئی۔

گرد آلودہ چراغوں کو ہوا کے جھونکے

روز مٹّی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں

اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس

روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں

حسرتِ شام و سحر بیٹھ کے گنبد کے قریب

ان پریشان دعاؤں کو سُنا کرتی ہے

جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر

اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے

یا ابابیل کوئی آمدِ سرما کے قریب

اس کو مسکن کے لیے ڈھونڈ لیا کرتی ہے

اور محراب شکستہ میں سمٹ کر پہروں

داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے

ایک میلا سا، اکیلا سا، افسردہ سا دیا

روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے

تم جلاتے ہو، کبھی آ کے بجھاتے بھی نہیں

ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے

لڑکوں نے پیسے تو لے لئے لیکن اودھم مچانا نہ چھوڑا۔ ہم تو منبر و محراب میں اُلجھ

گئے، انہوں نے حوض کے گرد کلیلیں کرنی شروع کیں۔ وہاں سے جی اُوب گیا تو ہمیں آستین سے پکڑ بائیں ہاتھ کی محراب میں سے اندر لے گئے کہ یہ دیکھو۔

یہ ایک لق و دق تالار تھا۔ محرابیں ہی محرابیں، ستون ہی ستون۔ اور پھر اُن میں کمر کمر تک دیواریں۔ گویا مختلف حصّے کر رکھے تھے۔ یہاں کسی زمانہ میں قافلے آ کر ٹھہرا کرتے ہوں گے۔

جامع مسجد اصفہان لڑکوں کو اچھا کھیل ہاتھ آیا تھا۔ اب انہوں نے ان ستونوں اور دیواروں کے پیچھے آنکھ مچولی کھیلنی شروع کر دی۔ اتنے میں ایک جغادری گالی سنائی دی۔ پھر ایک ادھیڑ عُمر کا کرنجی آنکھوں والا آدمی ان کے پیچھے بھاگتا نظر آیا۔ لڑکے ڈال ڈال وہ پات پات، لڑکے تین وہ ایک۔ لیکن اس شخص میں اِس بلا کی چُستی اور پھُرتی تھی کہ تعجّب ہوتا تھا۔۔ اس نے اِس ٹولی کا تالار سے صحن اور صحن سے دروازے تک برابر پیچھا کیا۔ پھر آ کر ہمیں مطلع کیا کہ یہ شیطان کی اولاد ہیں اور جناب میں سلام عرض کرتا ہوں اور آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اہلاً و سہلاً اے آمدِنت باعث آبادی ما۔

یہ شخص رحمت اللہ تھا، پراسرار رحمت اللہ۔ جس کے متعلّق ہم اب بھی کبھی رات

کو سوچا کرتے ہیں کہ کیا تھا اور اس کا ہمیں تہہ خانے میں لے جانے اور کواڑ بند کر دینے سے کیا مقصد تھا۔

رحمت اللہ جامع مسجد کا، جسے جمعہ مسجد کہتے ہیں، دربان اور گائیڈ سبھی کچھ تھا۔ اس نے کہا جناب یہ اصفہان کی سب سے قدیمی مسجد ہے اور ۸۴۰ء میں ایک عباسی خلیفہ نے اسے بنایا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی عہد میں اس کی تعمیر ہوئی۔

ہم نے کہا۔ ”کیا مطلب؟“

بولے۔ ”نویں صدی میں بنی اور گیارہویں صدی عیسوی میں اس کی تعمیر ہوئی۔“

ہم نے کہا۔ ”خوب خوب، اب ہم سمجھ گئے۔“ ہم بھول گئے تھے کہ تعمیر کرنے کا مطلب مرمّت کرنا ہے۔ ”وہ آتش کدہ کہاں ہے جو کہتے ہیں قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔“ رحمت اللہ نے انگلی کے اشارے سے ایک طاقچہ دکھایا۔ بولے۔ ”یہاں وہ آتش کدہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں سے مسجد کی بِنا شروع ہوئی۔ اِس کے مختلف حصّے مختلف زمانوں کی یادگار ہیں۔ یعنی پہلی تعمیر پر اضافہ در اضافہ ہوتا گیا۔ یہ آتش کدے والا حصّہ قدیم ترین ہے۔ عباسیوں کے عہد کا۔ آپ کو تہہ خانہ دِکھاؤں؟“

"کہاں ہے؟"

"اس دروازے کے پیچھے ہے۔"

جس تالار میں ہم کھڑے تھے اس کے ایک کونے میں ایک لکڑی کا دروازہ تھا۔ پہلے ہم نے اندر قدم رکھا۔ بہت دُھندلی اور ملگجی سی روشنی تھی۔ روشنی نہیں جھٹ پٹا تھا۔ کئی سیڑھیاں نیچے اُترنا پڑا۔ یہ بھی ستونوں اور محرابوں کا ایک لق دق سلسلہ تھا، اور روشنی فقط چھت کے موگھوں سے آرہی تھی۔ سیلن سے عجیب طرح کی بو اٹھ رہی تھی جس کا فشار ذہن پر اثر کرنے لگا تھا۔

اتنے میں دروازے کی چٹخنی چڑھانے کی آواز آئی۔ رحمت اللہ نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

لیکن کیوں؟

اپنے اگلے دس منٹ کے احساسات کا ہم قطعیت سے تجزیہ نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے یہ آسیبی کیفیّت ہمارے ذہن کے اندر ہو۔ ہو سکتا ہے باہر کا عکس ہو۔ دروازے کی کنڈی کیوں چڑھائی گئی۔ رحمت اللہ ہمارے قریب آنے کی کیوں کوشش کر

رہا تھا۔ اس کی کرنجی آنکھوں میں یہ کیا جھلک رہا ہے۔ یہ تہہ خانہ ایک الگ تھلگ دنیا ہے۔ باہر سے کسی نے ہمیں اندر آتے دیکھا بھی نہیں۔ لہٰذا اگر ہم باہر نہ نکلیں تو کوئی شُبہ بھی نہیں کر سکتا۔ چیخ بھی باہر نہیں جا سکتی اور پھر دروازہ کیوں بند ہوا۔ کیوں بند ہوا؟ رحمت اللہ نے اس تہ خانے کی کیا تاریخ بیان کی کُچھ یاد نہیں۔ شاید یہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ وہ ہمارے پاس آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے کچھ دِکھانے کو پاس بُلانے کی کوشش کی، لیکن ہم نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ پہلو بچا کر دروازے پر پہنچیں اور کنڈی کھول کر نکل جائیں۔ لیکن وہ کسی نہ کسی صورت ہمارے اور دروازے کے درمیان حائل ہو جاتا تھا۔ دوسرا دروازہ اگر کوئی ہے، کہاں ہے؟ کُچھ معلوم نہ تھا۔ رحمت اللہ کی چیتے کی سی لپک جھپک ہم دیکھ چکے تھے۔ ہم پھُرتی اور قوّت میں اس کا جوڑ نہ تھے اور دونوں کی آنکھ مچولی تہہ خانے کے تاریک تر حصّے میں ہمیں لیے جا رہی تھی۔

آخر ایک جگہ ایک فرسودہ سا دروازہ نظر پڑا۔ ہم نے جھپٹ کر اس کی زنجیر کھولی۔ اب ہم ایک گنبد والے وسیع حجرے میں تھے جس کا دوسرا دروازہ صحن مسجد میں کھلتا تھا۔ اور وہاں سے تازہ روشنی جھل مل کرتی آ رہی تھی۔ رحمت اللہ اندر سے اب بھی پکار رہا تھا کہ یہ دیکھو، یہ دیکھو۔ لیکن ہماری وحشت بیرونی دروازے کی طرف

دھکیل رہی تھی۔ اس حُجرے میں ایک بہت پرانے زمانے کا منبر رکھا تھا۔ کس زمانے کا؟ اب یاد نہیں۔ لکڑی فرسودہ ہو کر کالی ہو رہی تھی۔

آخر رحمت اللہ بھی نکل آیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ پھر ہم دونوں صحن میں آ گئے۔ اب وہ بھی نارمل انسان نظر آتا تھا اور ہماری بھی سحر زدگی ختم ہو رہی تھی۔ اس عالیشان عمارت کی باقی وسعتیں ہم نے صحن اور برآمدوں ہی میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ کسی اور حُجرے میں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

رحمت اللہ نے کہا۔ ”اب ایک فنجان چائے نوش کرتے جایئے۔“

ہم نے کہا۔ ”مہربانی۔“ اس نے اصرار کیا۔ ہمیں بھی چائے کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ رحمت اللہ ہمیں ایک مختصر سے حُجرے میں لے گیا۔ اس کی ایک سمت پوری جالی کی تھی۔ اسے رحمت اللہ نے کاغذوں سے پاٹ رکھا تھا تاکہ سردی اور ہوا سے بچاؤ رہے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک چٹائی بچھی تھی اور اس پر ایک لحاف پڑا تھا۔ رحمت اللہ نے ایک طباق سی روٹی اٹھائی اور ہمیں پیش کی۔ لیکن ہم نے شکریہ ادا کر کے معذرت کی کہ بھوک نہیں۔ اسے وہ لپیٹ کر نمک کے ساتھ دو لقموں میں چڑھا گیا۔ چائے اب تیّار تھی۔ اس نے مصری نما چینی کے ایک ڈلے کو ایک

ڈنڈے سے توڑا اور چینی کی کنکریاں ہمیں پیش کیں۔ چائے مزیدار تھی۔

اتنے میں ایک لڑکا پھدکتا ہوا اندر آیا۔ ہم نے کہا۔ ”یہ کون؟“

رحمت اللہ نے کہا۔ ”میرا لڑکا ہے۔“

”کیا کرتا ہے؟“

”پہلی جماعت میں پڑھتا ہے۔“

ہمیں اپنے اسکول کے دِن یاد آ گئے تھے۔ ہم نے دو تومان لڑکے کو دیئے۔ رحمت اللہ بہت خوش ہوا۔ باہر نکلے۔ بڑے تپاک سے رخصت ہوئے۔ ہم نے ڈھائی تومان رحمت اللہ کو بھی دیئے۔ اس پہلی جماعت کے طالب علم کا باپ مجرم نہیں ہو سکتا۔ ہم کو دھوکا ہوا تھا۔ یہ فقط اُس تہہ خانے کا آسیب تھا۔
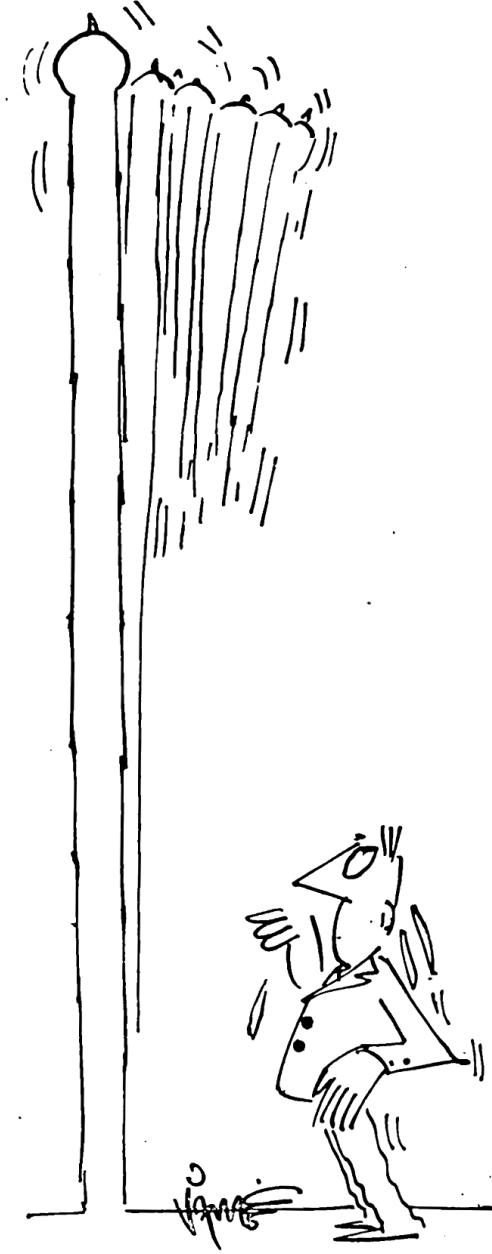
ذرا مینارِ لرزاں تک

ٹیکسی تو ہمیں وہیں سے مل سکتی تھی لیکن ہم تھوڑا پیدل بھی چلنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دور پر ایک چوک تھا اور اس کے گرداگرد پرانی طرز کی زیادہ تر کچّی عمارتیں جو چوک سے خاصی اونچائی پر واقع تھیں۔ یہاں عورتوں کی پوشش بھی پرانی وضع کی تھی اور لوگوں پر خستگی طاری تھی۔ چوک کا آدھا دائرہ پورا کرنے کے بعد ایک بالکنی والے مکان کے پہلو سے ہمیں ایک گلی اُوپر چڑھتی دِکھائی دی اور اب ہم حاجی بابا کے بازار میں تھے۔

یہ بازار کا نام نہیں ماحول تھا۔ ٹیڑھے میڑھے راستے میں دو تین حمال ملے اور ایک دو بڑھیائیں کان لپیٹے پاس سے گزر گئیں۔ آگے نیچی نیچی چھتوں والی دُکانیں تھیں اور جھُلسی ہوئی دیواروں والا چھوٹا سا بازار۔ ایک دُکان کھیل کھلونوں کی تھی، ایک سبزی والا کنجڑا، ایک دو ٹوٹے اور کھُردرے بینچوں والے چائے خانے۔ ایک گلی داہنے ہاتھ کو نکل کر نشیب میں اُترتی چلی گئی تھی۔ ہم بھی اس میں اُتر گئے۔ آگے ایک احاطہ تھا جو ہر طرف سے بند تھا اور اس پر تین چار گدھوں پر مال لد رہا تھا۔ اس احاطے کی صورت سرائے کی سی تھی۔ یہاں کسی نے ہماری طرف توجّہ نہ کی۔ یہ بھی الف لیلہ کا منظر تھا کہ لوگ دیکھتے ہیں لیکن جیسے دیکھتے نہیں۔ جیسے اب ہم خود الوپ ہو گئے ہوں۔ بہر حال یہ سارے منظر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب ہم ایک قدیم گلی میں نکل گئے جو ڈیڑھ سو برس پرانی بو باس لئے ہوئی تھی۔ کیا عجب اس سے بھی قدیم ہو۔ تو گویا یہ اندر کا اصفہان تھا۔

چوک پر واپس آ کر ہم نے ٹیکسی لی اور کہا اس سڑک پر موڑو اور چہل ستون چلو۔ لیکن اس نے ایک ایسے کوچے میں ٹیکسی ڈالی کہ گاڑی کے مڈ گارڈروں اور دیواروں کے بیچ فقط ایک دو انچ کا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ کوچہ سنسان تھا اس لیے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ کوئی سامنے آیا بھی تو کسی دروازے میں سٹک گیا یا کسی بغلی گلی میں ہو لیا۔

اب ہم ایک اونچی قلعہ نما عمارت کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بڑی لمبی اور اونچی دیوار تھی اور کہنگی کے نشان جا بجا ہویدا تھے۔

ہم نے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

ڈرائیور نے بتایا کہ پرانی کاروان سرائے شاہی ہے۔ اچھا تو یہ وہ کاروان سرائے ہے جس کے قریبی کوچے میں حاجی بابا کا گھر تھا اور جس پر ڈاکہ ڈالنے کیلئے ترکمان ڈاکو اپنے اسیر حاجی بابا کو نشاندہی کے لئے ہمراہ لائے تھے۔ حاجی بابا تو ہمیں گلستان کی طرح یاد ہے۔

کارواں سرائے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے پتھّر سے کھٹکھٹایا اور دربان کو پکارا کہ علی محمد آ۔ دروازہ کھول۔ قافلہ آیا ہے۔

(علی محمد نیند بھری آنکھوں سے دروازے کے پیچھے آ کر) "کیسا قافلہ۔ کہاں کا قافلہ۔"

میں نے کہا۔ "بغداد کا قافلہ"

اس نے کہا۔ "جاؤ اپنا کام کرو۔ تم آدھی رات کو ہم سے مذاق کرنے آئے ہو۔

بغداد کا قافلہ کل تو آیا ہے۔" میں نے دیکھا کہ بُرے پھنسے۔ فوراً بات پلٹا کر کہا "نہیں۔ وہ قافلہ آیا ہے جو بغداد کو جا رہا ہے۔ حسن حجام کا بیٹا حاجی بابا جو عثمان آغا کے ساتھ گیا تھا، ہمراہ ہے۔ میں اس کے باپ کے پاس خوشخبری لایا ہوں۔" جب دربان نے یہ سُنا تو کہا "آہا۔ ہمارا حاجی بابا گلابی پھول۔ خوش آمدی۔"

پس دروازہ کی سٹکنی تڑاق تڑاق کھولی۔ سرائے کا دروازہ چرخ چوں کرتا کھل رہا تھا۔ علی محمد چراغ ہاتھ میں لئے صرف ایک کُرتہ پہنے نمودار ہوا۔ فوراً اس کا مُنہ بند کر دیا اور اندر گھُس کر قزّاقی میں مصروف ہوئے۔ مال وزر لوٹا، اور تین آدمی چُن کر اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گھوڑوں پر لاد یہ جاوہ جا۔

میں نے بھی ایک حجرے میں ایک تھیلی پائی اور بغل میں دبائی۔ اب تو شہر میں شور و غوغا بُلند ہوا۔ سرائے کے لوگ، چوکیدار، خچر والے سب دوڑ کر چھتوں پر چلے گئے۔ کوتوال بھی آگیا اور گرفتار کرنے اور باندھنے کے بجائے خود بھی پکڑو پکڑو مارو مارو کے نعرے لگانے لگا۔ میں بھی ایک طرف کو کھسکا۔ باپ کی دُکان سامنے نظر آ رہی تھی۔ گذرے ہوئے ایّام آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ لیکن میں ڈاکوؤں کے سردار ارسلان سلطان کے خوف سے جلد ہی سنبھل گیا اور ایک ایرانی کو سامنے دیکھ کر لپٹ گیا کہ تیری ایسی تیسی میرے ساتھ چل ورنہ تیری تکّا بوٹی کر دوں گا۔

بے چارہ رونے چلّانے لگا کہ مجھے خدا اور پیغمبر کی قسم، اگر شیعہ ہے تو امام حسن امام حسین کا واسطہ اور اگر سُنّی ہے تو خلفا کی روح کی قسم۔ اگر حلال زادہ ہے تو اپنے ماں باپ کی سوگند، مجھے چھوڑ دے۔

اس کی آواز میرے کانوں کو آشنا معلوم ہوئی۔ یہ میرا باپ تھا جو فقط ایک کُرتہ پہنے چراغ لیے دُکان کی چھ سات لنگیوں، دس استروں اور سنگیوں کی حفاظت کے لیے آیا تھا۔ میں نے فوراً اُس کی داڑھی چھوڑ دی اور ایک خچر کے چند ڈنڈے مارے گویا اس ایرانی کو مار رہا ہوں۔ اس وقت میرے باپ نے ایک آہ بھری اور کہا کہ ہائے بیٹے کے دیدار سے محروم مرتا ہوں۔ یہ بات مُجھ پر کارگر ثابت ہوئی۔ میں نے اپنے ہمراہی قزّاقوں سے کہا۔ "اسے چھوڑ دو میں اسے جانتا ہوں۔ حجّام ہے۔ دو کوڑی کو بھی مہنگا ہے۔"

آخر ٹیکسی راستوں کے چکر کاٹتی عین چہل ستون کے دروازے کے قریب نکلی۔ ڈرائیور نے کہا۔ "جناب یہ یک طرفہ راستہ ہے اس لیے میں بیچوں بیچ نکل آیا۔ ورنہ بڑی سڑک میں دہری مسافت پڑتی۔"

ہم نے کہا۔ "میاں بڑی سڑک سے آتے تو کارواں سرائے کی دید سے محروم رہتے۔

اب یہ اور بتادو کہ حسن مشہدی دلّاک کی دُکان کہاں پر ہے؟"

وہ حیرت سے بولا۔ "جی۔"

ہم نے کہا۔ "کُچھ نہیں۔ ہم اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔"

صدر دروازے سے چلتے چلتے آپ چہل ستون کی ڈیوڑھی پر پہنچتے ہیں۔ ہم نے گِنا تو کل اٹھارہ ستون تھے۔ چنانچہ گائیڈ سے پہلا سوال یہی پوچھا کہ "حضرت ایں چہ؟" ہمیں تو پورے چالیس پورے کر کے دکھاؤ۔

بولا۔ "جی یہ آپ تالاب دیکھ رہے ہیں نہ۔ اس میں عکس پڑنے سے تعداد دُگنی ہو جاتی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "یہ تو کوئی خوش معاملگی نہیں۔ لیکن خیر پھر بھی اٹھارہ اٹھارہ چھتیس ہوئے۔ باقی چار لاؤ۔"

بولا۔ "جی میرے پاس تو ہیں نہیں۔ جو کُچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔"

واقعی اس میں اس کا کچھ قصور نہ تھا کیونکہ یہ عمارت شاہ عباس صفوی نے تین سو سال ہوئے بنوائی تھی۔ بہت اُونچے ستون ہیں۔ دربار کی جگہ تو اونچی چھت کے نیچے

ہے۔ گرداگرد گیلریاں ہیں اور حُجرے ہیں۔ سامنے جو عالی قاپو کی سات منزلہ عمارت نظر آتی ہے، چہل ستون کی ایک ہی منزل اس سے کسی صورت کم نظر نہیں آتی۔ داہنے ہاتھ کو ایک رجسٹر رکھا تھا جس میں ہر آنے والے کو اپنا نام پتہ پیشہ وغیرہ درج کرنا پڑتا تھا۔ پیشے کے باب میں ہم نے نویسندہ لکھا تو گائیڈ دیکھ کر خوش ہوا۔ "اچھا تو آپ مصنّف ہیں۔" ہم نے کہا۔ "ہاں بہت بڑے نویسندہ۔"

اب اس شخص نے چوکس ہو کر ایک ایک چیز دِکھانی شروع کی۔ زیادہ تر چہل ستون کے میوزیم میں تصویریں ہیں یا پھر نازک ظروف اور اسلحہ۔ کچھ زِرہ بکتر اور پوشاکیں بھی ہیں۔ ایک تصویر میں شاہ طہاسب صفوی بیٹھے ہیں۔ پاس ہمایوں بادشاہ کو بِٹھا رکھا ہے۔ اور ایک طرف ہمایوں کے ہمراہی راجپوتی پگڑیاں باندھے کھڑے ہیں۔ گائیڈ نے کہا۔ "جناب آپ کا بادشاہ جب ہندوستان سے بھاگ کر آیا ہے تو ہمارے بادشاہ نے یہیں اس کی پیشوائی اور میزبانی کی تھی۔"

ہم نے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب ہم نے بادشاہ رکھے ہی نہیں۔ نہ بادشاہ ہوں نہ بھاگیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

یہ فلسفہ گائیڈ کی سمجھ میں نہ آیا۔ بولا۔ "اُدھر دیکھیے، کتنا نفیس کام ہو رہا ہے۔"

عجائب گھر دیکھا۔ دو ٹکے گائیڈ کی نذر کئے اور چہل ستون کی پشت کی طرف نکلے۔ گرداگرد وسیع لان ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس محل میں شکوہ تو ہے، لیکن وہ نفاست اور باریکی نہیں جو چوک نقش جہان کی مسجدوں میں ہے۔ اور عالی قاپو میوزک روم کو چھوڑ دیجیے تو باقی عمارت بالکل پھٹیچر ہے۔ محض اُتھلے حُجروں اور تنگ زینوں کی بھول بھُلیّاں۔

لہٰذا آقائے ابنِ انشا۔ اُٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو مینارِ لرزاں۔

چہل ستون سے خیابان چار باغ پر آکر جو ہم نے مینارِ لرزاں کے لیے ٹیکسی لی تو یہی خیال تھا کہ دس ریال دیں گے جو اصفہان میں ہر فاصلے کا مقرّرہ کرایہ ہے۔ لیکن وہاں پہنچے تو ڈرائیور کا ہاتھ پھیلے کا پھیلا رہا۔ بولا۔ "جناب قربانت شوم۔ چالیس ریال عنایت فرمایئے گا۔"

ہم نے کہا۔ "اصفہان میں مقرّرہ ریٹ کیا ہے؟"

"دس ریال؟"

"پھر؟"

فرمایا۔ ”جناب آپ نے مُجھ سے طے تھوڑا ہی کیا تھا۔“

بے شک طے نہیں کیا تھا اس لئے ہم نے کہا۔ ”بیس ریال۔“

بولے۔ ”نہ“

”پچیس۔“

”نہ۔۔۔نہ“

”تیس“

”نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ“

آخر ہم نے پھاٹک کے دربان سے کہا۔ ”میاں تم ہی اس کو سمجھاؤ۔ چہار باغ سے یہاں تک کے چالیس ریال کیسے ہوئے؟“

وہ مرد متمکن ہم دونوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگا، اس سے اسے کمیشن کی اُمّید تھی، ہم سے بخشش کی۔ بولا۔ ”جناب، ہے تو اس کی زیادتی۔ لیکن اب مانگ رہا ہے تو دے ہی دیجیے۔“

چھوٹی سی یک محرابی عمارت ہے جس کے دو ستون ہیں۔ اندر کسی بزرگ کا مزار ہے جس پر چراغوں کا تیل ٹپکا ہوا ہے۔ ایک مجتہد نما صاحب کالی عبا زیب تن کیے اس مزار سے سہارا لیے بیٹھے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ عمارت ساڑھے چھ سو برس پہلے کی ہے۔ جن بزرگ کے مزار پر سایہ کئے ہوئے ہے ان کا نام معلوم ہوا لیکن یاد نہیں رہا۔ محراب کے نیچے فرش پر جابجا لوگوں کے نام لکھے تھے۔ ہم نے کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“ بولے۔ ”یہ اِن لوگوں کی قبریں ہیں جن کے نام ہیں۔“

”اِن پر تعویذ کیوں نہیں۔ یہ تو فرش کی سطح پر ہیں۔“

وہ چپ رہے۔

”کیا آپ لوگوں کو جوتے لے کر ان پر چڑھنے سے نہیں روکتے؟“

اس کا جواب دینا بھی انہوں نے ضروری خیال نہ کیا اور ایک بدرنگ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ ہاں اشارے سے زینے کا راستہ انہوں نے بتا دیا کیونکہ لوگ وہاں مزار پر فاتحہ پڑھنے یا مسئلے مسائل کی بحث کرنے نہیں جاتے، مینارِ لرزاں دیکھنے جاتے ہیں۔

تنگ زینہ چھت پر جا کر نکلا۔ وہاں پہلے ہی کُچھ سیّاح نما لوگ کھڑے تھے اور کچھ لوگ کیمروں سے تصویریں کھینچ رہے تھے۔

ایک امریکن بڑھیا بھی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ مینار کیسے ہلتے ہیں؟"

"ہلانے سے ہلتے ہیں۔" ایک صاحب بولے۔

"لیکن کیسے؟" دادی اماں کو جستجو ہوئی۔

"اوپر جا کر وہ لکڑی کا دستہ پکڑ کر آگے پیچھے ہلائیے۔ نہ صرف یہ مینار اپنی جڑ سے ہلے گا بلکہ دوسرا مینار بھی جو تیس فٹ دور ہے، اسی طرح جنبش کرے گا۔ آپ خود چڑھ کے دیکھیے۔"

زینہ بہت تنگ تھا۔ اس لئے ہم نے بھی اوپر چڑھنے کے بجائے تماشہ دیکھنا پسند کیا۔ یہ امریکن بڑھیا بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔ بولیں۔ "نا بابا میں تو گر جاؤں گی۔ کیا پتہ ہے مینار گر پڑیں۔ یہ لو پچاس ریال اوپر چڑھ کے ہلاؤ مینار کو۔ میں کیمرے سے تصویر کھینچتی ہوں۔"

ان صاحب نے اوپر جا کر مینار کو ہلایا۔ دوسرا مینار بھی ہلا۔ معلوم ہوتا تھا دونوں

مینارے اب گرے کہ گرے۔ لیکن معلوم ہوا ساڑھے چھ سو برس سے یہی ہوتا آیا ہے۔ مینارِ لرزاں کے احاطے سے باہر نکلے تو ایک بھلامانس ٹیکسی والا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ بولا۔ ”جناب پندرہ ریال لے لوں گا۔“

ہم نے کہا۔ ”لیکن ہمیں تو پارسیوں کا آتش کدہ دیکھنا ہے۔ وہاں کُچھ دیر ٹھہرنا ہے، پھر شہر واپس آنا ہے۔“

بولا۔ ”پھر آپ چالیس ریال دے دیجیے گا۔“

ہم نے پینتیس کہا۔ وہ مان گیا۔

ایک اونچی پہاڑی کے دامن میں ٹیکسی رُکی۔ ہم نے کہا۔ ”آتش کدہ کہاں ہے؟“

بولے۔ ”جی کون سا آتش کدہ۔ کہاں کا آتش کدہ۔ پہلے زمانے میں تھا۔ اب تو ویران ہے۔ فقط جھلسی ہوئی دیواریں ہیں اور وہ اس پہاڑی کی چوٹی پر ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”دس پندرہ منٹ ٹھہرو۔ ہم دیکھ کے آتے ہیں۔“

ہم نے پتھّروں میں بنی ہوئی پیچ در پیچ پگڈنڈیوں پر تیز تیز چڑھنا شروع کیا۔ جہاں جہاں ڈھلوان سطح ہو گئی تھی لوگ بیٹھے تاش اور شطرنج کھیل رہے تھے۔ جوں جوں

ہم اُوپر چڑھتے پہاڑی اور بُلند ہوتی جاتی تھی۔ پندرہ منٹ کی چڑھائی کے بعد ہم نے دیکھا کہ سارا وقت راستوں کے پیچ و خم میں صرف ہو گیا ہے اور ہم سطح زمین سے زیادہ اُونچے نہیں۔ ہاں چوٹی اب بھی اتنی ہی دور ہے جتنی تھی۔ حوصلے نے کہا ہاں ہاں بڑھے چلو۔ لیکن گھڑی نے کہا میاں جی گھنٹہ بھر میں تمہارا جہاز تہران جاتا ہے اور ہوٹل تور والے خالی کمرے کے ساڑھے چار سو ریال روزانہ لیتے ہیں۔ لہٰذا در گزر۔ اپنے ہوٹل سے دس ریال کا ایک پکچر کارڈ لے لینا۔

پس ہم واپس آ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور مُسکرایا۔ اسے پہلے سے پتہ تھا کہ راستے سے واپس آ جائیں گے۔ سبھی یہی کرتے ہیں۔ دیکھنے کی صرف ایک چیز چھوٹی۔ عیسائیوں کی بستی جُلفہ (زلفہ)

ہمارے ٹیکسی والے نے کہا۔ "جناب وہاں کیا دھرا ہے، یہاں کسی نے کہا تھا جلفہ نہیں دیکھا تو اصفہان میں کیا دیکھا۔ اصل جلفہ آذربائیجان میں ہے۔ شاہ عباس صفوی نے وہاں سے عیسائی کاریگروں اور سوداگروں کو اصفہان میں لا کر بسایا تو اس بستی کا نام بھی جلفہ قرار پایا۔ اب یہاں پانچ ہزار عیسائی ہیں۔ اصفہان میں چھ ہزار یہودی بھی ہیں۔ اکبر کی طرح شاہ عباس کا مسلک بھی صلح کُل تھا۔ یوں تو جلفہ میں تیرہ گرجا ہیں لیکن سب سے اہم وہ ہے جو ۱۶۰۵ء میں تیّار ہوا۔

شہر اور ہوائی اڈے کے درمیان دریائے زندہ رود پڑتا ہے۔ اس پر تین پُل ہیں۔ اللہ وردی خاں پل ۳۸۸ گز لمبا ہے اور اس کی ۳۳ محرابیں ہیں۔ اوپر سے ۱۲ گز چوڑی سڑک گذرتی ہے اور پیدل چلنے والوں کے لئے دونوں طرف گیلریاں ہیں۔ اس سے جنوب کی طرف پُل خواجو ہے جو ان میں سب سے خوبصورت ہے۔ اس کی چھبیس محرابیں ہیں۔ لوگ شام کو یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہ پُل شاہ عباس صفوی نے سترھویں ویں صدی کے وسط میں بنایا تھا۔ اس سے آگے ایک اور بہت پرانا پُل، اور پھر شہرستان پُل جس کی بنیاد دو ہزار سال قبل ساسانیوں کے عہد میں پڑی۔ یہ سارے پُل فقط دیکھنے کی چیز نہیں کام کے ہیں۔

اے اصفہان نصف جہاں۔ جہاز پر سے تجھے ہم سلام کرتے ہیں۔ نیچے شہر ہے اور انواع میں کھیتوں کے بیچ بیچ میں وہ خشتی منارے جن میں سے بعض گیارہویں صدی عیسوی کی یادگار ہیں۔ ایسے منارے اس زمانے میں جبکہ نہ تار کا نظام تھا نہ ٹیلیفون یا وائرلیس کا، اس لئے بنائے جاتے تھے کہ محافظ اِن پر چڑھ کر نظر رکھیں کہیں غنیم تو نہیں آرہا؟ نادر شاہ کے لمحہ بہ لمحہ کُوچ کرنے کی خبر تو برابر دہلی پہنچتی تھی۔ لیکن محمد شاہ نے جو نادر شاہ کی چٹھی کو ایں دفترِ بے معنی، غرقِ مےَ ناب اولیٰ کر چکا تھا، ایک مستعد تیز نظر شخص کو ایک ایسے ہی منارے پر چڑھا رکھا تھا جو برابر اطلاع دے رہا

تھا۔ "حضور مجھے تو کُچھ نظر نہیں آتا۔ اگر نادر شاہ آ بھی رہا ہے تو ہنوز دلی دور است۔"

اصفہانیات

اصفہان کے لوگ ایران کے دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ ہوشیار، لطیفہ گو اور بذلہ سنج گنے جاتے ہیں۔ ایک دیہاتی بھائی اصفہان جانے لگے تو دوستوں نے فرمائش کی کہ میاں وہاں سے کوئی اور نشانی تو کیا لاؤ گے سُنا ہے اصفہان والے چٹکلہ چھوڑنے میں جواب نہیں رکھتے۔ بس کوئی اچھا سا چُٹکلہ لے آنا۔

سو یہ حضرت اصفہان گئے۔ سیر کی۔ جو کاروبار سر انجام دینا تھا دیا۔ ہوائی اڈّے پر ٹیکسی میں واپس آ رہے تھے کہ یک لخت دوستوں کی فرمائش یاد آ گئی۔

ڈرائیور نے چہرے سے گھبراہٹ بھانپ کر کہا۔ "جناب عالی۔ قربانت شوم۔ کیا

بات ہے؟“

بولے۔ ”ایک ضروری بات بھول گیا تھا۔ میرے دوستوں نے کہا تھا کہ اصفہان کی نشانی کوئی چُٹکلہ لانا اور میں خالی واپس جارہا ہوں۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”واہ اس میں کیا بات ہے۔ میں ایک لطیفہ کہتا ہوں۔ لطیفہ کیا ہے پہیلی ہے۔ تم بُوجھو۔“

دیہاتی نے ہمہ تن متوجّہ ہوکر کہا۔ ”چشم۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ کون شخص ہے جو میرے باپ کا بیٹا ہے لیکن میرا بھائی نہیں ہے؟“

دیہاتی نے بہت سوچا۔ بہت سوچا۔ آخر کہا ”میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ آپ ہی بتایئے؟“

ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ شخص میں خود ہوں کہ اپنے باپ کا بیٹا ہوں لیکن اپنا بھائی نہیں ہوں۔“

دہقانی آقا بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ ”بہت بہت شکریہ۔ جناب کا اسم شریف۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ''خاکسار کو علی اصغر کہتے ہیں۔''

واپسی پر جب دوستوں نے پوچھا حضرت کوئی چُٹکلہ لائے؟ تو یہ فخر سے بولے۔ ''ہاں ہاں بے شک۔ چُٹکلہ کیا ہے ایک پہیلی ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے وہی سوال دہرایا۔ ''وہ کون شخص ہے جو میرے باپ کا بیٹا ہے۔ لیکن میرا بھائی نہیں ہے۔''

دوست سر کھپا کر عاجز آگئے اور کہا۔ ''بھائی ہماری عقل کام نہیں کرتی۔ تمہی بتاؤ۔''

ان حضرت نے فخر سے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ اصفہان کا ایک ڈرائیور ہے علی اصغر نامی۔''

(۲)

ایک شخص کہ باہر کا تھا اصفہان میں خریداری کے لئے گیا۔ مختلف دُکانوں اور بازاروں کے چکّر کاٹتا جب سرائے میں واپس پہنچا تو اسے یاد آیا کہ چھتری کہیں بھول آیا ہوں۔ لیکن کہاں۔۔۔ یہ یاد نہ پڑتا تھا۔

ایک دُکان پر پوچھا تو انہوں نے کہا آپ یہاں کُچھ نہیں چھوڑ کر گئے۔ دوسرے نے بھی یہی کہا کہ ہم نے نہیں دیکھی۔ تیسرے نے بھی کہا یہاں نہیں آپ کہیں اور

بھولے ہوں گے۔ چوتھے کا جواب بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جب پانچویں دُکان پر پہنچا اور پوچھا تو دکاندار نے کہا، "ہاں صاحب یہ رہی آپ کی چھتری۔"

اس مرد دانا نے کہا۔۔ "عجیب شہر ہے۔ پانچ دُکانداروں میں فقط ایک ایسا ایماندار نکلتا ہے کہ کھوئی ہوئی چیز واپس کرتا ہے۔"
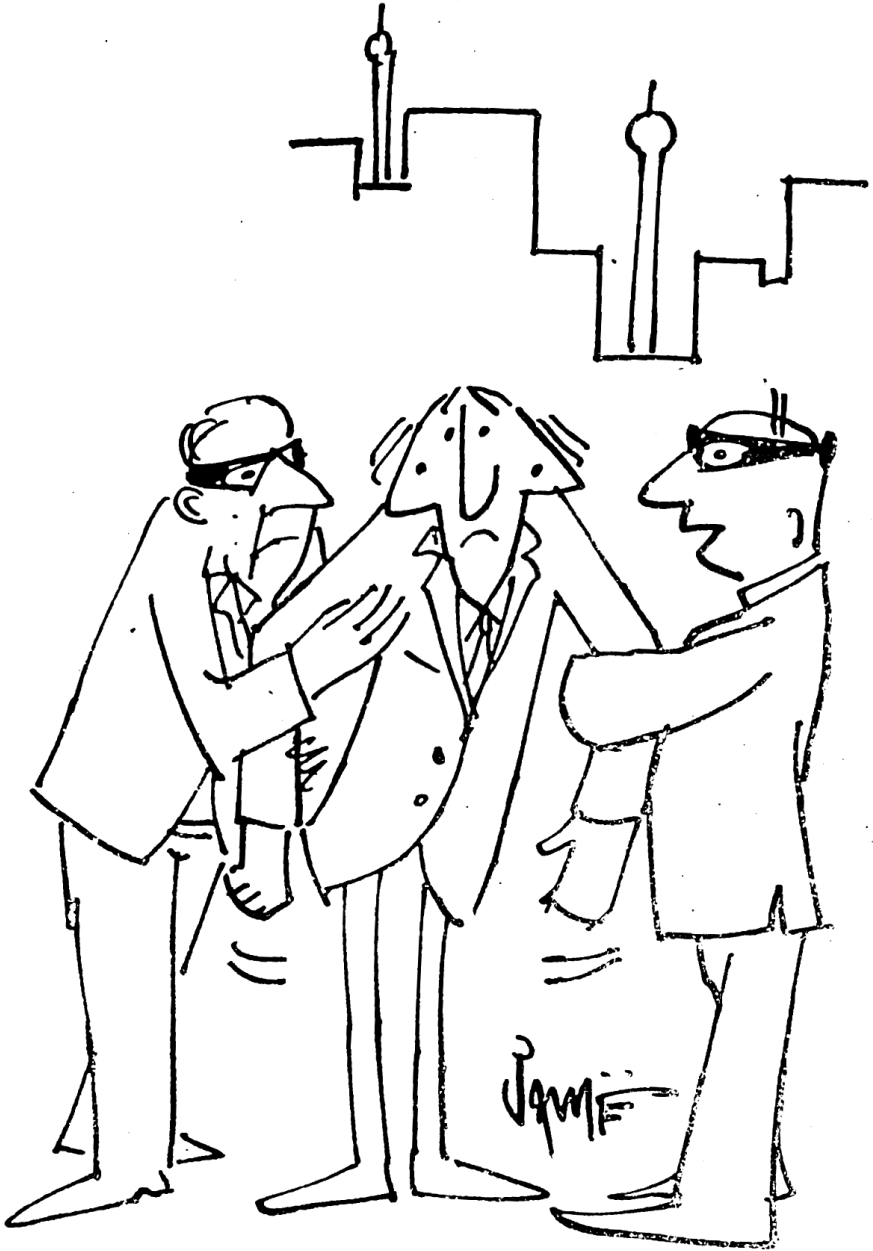
حادثہ منوچہری اسٹریٹ کا

آپ کبھی مسافر کی جوَن میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُترے ہیں؟ ایک تانگے والا آپ کا بُقچہ لیے اُڑا جارہا ہے۔ دوسرے نے صراحی جو آپ نے بہاولپور کے اسٹیشن سے خریدی ہے، سیٹ کے نیچے رکھ کے بھاٹی لوہاری کی آواز لگانی شروع کر دی ہے۔ آپ کے ہری چھال کے کیلے تیسرے کے قبضے میں ہیں اور طوطے کا پنجرہ چوتھے کی تحویل میں۔ اور پانچواں خود آپ کی کولی بھرنے کی فکر میں ہے کہ قبلہ آیئے، ادھر قدم رنجہ فرمایئے ع

اڑائے کچھ ورق لالے نے کُچھ سُنبل نے کُچھ گُل نے

اصفہان کا جہاز تہران کے ہوائی اڈّے پر پہنچا تو ٹیکسی والوں کی چھینا جھپٹی کا یہی عالم تھا۔ ہمارے پاس فقط ایک بُقچہ تھا جو ایک بھلے مانس نے ہتھیا لیا۔ دوسرے نے بغل میں طوطا کہانی باتصویر کھینچ لی۔ ٹوپی سر پر نہیں تھی لہٰذا تیسرا بہت مایوس ہوا۔ طوطا کہانی بھی ہم نے بازیاب کر لی۔ اور بُقچے والا ہمیں اپنی رکاب میں لیے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر آداب بجالانے لگا۔

ہم نے کہا۔ ”چند؟“یعنی آپ کے ساتھ جانے کا ہدیہ کس قدر ہو گا؟

بولا۔ ”قربانت شوم۔ فقط پونزدہ تومان“یعنی آپ روز کے گاہک ہیں۔ آپ سے کیا زیادہ لے سکتا ہوں؟ بس پندرہ تومان۔“ ہم نے عرض کیا۔ ”آقائے رانندہ۔“ ہم اجنبی نہیں۔ ہماری تو زندگی ایران میں گزری ہے۔ ہمیں معلوم ہے پانچ تومان کرایہ مقرّر ہے۔ یہ منظور ہے تو بسم اللہ ورنہ شمابہ سلامت مابخیر۔“

فرمایا۔ ”دس تومان تو دیجیے گا۔ اتنی دور ہے آخر۔“

ہم نے کہا۔ ”پانچ تومان۔“

اس بھلے مانس نے کہا تو پھر یہ لیجیے بُقچہ۔ چنانچہ وہ کسی دوسری سواری کی تلاش میں بھاگ گیا۔

آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "اچھا صاحب بیٹھیے۔"

اس پر بھی ہم نے اثنائے راہ میں باتوں باتوں میں واضح کر دیا کہ ہماری عمر کا زیادہ تر حصّہ ایران بالخصوص تہران میں گزرا ہے۔ لہٰذا ہم بڑے گھاگ مسافر ہیں۔ جپّے جپّے سے واقف ہیں اور بیسیوں سے ہمارا لنگوٹی کا یارانہ ہے۔ لہٰذا زیادہ مانگ کر شرمندہ نہ ہوں اور جھانسہ دینے کی کوشش نہ کریں۔ بایںہمہ ہم یونیورسٹی سے ذرا آگے نکلے تو اس نے تمہید باندھنی شروع کی کہ جناب آپ تو بہت ہی رحم دل اور سیر چشم معلوم ہوتے ہیں، اور آپ کی فارسی تو سبحان اللہ ہے اور میں تو آپ کی شخصیت کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ آپ کو ہوٹل پر اُتارنے کیلئے اندر گلی میں جانا پڑے گا۔ دس نہیں تو آٹھ تومان دے کر ممنون فرمایئے گا۔

ہم نے کہا۔ "دیکھو برادر، قولِ مرداں جان دارد۔ جو بات مُنہ سے نکل گئی ہمارے لئے پتھّر کی لکیر ہوتی ہے۔ ہم نے پانچ تومان کہہ دیے سو کہہ دیے۔ اس سے کم یا زیادہ، خصوصاً زیادہ ممکن نہیں۔

پھر بھی وہی ایک گول جیتا، یعنی چھ تومان لے گیا۔ اب پھر ہم تھے اور ہتل ماژستیک (جسے ہم اپنے قاعدے سے ہوٹل میجسٹک لکھیں گے)۔ انسان بھی کیا پکھیرو ہے۔ ابھی کل صُبح ہم یہاں سے گئے تھے اور ایک رات باہر گذار کر یادش بخیر پھر اِسی آشیانے میں آ بیٹھے ہیں۔ اور اس رات بیچ کے عرصے میں حافظ سعدی اور ٹیکسی ڈرائیور منصور کا شہر شیراز بھی دیکھا اور دارا کا اُجڑا دیار تختِ جمشید بھی۔ شاہ عباس صفوی حاجی بابا اور مرتضیٰ نکوئی کے بلدۂ فرخندہ بنیاد اصفہان کے کوچہ بازار بھی گھوم آئے اور مینارِ لرزاں کے نظّارے سے بھی آنکھیں روشن کیں۔ میاں آزاد، یہ سب ان کَل کے گھوڑوں کی برکت ہے کہ آج ہم ابنِ بطوطہ اور مارکوپولو کی چھاتی پر بیٹھے مونگ دَل رہے ہیں۔

ہاتھ مُنہ دھو کے سوچا کہ ایک چکّر باہر کا ہونا چاہیے تاکہ کسل مندی کُچھ دور ہو۔ گھر سے نکل میدانِ فردوسی پر آئے۔ آج بازار کچھ سُونا سُونا تھا۔ سیدھے خیابانِ فردوسی پر ہولیے۔ صرّافوں کی دُکانیں کُچھ کھلی تھیں کُچھ بند۔ آگے جہاں برطانیہ کی تاریخی سفارتخانے کی سرحد شروع ہوتی ہے، ہم منوچہری اسٹریٹ پر مُڑ گئے جو آگے لالہ زار سے جا ملتی ہے۔ اور لالہ زار پر زیادہ رونق کا ہونا یقینی تھا۔

یہاں وہ واقعہ پیش آیا جسے ہم خیابان منوچہری کا حادثہ کہتے ہیں۔ خیابان منوچہری

اپنے طور پر خاصا اہم اور آباد بازار ہے۔ شاید آٹھ بجے کا عمل ہو گا۔ کُچھ دُکانیں کھلی تھیں، کُچھ بند تھیں، اور کُچھ بند ہو رہی تھیں۔ اِکّا دُکّا لوگ آ جا رہے تھے۔ دو صاحبوں نے یک لخت دُور سے نزدیک آ کر کُچھ کہا جسے ہم نے سلامِ شوق سمجھا اور جواباً نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔ "وعلیکم السلام۔ آقا چطور ہستید بسلامت بخیر۔" ایک صاحب ان میں سے خاصے کیم شیم تھے۔ دوسرے ذرا دُبلے اور ٹھنگنے۔ پہلے صاحب کی صورت کچھ آشنا معلوم ہوتی تھی، لہٰذا ہم نے قیاس کیا کہ کوئی جاننے والا ہے جو ہمیں پہچان رہا ہے اور ہم اسے پہچان نہیں رہے جو بڑے شرم کی بات ہے۔ لہٰذا اظاہر یہی کیا جائے کہ ہم بھی پہچان رہے ہیں۔ پس ہم نے مصافحہ کیا اور زیادہ خلوص برتا اور پوچھا کِدھر کی سیریں ہو رہی ہیں جناب؟ ہم تو ذرا شیراز اور اصفہان تک گئے تھے۔ اور یہ صاحب کون ہیں؟

بولے۔ ہاں ہاں۔ ان سے ملو۔ یہ ہمارے دوست ہیں۔ پتہ نہیں کیا نام بتایا۔ یا کُچھ بتایا کہ نہیں۔ جب کوئی انسان خلوص سے گفتگو کر رہا ہو تو بہت سی باتیں فرض کر لیتا ہے اور دوسرے کی باتیں غور سے سُننے کے بجائے اپنی کہے جاتا ہے۔ جیسے وہ دو بہروں کا قصّہ ہے کہ ایک نے سرِ راہ دوسرے کو روک کر کہا مزاج کیسے ہیں؟ بولا بازار سے بینگن لا رہا ہوں۔ پہلا بولا اور بیوی بچّے تو بخیر ہیں نا؟ دوسرے نے تُرنت

جواب دیا۔ ابھی جاکر سب کا بھرَ تابناؤں گا۔

یہ دوسرے صاحب ان سے بھی زیادہ خلیق اور متواضع نکلے۔ ہمارا ایک ہاتھ تو مصافحہ کی غرض سے پہلے صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرا ان صاحب نے لے لیا اور خوب بھینچ بھینچ کر مُسکرانے لگے۔ اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ وہ مصافحہ وغیرہ کو کافی نہ سمجھ کر معانقے کی منزل میں پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ذرا زیادتی تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنے ہاتھ ذرا اکڑا لیے۔ موٹے صاحب ہمارا بایاں ہاتھ تھامے تھے۔ یکایک ہم نے محسوس کیا کہ ہماری گھڑی جو ہم نے پار سال ایمسٹرڈیم سے خریدی تھی، ڈھیلی ہو رہی ہے۔ اور پھر اس کا تسمہ کھُل گیا اور ان صاحب کی انگلی اس تسمے پر تھی۔ چشم زدِن میں صورتحال ہم پر کھُل گئی اور ہمارے منہ سے نکلا۔ ”چہ می کنی، چہ می کنی۔“

اس کے بعد ہم سے جو کچھ سرزد ہوا وہ اختیاری سے زیادہ اضطراری تھا۔ ہم نے اپنا داہنا ہاتھ ایک جھٹکے سے ان ٹھنگنے صاحب کی گرفت سے آزاد کیا اور موٹے صاحب کے گال پر ایک تھپڑ دیا۔ اور اس سے فارغ ہو کر گھڑی اپنی گرفت میں لے لی۔

ٹھنگنے صاحب تماشا بگِڑتا دیکھ کے فوراً کھسک لیے۔ موٹے صاحب نے بھی محسوس

کیا کہ اب چلنا چاہیے کیونکہ چند گز کے فاصلے پر دوسرے راہگیر دِکھائی دے رہے تھے۔ اب ہم خود شیر ہو گئے کہ یہ لوگ جانے نہ پائیں۔ لہٰذا چلّا کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہیے۔ لیکن عین اس ڈرامائی موقع پر آقائے ابن انشا کی فارسی تمام ہو گئی۔

چور کو فارسی میں دُزد کہتے ہیں اور بالکل سامنے کا لفظ ہے۔ لیکن کمبخت اس وقت یاد نہ آرہا تھا لہٰذا ہم نے آوازہ لگایا۔

"ایں سارق است، بگیرید بگرید"

سارق کا مطلب بھی چور ہے، لیکن عربی میں۔ اور بگیرید بگیرید کے متعلّق ہم کہہ نہیں سکتے کہ یہ محاورہ جدید فارسی میں پکڑو پکڑو کا مفہوم ادا کرتا ہے کہ نہیں۔ بہرحال کوئی مدد کو نہ آیا۔ اب ہم نے اپنی فریاد جاری رکھی اور اس مرد مشیّن کا پیچھا شروع کیا۔ اس پر وہ ٹھٹک گیا اور جیب کی طرف اشارہ کر کے چاقو گھونپنے کا اشارہ دیا۔ یعنی چاقو نکالا نہیں فقط یہ بتایا کہ اب کے آواز دی تو نکالوں گا۔ لہٰذا اپنا بُرا بھلا سمجھ لو۔

ہم نے کہا۔ میاں آزاد۔ گھڑی تمہاری بچ گئی اور معانقہ تم نے ہونے نہیں دیا جس کی وجہ سے جیب کی نقدی اور ٹریولر چیک بھی سلامت ہیں خُدا کا شکر ادا کرو۔ اسے

پکڑ بھی لیا تو فارسی بولنی پڑے گی۔ اور تھانے جانا پڑا تو بے کار کا فضیحتہ اور ہو گا۔ لٰہذا تم اپنے گھر وہ اپنے گھر۔ دو بھلے مانس عینک پوش جا رہے تھے۔ ان کو روک کے ہم نے ماجرا عرض کیا کہ جناب اس سڑک پر ابھی یہ عجیب واردات ہو گئی ہے۔ بولے گھڑی گئی یا سلامت ہے؟ ہم نے کہا سلامت۔ بولے بس آئندہ احتیاط رکھو، اجنبیوں سے اتنا خلوص مت برتا کرو۔ آگے سردار جی نظر آئے۔ پہلے سوچا ان سے دردِ دل بیان کیا جائے اور ہمیں یقین ہے سردار جی ہمارے ساتھ چور کو اس کے گھر تک پہنچانے پر بھی آمادہ ہو جاتے۔ لیکن ہماری طبیعت میں خدا ترسی ہے جسے بعض نا فہم کبھی کبھی بُزدلی بھی سمجھ لیتے ہیں۔

ہمارے دوست میاں ہوشنگ البتہ بہت جُز بُز ہوئے اور اپنے ابنائے قوم کی اس حرکت پر نادم نظر آتے تھے۔ ہم نے دِلاسا دیا کہ بھائی ایسے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں، اور خصوصاً بڑے شہروں میں۔ اس کا ثبوت ایک مَن چلے نے لاہور میں مہیّا کیا اور اسے ہم وزیر خاں مسجد کا حادثہ کہیں گے۔

میاں ہوشنگ ہماری ایران سے واپسی کے چند روز بعد پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں تو ہمارے ساتھ تھے۔ لاہور گئے تو ہم نے ایک صاحب کو لکھ دیا کہ ان کو خوب سیر کرانا اور شہر دِکھانا، اور دیکھو یہ ہمارے مہمان ہیں۔ چنانچہ وہ ہار گلدستے

اور بینڈ باجے لے کر بہت سی خواتین و حضرات کے ہمراہ لاہور ائیر پورٹ پر ان کا استقبال کرنے پہنچ گئے۔ بے چارا ہوشنگ حیران کہ یہ کیا ہے۔

اگلے روز انہوں نے قلعہ اور شاہی مسجد دِکھائی، کھانا کھلایا، فارسی خوانوں سے ملایا اور ایرانیوں اور پاکستانیوں کی دوستی کا آلھا گایا۔ پھر بولے وزیر خاں مسجد ضرور دیکھو۔ تاریخی مسجد ہے اور اس کے بُرج تو ایسے خوبصورت ہیں کہ۔۔۔ سو یہ دونوں صاحب اندر گئے اور اس کے کتبوں اور محرابوں کی خوبصورتی پر عش عش کرتے باہر نکلے تو ہوشنگ میاں کو اپنا وہ نفیس جُوتا کہیں نظر نہ آیا جو انہوں نے کراچی سے بڑے چاؤ سے خرید اتھا۔

بہت ڈھونڈا لیکن ہوتا تو ملتا۔ ہمارے دوست پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ انہوں نے دیکھا آس پاس کہیں کوئی جوتوں کی دُکان بھی نظر نہ آئی۔ معلوم ہوا دور نکل کر ڈبّی بازار جانا پڑے گا۔ ہمارے دوست کے پاؤں چھوٹے تھے ورنہ وہ اپنا جوتا ہوشنگ کو پہناتے۔ آخر بازار میں اُترے تو ایک شناسا چپل پہنے جاتے نظر آئے۔ ان کو روک کر ان کی چپل اُتروائی جو ہوشنگ کے پاؤں سے چار چھ انگل بڑی تھی۔ بہر حال دُکان پر گئے اور ان صاحب نے اپنی گرہ سے ایک پمپ شو خرید کر ان کی نذر کیا۔

بگیرید بگیرید
...... آں سارق است
چور است .....
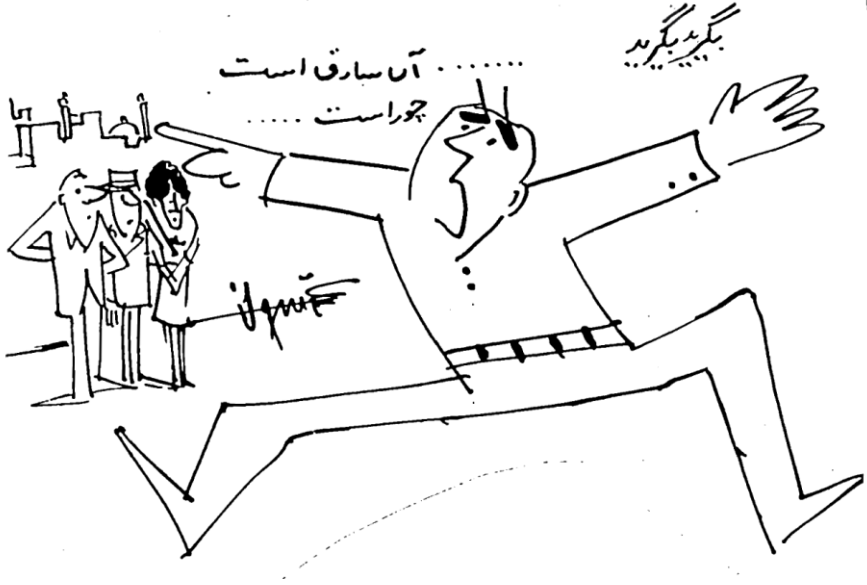
رے۔ نگری امام رازی کی

تہران کی تاریخ پڑھیے تو یہ لکھا ملتا ہے کہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، شہر رے کے نواحات میں۔ اب رے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ عظیم الشّان شہر تہران کے مضافات میں۔ کبھی کے دِن بڑے کبھی کی راتیں۔ کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ چھوٹی سی میونسپلٹی۔ سڑکیں زیادہ تر کچّی۔ چونکہ شاہ عبدالعظیم کا مزار یہاں ہے اور بعض دیگر اکابر کے مقبرے بھی، لہٰذا تقدس کی وجہ سے یہاں سنیما بنانے کی اجازت بھی نہیں۔ اور تو اور شہر کے اندر کاریں اور بسیں بھی نہیں چلتیں۔ بہت

پھٹیچر سی گھوڑا گاڑی چلتی ہے، ہمارے اِکّے سے بہتر لیکن وکٹوریہ سے گھٹیا۔ اسے درشکہ کہتے ہیں جو روسی زبان کا لفظ ہے۔

رے کے نام سے شناسائی تو بچپن سے تھی۔ یاد ہے عمر کے بارہویں سال میں تھے کہ امام فخر الدّین رازی کے حالات پڑھے۔ طوسی اور ابوریحان البیرونی کے بھی۔ ان تینوں کے فلسفے اور حکمت سے ہم اِس وقت بھی نابلد تھے، اور اب بھی ہیں۔ لیکن امام رازی بڑے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ پھر علامہ اقبال کے پیہم رگیدنے نے انہیں بھولنے نہیں دیا۔ علامہ موصوف غالبؔ کے طرف دار تھے، یعنی رومی کے حامی تھے جو ان کے لئے عشق و وجدان کا بروز ہے۔ رازی کو اس کے لئے تعقل اور تفلسف کی وجہ سے گھاس نہ ڈالتے تھے۔ جہاں غریب کا ذکر کیا ہے بہ بدی ہی کیا ہے۔

یہاں ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ایران جانے تک ہمیں معلوم نہ تھا کہ شہر رے ہے کہاں۔ معلوم ہوا تو امام رازی کے مزار کی زیارت کا شوق بھی ہوا۔ لیکن معلوم یوں ہوا کہ ہم نے ہوشنگ سے کئی بار کہا کہ دروازہ عبد العظیم کہاں ہے؟ چل کے دکھاؤ۔ بولے اوّل تو مُجھے معلوم نہیں۔ دوسرے تم کیا کروگے دیکھ کر؟ آخر ہم نے اُن سے کہہ ہی دیا کہ جناب ہم دروازہ عبد العظیم دیکھ کے رہیں گے۔

ہمارے دوست جون ایلیا کے رسالہ انشا میں علی اصغر بر جردی کی داستان چھپتی رہی ہے جو معصوم نو عمر لڑکوں کو اس دروازے کے نواحات سے گھیر گھار کے لے جاتا تھا اور ان کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے بعد شتر خون کے خرابوں میں لے جا کر قتل کر دیتا تھا۔ یہ داستان عجیب داستان تھی۔ اس شقی القلب نے بہت معصوموں کا خون پیا اور بہت سے گھروں کے چراغ گُل کئے۔

ہوشنگ نے کہا ہاں اس کا قصّہ ہمیں معلوم ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا جب اُسے پھانسی دی گئی تھی اور سارے شہر میں اس کے جرائم کا غلغلہ تھا۔ پھر بولے، شاہ عبدالعظیم کی درگاہ تو رے میں ہے اور وہیں ناصر الدّین قاچار کا مقبرہ بھی اور رضا شاہ کبیر کا بھی اور برج طغرل بھی۔ میں بہت دِن سے اُدھر نہیں گیا۔ چلیں گے کسی سے پوچھیں گے کہ دروازہ عبدالعظیم کون سا ہے اور خرابہ ہائے شتر خون کہاں ہیں۔

آخر ایک روز ہم نے ٹیکسی لی اور شہر رے سدھارے اور تین پراتم بُڈّھوں سے دروازہ عبدالعظیم کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ جس زمانے میں لاہور کی طرح شہر میں دروازے ہوتے تھے تو وہ دروازہ جو درگاہ شاہ عبدالعظیم کے رُخ پر تھا، دروازہ عبدالعظیم کہلاتا تھا۔ اب وہاں میدان شوش نامی چوک ہے۔ میدان مخبر الدّولہ سے کتابوں کے بازار شاہ آباد ہوتے ہوئے میدان بہارستان آیئے جہاں مجلس شورائے

ملّی اور مسجد سپہ سالار ہیں۔ وہاں سے لمبی خیابان سروس میدان شوش لے جائے گی۔ وہاں سے آپ رے کی سڑک لیجیے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بارش شروع ہو گئی اور اس روز سردی بھی چمکی۔ یہ دسمبر کے آخری ایّام کا ذکر ہے۔ میدان شوش سے آگے جا کر بائیں ہاتھ ویرانے کا سلسلہ شروع ہوا اور داہنے ہاتھ کچھ سرائے نما مکانات اور اُن کے پیچھے اینٹوں کے بھٹوں کی قطار نظر آئی۔ معلوم ہوا یہ مکانات اُن مزدوروں کی بیرکیں تھے جنہوں نے پہلی راہ آہن یعنی ریلوے لائن تعمیر کرائی تھی اور خرابہ ہائے شتر خون ان کے پیچھے یا پھر سڑک کے بائیں جانب ریلوے لائن کے نیچے ہیں۔ یا پھر دونوں جگہیں اِن خرابوں کی تعریف میں آتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ قطعیت سے کوئی شخص نہ بتا سکا کہ وہ خاص جگہ اور ویران حُجرے کہاں تھے جہاں علی اصغر برجردی جرائم کا ارتکاب کرتا تھا۔ کہتے ہیں ایک متروکہ سرائے میدان شوش کے نواحات میں تھی جو اب نہیں ہے۔ وہاں یہ سب کُچھ ہوتا تھا۔

ایران میں پہلی ریل ۱۸۸۸ء میں تہران اور رے کے درمیان بنی۔ یہ کوئی چھ میل کا ٹکڑا ہو گا اور اس کی کہانی دلچسپ ہے۔ یہ بلجیمی انجنیئروں نے بنائی تھی۔ رضا شاہ کبیر کے انقلاب سے قبل بلکہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے ایران کا احوال عجب تھا۔ قاچاروں کا آخری ناکارہ بادشاہ نام کو حکمران تھا، ورنہ روس (زار والا روس) بلجیم اور

برطانیہ قابض تھے۔ چنگی اور ڈاک خانے بلجیم والوں کے تصرّف میں تھے۔ تار برقی کا نظام اینگلو ایرانین کمپنی کے ہاتھ میں تھا۔ محکمہ کوتوالی پر اہلِ سوئٹزر لینڈ کا قبضہ تھا، اور کالجوں، اسپتالوں پر فرانسیسیوں کا راج۔ عمّالِ حکومت میں سے کچھ روس کے وظیفہ خوار تھے، کچھ برطانیہ سے رشوت کھاتے تھے۔ سب کو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ سماجی زندگی پر مُلّاؤں کا قبضہ تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے کی جدوجہد سے جسے مشروطہ کہتے ہیں، اس صدی کے شروع میں مجلس یعنی پارلیمنٹ بن گئی تھی لیکن اس کی زیادہ چلتی نہیں تھی۔ ناکارہ بادشاہ کے حواری اور حاشیہ بردار سازشیں کرتے رہتے تھے۔ مارگن شوستر ایک امریکی ماہر مالیات کو مجلس نے بُلا کر رکھا کہ صورتحال کی اصلاح ہو تو یہ اس کے بھی درپے ہو گئے اور ۱۹۱۲ء میں اسے بیرونی طاقتوں اور ان کے ایجنٹوں نے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی کتاب (جس کا ایک زمانے میں فغانِ ایران کے نام سے اُردُو میں ترجمہ ہوا تھا) پڑھنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ بالکل دربار حرام پور کا نقشہ تھا۔

ہاں تو قصّہ ریل کا تھا۔ یہ دھوئیں کی گاڑی کُچھ دِنوں تو کراچی اور مالیر کی لوکل کی طرح (اتنا ہی فاصلہ سمجھیے) دوڑتی رہی لیکن ایک روز قضائے الٰہی سے ایک مسلمان ڈبّے سے گر کر جاں بحق ہو گیا۔ مجتہدین عظّام نے حکم دیا کہ یہ شیطان کا چرخہ ہے،

ریل کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اس کی فوراً تعمیل ہوئی اور ریل کی پوری پٹڑی اُکھاڑ کے پھینک دی گئی۔ ایک روسی انجنیئر بھی مارا گیا۔ حکومت کو روسیوں اور بلجیم والوں کو اس کا بہت بڑا تاوان دینا پڑا۔ مجتہدوں اور مولویوں کا اثر رضا شاہ کبیر نے رفتہ رفتہ توڑا اور اس کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے ورنہ آج کے ایران، کم از کم تہران کی ماڈرن زندگی پر متحیّر ہونے والے کو معلوم ہو کہ رابرٹ ڈبلیو ایمری نامی امریکی نائب سفیر کو محض اس لیے جان سے ہاتھ دھونے پڑے کہ وہ ایک بزرگ کے مقبرے کے قریب کُچھ ایرانی عورتوں کے جو چادر میں ملبوس تھیں، فوٹو لے رہا تھا۔

شہر کا یہ حصّہ جس سے ہم گُزر رہے تھے خاصا گندہ تھا۔ معلوم ہوا سرکاری مہمانوں کے لئے جو رضا شاہ کبیر کے مقبرے پر پھول چڑھانے جاتے ہیں، ایک الگ اور عمدہ سڑک نکالی گئی ہے جو عام استعمال کے لئے نہیں۔ اس پر سے جاتے ہوئے یہ نظر آشوب نظّارے نہیں دکھائی دیتے۔ یہ بات ہمیں ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے بتائی۔ آخر آبادی شروع ہوئی اور ریلوے کا وہ پرانا اسٹیشن بھی دکھائی دیا جو پرانی ریل اُکھڑنے کے وقت سے متروک الاستعمال ہے۔ زنگ آلودہ پٹڑی کا بہت سا حصّہ اب بھی باقی ہے۔ ٹیکسی جس اڈّے پر آکر رُکی وہ ٹیکسیوں کا نہیں گھوڑا گاڑیوں کا اڈّہ تھا۔

ارد گرد کا ماحول لی مارکیٹ اور چاکیواڑہ کے نواحات کی یاد دلاتا تھا۔ بارش کی وجہ سے کیچڑ بھی ہو گیا تھا۔ سامنے مسقف بازار کی وہ محراب نظر آرہی تھی جس میں سے گُزر کر شاہ عبد العظیم پہنچتے ہیں (وہاں اسے مقبرہ یا درگاہ کہنے کے بجائے فقط شاہ عبد العظیم کہتے ہیں)۔ زیادہ تر دُکانیں کھیل کھانوں اور مٹھائی والوں کی تھیں کہ لوگ مزار پر چڑھانے کے لئے لیتے ہیں۔ دودھ دہی والے بھی کُچھ لوگ تھے۔ کُچھ چوڑیوں والے اور بساطی بھی۔ لیکن سب معمولی قسم کی دُکانیں تھیں۔ کوئی جدید قسم کا مُجلّا دُکان نظر نہ آئی۔ دعا دینے والے اور خیرات مانگنے والے یہیں سے شروع ہو گئے تھے۔ تو گویا یہ تھا شہر رے۔

سچ یہ ہے کہ اب رے کہنے والے بھی بہت کم ہیں۔ عموماً اس سارے قصبے کو حضرت عبد العظیم کہتے ہیں۔ بلکہ عوام شاہد و لعظیم (شاہ عبد العظیم) کہتے ہیں۔ آبادی اتنی لگتی نہیں لیکن کہتے ہیں بیس ہزار کے قریب ہے۔ البتّہ مُغلوں کے حملے کے زمانے کی لہر بہر اور رونق کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک ہفتہ کے عرصے میں سات لاکھ آدمی اِن وحشیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے۔ مشہور مؤرّخ جوینی نے تیرہویں صدی عیسوی کے وسط کے اس سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مغلوں کے بے اماں لشکریوں نے باشندے بے دریغ تہ تیغ کیے اور باغوں و کھیتوں

کو اُجاڑ ڈالا۔ شہر کا بیشتر حصّہ نذرِ آتش کیا اور بہتوں کو پکڑ کر ساتھ لے گئے۔ ایک تہائی آبادی نے جس میں مرد عورتیں بچّے بھی شامل ہیں، موت کا جام پیا۔ کسی کے خیال میں نہ آسکتا تھا کہ ایسی تباہی کے بعد ایرانی پھر حیاتِ نَو حاصل کر سکیں گے۔"

لیکن اب درگاہ آگئی تھی۔ سیاہ عبا پوش خدام نے جو گائیڈ کا کام دیتے ہیں، ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہوشنگ نے جلانے کی خوشبودار بتّیاں بازار سے لے لی تھیں۔ بڑے اور اُونچے صدر دروازے میں سے گزر کر ہم صحن میں داخل ہوئے۔ داہنے ہاتھ کی محرابوں میں سے ایک اور طرف راستہ جاتا تھا جس میں قبروں کے آثار نظر آرہے تھے۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک فوّارہ نما اونچا منارہ تھا جس میں بتّیاں جلاتے تھے۔ زیادہ تر لوگ تو (جیسا کہ ہم نے کیا) یہ بتّیاں خود جلانے کے بجائے خدّام کو دے دیتے ہیں اور وہ اسے اپنی جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ اب بعد میں اگر وہ نہ جلائیں تو ان کا ایمان۔

اونٹوں کے لئے تیل، موٹر خانے کے لئے بھوسہ

جب مارگن شوستر امریکی ماہر پہلی جنگ عظیم سے قبل مجلس ملّی کے بلانے پر ایران کی مالیات سدھارنے کے لیے وزیرِ مالیات بن کر آیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس

ملک کا کبھی بجٹ بنا ہی نہیں۔ جو چاہتا خزانے سے روپیہ لے لیتا۔ اور خزانہ ختم ہو جاتا تو لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر کے یا کسی بیرونی ملک سے قرضہ لے کر کام چلایا جاتا۔ ایک روز اُس کے سامنے ایک کاغذ آیا کہ شاہی شُتر خانے کے لیے تیل چاہیے اور سرکاری موٹر خانے کے لیے بھوسہ۔ مارگن شوستر بہت بگڑا کہ یہ کیا مذاق ہے۔ یہ میرے عہدے کی انتہائی تذلیل ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ جلد نرم اور چکنی رکھنے کے لئے ایک خاص قسم کا تیل اونٹوں کے بدن پر ملا جاتا ہے اور شاہی موٹر خانے کے ملازمین کو تنخواہیں چارے یعنی بھوسے کی صورت میں دی جاتی ہیں۔

مینار طغرل

رے میں درگاہ : عبد العظیم
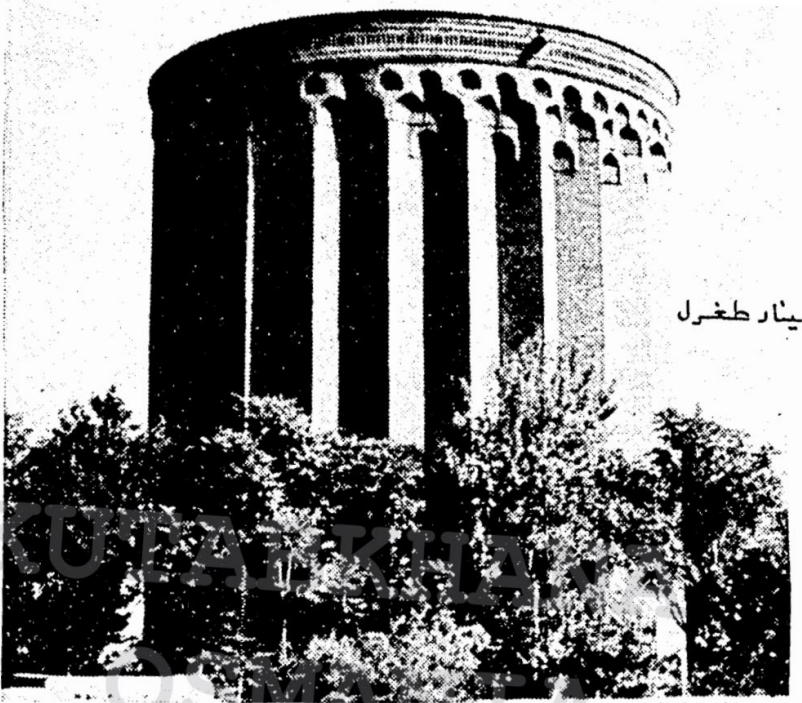
شاہ عبد العظیم سے مینارِ طغرل تک

کوئی تقریب نہ تھی لیکن زائرین کا ہجوم برابر تھا۔ شاہ عبد العظیم کا سنہری کلس چمچما رہا تھا۔ معلوم ہوا اس پر عقیدت مندوں نے سونا چڑھایا تھا۔ بادشاہ اس زیارت گاہ کے جوار میں دفن ہونا باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ حتّٰی کہ رضا شاہ کبیر نے بھی اِسی کے قرب میں جگہ پائی، اگرچہ وہ درگاہ کے احاطے سے باہر ہے۔ جمال الدّین افغانی کو جب ناصر الدّین قاچار سے گزند کا اندیشہ ہوا تو وہ اِسی درگاہ میں آ کے مقیم ہوئے کہ روایتی طور پر جائے اماں ہے۔ یہاں وہ سات مہینے رہے۔ یہیں اُن کے معتمدین

اُن سے ملتے اور ہدایات لیتے۔ آخر شاہ نے پانچ سو سواروں کا ایک دستہ بھیجا جو سیّد صاحب کو عین بیماری کی حالت میں پناہ کی صدیوں پرانی روایت کو توڑ کر کشاں کشاں لے گیا۔

مختصر قصّہ اس کا یہ ہے کہ ناصر الدّین قاچار جب یورپ گئے تو مغرب کی ترقّیوں سے متاثر ہوئے اور ایران کی ترقّی کا اُن کو بھی کُچھ خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ وہی سیّد جمال الدّین کو ساتھ لائے اور شرع میں اُن کی بہت عزّت و تکریم کی۔ لیکن سیّد صاحب تو اپنی دُھن کے پکّے تھے اور مغربی استعماریت کی بیخ کُنی اُن کا ایمان۔ جب ناصر الدّین نے تمباکو کی پوری کاشت اور خرید و فروخت کا اجارہ ایک انگریزی کمپنی کو دے دیا تو سیّد افغانی نے حجۃ الاسلام صدر مجتہدین حاجی مرزا حسن شیرازی کو لکھا کہ بادشاہ حکمرانی کی اہلیت نہیں رکھتا، عقل و شعور سے بے بہرہ ہے، رشوت کھاتا ہے۔ اس کا وزیر غدّار، ظالم اور غاصب ہے۔ ہمیں پچاس سال کے لیے غیر ملکیوں کا محتاج بنایا جا رہا ہے۔ لہٰذا اے مجتہدین اسلام! بیدار ہو جایئے اور عوام کا ساتھ دیجیے۔ اس پر تمباکو کے حرام ہونے کا فتویٰ جاری ہوا تھا اور لوگوں نے حقّے توڑ تاڑ پھینک دیے۔ آخر بادشاہ کو بھاری ہرجانہ ادا کر کے ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا۔

مقبرے کی عمارت کے ایک عقبی کمرے میں خدّام ہمیں لے گئے۔ چھوٹا سا کمرہ

تھا۔ بمشکل ۱۱ ضرب ۱۱ فٹ کا اور فرش سطح۔ ہاں، جابجا لوگوں کے نام لکھے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس فرش کے نیچے آرام فرما ہیں۔ اچھا تو یہ ہے عبد الفتوح رازی موصوف کا مرقد۔ یہ فلاں امام زادے کا۔ یہاں فلاں مجتہدین دفن ہیں۔ اتنے میں ہماری نظر دیوار پر پڑی جس پر اشعار کیا پورا قصیدہ لکھا تھا۔ ہم نے کہا یہ کیا؟ بولے یہ قاآنی کے اشعار ہیں اور زور سے پیر فرش پر مار کر کہا، یہ رہی قاآنی کی قبر۔ ہم نے سوچا چلو ایک شاعر ملا۔ خادم سے کہا جناب یوں زور سے پاؤں مت ماریے یہ بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا اور ہمارا شاعر بھائی تھا۔ ہم اس کی قبر پر ضرور فاتحہ پڑھیں گے۔ خادم نے ہمیں بنظرِ تعجّب دیکھا کہ شاعر کی قبر پر فاتحہ اور درود؟ اور کمرے سے باہر نکل گئے، فاتحہ میں شریک نہ ہوئے۔ خدا جانے کیا اسرار ہے؟ ہو سکتا ہے فاتحہ پڑھنے کا رواج نہ ہو یا پھر یہ رمز ہو کہ اگر ہر زائر کے ساتھ فاتحہ میں شریک ہونا پڑے تو ان کے ہاتھ برابر دُعا کے لیے اٹھے رہیں۔ افسوس قصیدہ ہم نے نقل نہیں کیا۔ قاآنی نے اپنی ہی شان میں کہہ رکھا ہے۔

روضے کے عقب سے ہو کر ہم اُس رُخ پر آئے جس کا مشرق و مغرب تو معلوم نہیں ہاں رضا شاہ کبیر کے مقبرے کے محاذی ہے۔ یہ ایک خاصا وسیع کمرہ تھا جس کے وسط میں ناصر شاہ قاچار کا مزار ہے اور اس کے اوپر اس کا لیٹا ہوا مجسّمہ جیسا کہ عموماً

اہرام سے نکلنے والے مقبروں میں ہم پاتے ہیں۔ یہ کمرہ آئینہ خانہ ہے اور روشنی میں جھمجھماتا ہے۔ اس میں بھی جا بجا دیگر مجتہدین اور شاہ مرحوم کے رشتہ داروں عزیزوں کی قبریں ہیں۔

خدّام نے بتایا کہ بادشاہ پاس والے حرم سے نکل کر یہاں اس جگہ پہنچا تھا کہ حملہ آور کی گولی نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ حملہ آور کا نام رضا کرمانی تھا۔ بہر حال اس کی پاداش میں جو دہشت و تشدّد کا بازار گرم ہوا اس میں بہت لوگ مارے گئے۔ اور چونکہ یہ مشہور ہو گیا تھا کہ حملہ آور بہائی ہے لہٰذا بہائیوں کی شامت آئی۔ اصل میں وہ حریّت پسند تھا اور سیّد جمال الدّین افغانی سے متاثر۔ کُچھ بھی ہو ناصر شاہ قاچار کے مرنے پر لوگوں نے یومِ نجات منایا۔ اس کے پیا نشین نالائق تھے اور عوام میں سیاسی شعور بڑھ رہا تھا، جس کی وجہ سے مشروطہ یعنی تحریک آزادی کو فروغ اور کامیابی نصیب ہوئی۔ بہر حال اس کمرے میں شاہ کو چُپ چاپ لیٹے دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ کیا عظمت و جبروت تھی اور اب کیا احوال ہے کہ ہم ایسے پردیسی بھی اُس کے جوار کو روندتے پھر رہے ہیں۔ آخر فنا آخر فنا۔

جی تو چاہتا تھا کہ رضا شاہ کبیر کا مقبرہ دیکھیں لیکن معلوم ہوا اس کے اندر جانے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے، سو وہ ہمارے پاس نہ تھی۔ باہر سے مقبرہ بہت

سادہ معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم اس بغلی صحن میں جا نکلے جس میں قبریں ہی قبریں ہیں۔ تعویذ تو اُن کے سطح زمین پر ہی ہیں، بلکہ تعویذ نہ کہیے فقط ناموں کے کتبے کہیے جِن کو خلقت روندتی پھرتی ہے۔ بعضوں نے اُن پر سائبان بھی کھڑے کر رکھے ہیں اور مرحوم عزیزوں کی عکسی تصویریں شیشے کے فریموں میں جڑوا کر آویزاں کر رکھی ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔

وہاں سے چھَپ چھَپ کرتے نکلے، خدّام کی جو خدمت کر سکتے تھے کی، اور پھر مسقّف بازار میں آئے۔ یہاں ایک دُکان دودھ دہی کی نظر آئی۔ جی خوش ہوا۔ ہم نے کہا ہوشنگ میاں ادھر آؤ، تمہیں دودھ جلیبی کھلوائیں۔ یہ اس کے لئے نئی چیز تھی لیکن اسے پسند آئی۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے دودھ والے سے باتیں بھی کیں اور کوکا کولا کی بُرائی بھی۔ گوالمنڈی چوک کا لطف آ گیا۔ اب کیا کِیا جائے؟ ہم نے کہا مینارِ طغرل دیکھیں گے۔ ٹیکسی ضرور مل جاتی لیکن ہم نے درشکہ تلاش کیا جو بے چارہ ڈیڑھ تومان یعنی ۱۵ ریال میں ہمیں لے جانے پر راضی ہو گیا۔ درشکہ ہے تو ایک طرح کی وکٹوریہ لیکن چار پہیے اور ان پر دو آدمی بیٹھتے ہیں وہ بھی ڈھاکہ کے رکشا کی طرح کھڑے نہ بیٹھے، بس تنے ہوئے۔ سڑک نہایت خراب تھی، کیچڑ ہی کیچڑ۔ آدھ میل دور جا کر داہنی ہاتھ کو ایک گلی مُڑی ویران سی۔ اس میں کوئی سو گز آگے

جا کر ایک دروازہ ملا۔ درشکہ بان نے اس پر دستک دی۔

دوسری تیسری دستک کے جواب میں ایک صاحب نکل کر آئے۔ یہ مینارہ بارہویں صدی عیسوی میں بنا اور مغلوں کی حرکتاز سے اگر کوئی چیز بچ رہی تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں زیادہ لوگ نہیں آتے لہٰذا ٹکٹ گھر بھی نہیں کہ بلیطہ کا تکلّف ہو۔ برج طغرل کوئی سوفٹ قطر کا کھوکھلا منارہ سمجھیے، جیسے کنواں اوندھا رکھ دیا گیا ہو۔ پہلے چھت تھی لیکن شکستہ ہو کر گر گئی۔ اسے طغرل ابن سلجوق نے بنوایا تھا اور کتبے کے مطابق اس کا مرقد اِس کے نیچے ہے۔ لیکن جو شخص وہاں کا متولّی یا گائیڈ تھا، اس نے کہا جی نہیں فقط نگہبان کا مینارہ ہے۔ ہم نے کتبے کا حوالہ دیا تو وہ بولا اجی میں کوئی جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ اس نے دیوار میں دو طاقچے دکھائے جہاں نگہبان کھڑا ہو کر دُور دُور تک نظر رکھتا تھا۔ اب منارہ موجود ہے لیکن وہ شہر موجود نہیں جس کی حفاظت کا یہ اہتمام تھا۔ وہ بادشاہ موجود نہیں وہ غنیم موجود نہیں۔ آدمی سے زیادہ تو کنکر پتھّر کو ثبات ہے۔

اب پھر ہم تھے اور وہ کیچڑ والی گلی۔

خاصی قباحت کے بعد ٹیکسی ملی۔ لیکن سالم نہیں۔ کچھ ٹھیکیدار قسم کے لوگوں کا

ساتھ ہوا۔ یہ ٹیکسی میدان شوش تک آئی۔ معلوم ہوا رے سے یہاں تک عموماً اس قسم کی چونّی اٹھنّی والی ٹیکسیاں آتی ہیں۔

”آیئے آقا۔ ایک سواری میدان شوش۔ ایک سواری میدان شوش۔“

(ختم شُد)